رسول حمزاتوف

میرا داغستان



''میرا داغستان،، موجودہ سوویت ادب کا خاص نمونہ ہے۔ یہ لینن انعام یافتہ مشہور آوار شاعر رسول حمزاتوف کی نثر کی پہلی کتاب ہے۔

سوویت داغستان کی قوموں کی نئی زندگی رسول حمزاتوف کا محبوب ترین موضوع ہے: ''داغستان میری محبت ہے، میرا عہد ہے، میری منت و سماجت ہے اور میری دعا ہے۔ داغستان تو اور صرف تو ہی وہ موضوع ہے جو میری تمام کتابوں کا خاص تصور اور میری ساری زندگی کا سرمایہ ہے۔،،

''میرا داغستان،، زندگی اور آرٹ کے بارے میں فنکار کے انوکھے خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ اس کو آزاد اور حکیمانہ مشرقی انداز میں لکھا گیا ہے۔ یہ نظموں سے آراستہ ہے اور کہانیوں سے بھرپور۔ کبھی یہ شوخی کا اظہار کرتی ہے، کبھی اس سے رنج اور اداسی ٹپکنے لگتی ہے۔ یہ کتاب سبق آموز قصوں، حکیمانہ عوامی اقوال اور کہاوتوں سے بھری ہوئی ہے۔

رسول کا مطلب ہے پیغامبر اور رسول حمزاتوف سوویت داغستان کے پیغامبر ہیں جنھوں نے اپنے علاقے اور لوگوں کے حالات زمین کے دوردراز گوشوں تک پہنچائے ہیں۔



رسول حمزاتوف

میرا داغستان

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

ترجمہ : اجمل اجملی
نظرثانی : حبیب الرحمن
ڈیزائن : الینا گولیاھوفسکایا

Расул Гамзатов
МОЙ ДАГЕСТАН
на языке урду
ں

سوویت یونین میں شائع شدہ

Г $\frac{70303-482}{014(01)-78}$ 668—78

پیش لفظ

داغستان کے پہاڑوں کے قلب میں وسیع میدان میں سدا نامی آوار گاؤں واقع ہے۔ اسی گاؤں میں ایک گھر ہے جو اپنے پڑوسی گھروں سے ظاہری صورت میں کسی طرح مختلف نہیں ہے۔ وہی ہموار چھت، چھت پر وہی پتھر کا بیلن، ویساہی پھاٹک اور چھوٹا سا صحن۔ لیکن اس چھوٹے سے داغستانی گھر سے، اس چھوٹے سے سنگین پہاڑی آشیانے سے پرواز کرکے دو شاعرانہ نام دنیا کی وسعتوں میں پھیل گئے۔ ان میں سے پہلا داغستان کے عوامی شاعر حمزہ سداسا کا نام ہے اور دوسرا داغستان کے عوامی شاعر رسول حمزاتوف کا نام۔

اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ بزرگ پہاڑی شاعر کے خاندان میں پروان چڑھنےوالا لڑکا بھی شاعری کی محبت میں مبتلا ہوکر خود بھی شعر کہنے لگا۔ لیکن شاعر کا یہ بیٹا خود شاعر بن کر باپ کی شہرت کی سرحدوں سے کہیں آگے نکل گیا۔ بزرگ حمزہ نے زندگی میں جو سب سے طویل سفر کیا تھا وہ داغستان سے ماسکو کا سفر تھا۔ لیکن رسول حمزاتوف کثیرقومی سوویت

کلچر کے سفیر کی حیثیت سے دنیا کے تقریباً سارے ملکوں کو جا چکے ھیں۔

رسول حمزاتوف کی سوانح حیات میں ظاھری طور پر کوئی امتیازی خط و خال نہیں پائے جاتے۔ وہ ۱۹۲۳ء میں سوویت خودانتظامی ریپلک داغستان کے سدا نامی گاؤں میں پیدا ھوئے اور آرانین کے ثانوی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ پھر بوئینا کس کے ٹیچروں کے آوار کالج گئے۔ ٹیچر رھے، آوار تھیٹر میں کام کیا، اپنی ریپلک کے ایک اخبار میں کام کیا۔ ان کی پہلی نظمیں ۱۹۳۷ء میں شایع ھوئیں۔

رسول حمزاتوف کی تخلیقی تقدیر نے اس وقت پلٹا کھایا جب وہ ماسکو کے ادارۂادب میں داخل ھوئے۔ یہاں نہ صرف ماسکو کے بڑے بڑے شاعر ان کے استاد تھے بلکہ فنی دوست اور رفیق بھی انہیں نصیب ھوئے۔ یہاں انہوں نے پہلے مترجم تلاش کئے یا ممکن ھے یہ کہنا زیادہ ٹھیک ھوگا کہ مترجموں نے ان کو تلاش کیا اور یہیں ان کی آوار شاعری نے روسی شاعری کا جامہ پہنا۔

تب سے رسول حمزاتوف کے تقریباً چالیس شاعرانہ مجموعے مخاچ‌قلعہ مادری زبان میں اور ماسکو میں شایع ھوچکے ھیں۔ اب وہ وسیع شہرت کے مالک ھیں۔ ان کو لینن انعام اور داغستان کے عوامی شاعر کا خطاب عطا کیا جا چکا ھے۔ ان کی شاعری دنیا کی بہت سی زبانوں میں گونج رھی ھے۔

اور اب رسول حمزاتوف نے یہ پہلی کتاب نثر میں لکھی ھے۔ پہلے سے یہ پیش گوئی کی جا سکتی تھی کہ رسول حمزاتوف کا جوھر یہاں بھی اپنی ساری رنگا رنگی کے ساتھ سامنے آئے گا اور ان کی نثر عام ناولوں اور داستانوں جیسی نہ ھوگی اور حقیقت میں یہی ھوا۔ بہرحال ان کی نثر کی خصوصیت کچھ نہ کچھ وضاحت کی طالب ھے۔

رسول حمزاتوف نے یہاں اس طرح سے لکھا ھے جیسے وہ اپنی آئندہ کی کتاب کا پیش لفظ لکھ رھے ھوں۔ وہ بتاتے ھیں کہ اس کتاب کو کیسی ھونا چاھئے، اس کو کس انداز میں لکھا جائیگا، اس کا نام، اس کی زبان اور اسلوب کیسے ھوں‌گے، اس کی تشکیل

کیسے کی جائے گی اور پھر اس کتاب کا مواد کیا ہوگا۔ اس کتاب کا کوئی بھی قاری بےخیالی میں یہ سوال کر سکتا ہے : ''ہاں، یہ تو پیش لفظ ہے اور خود کتاب کہاں ہے؟،، لیکن قاری ایسا کرنے میں حق بجانب نہ ہوگا۔ یہ دیکھنا مشکل نہیں ہے کہ آئندہ کی کتاب کے بارے میں بحث‌مباحثہ محض ادبی ہے۔ رفتہ رفتہ، چپکے چپکے کتاب کا ''پیش لفظ،، بڑھ کر خودمختارانہ اور بیش‌بہا سواد حاصل کرکے وطن کے بارے‌میں، اس سے محبت کرنےوالے فرزند کے رویے کے بارے میں، شاعر کی دلچسپ اور مشکل ذمےداریوں کے بارے میں اور ایک شہری کی دلچسپ اور دشوار ذمےداریوں کے بارے میں جو کسی طرح اول‌الذکر سے کم نہیں ہیں ایک مکمل کتاب بن‌جاتا ہے۔

یہ کتاب سوانح‌حیات جیسی ہے اور کچھ حد تک اعترافی خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ پرخلوص اور شاعرانہ ہے۔ مصنف نے اس کو اپنی ظرافت بلکہ میں یہ کہوں‌گا، شوخ مزاجی سے چمکا دیا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے مصنف رسول حمزاتوف سے دوٹوک مشابہہ ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ ایک مرکزی اخبار میں اس کتاب کے بارے میں مضمون کو ''زندگی کا پیش لفظ،، کا عنوان دیا گیا تھا۔

''میرا داغستان،، میں قاری کو بہت سے آوار اقوال اور کہاوتیں، کبھی مزاحیہ تو کبھی اداس قصے ملیں‌گے جن سے یا تو خود مصنف گذر چکا ہے یا وہ عوامی حافظے کے محفوظ خزانے سے لئے گئے ہیں اور زندگی اور آرٹ کے بارے میں پختہ خیالات اور تصورات سے معمور ہیں۔ اس کتاب میں بہت سی اچھی باتیں ہیں، لوگوں اور وطن سے محبت ہے۔

اپنی کاوشوں کے بارے میں قاری کو خطاب کرتے ہوئے خود رسول حمزاتوف کہتے ہیں: ''ایسے لوگ ہیں جو ماضی کے بارے میں غمگین اور اداس یادیں رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے عموماً حال اور مستقبل کے بارے میں بھی اسی طرح کے افسردہ کن تصورات ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں ماضی کے بارے میں جن کی یادیں درخشندہ اور تاباں ہیں ان کے خیالوں میں حال و مستقبل چمکتا ہے۔ تیسری قسم کے لوگوں کی یادیں خوشکن

اور غمگین، تاباں اور اداس ہیں ۔ حال و مستقبل کے بارے میں ان کے خیالات مختلف جذبات، تصورات، نغموں اور رنگوں سے مخلوط ہیں ۔ میرا تعلق اسی تیسری قسم سے ہے ۔

''میرے راستے ہمیشہ ہموار نہیں رہے ہیں، میرے روزوسال ہمیشہ آسانی سے نہیں گذرے ہیں ۔ میرے ہم‌عصر، تیری طرح میری بھی اس صدی کے وسط میں، دنیا کے قلب میں بڑے بڑے واقعات کی گردش میں سیر ہوئی ہے ۔ ہر سانحہ ادیب کے دل کو ہلا دیتا ہے ۔ غم‌ناک اور خوش کن واقعات کو فنکار سے کترا کر نہ گذرنا چاہئے ۔ وہ برف نہیں پتھر پر نقش ہوتے ہیں ۔ اور میں زمانۂ ماضی کے بارے میں اپنے سارے مشاہدات اور مستقبل کے بارے میں خیالات جمع کرکے تیرے پاس آتا ہوں اور تیرے دروازے پر دستک دے کر کہتا ہوں : میرے اچھے دوست، یہ میں ہوں، مجھے اندر آنے کی اجازت دو ۔ ،،

ولادیمیر سولواوخین (ادیب)

روسی زبان میں ''میرا داغستان،،

کے مترجم

راہ رو! گر تو مری گود سے باہر نکلے
بجلیاں جسم سے ٹکرائیں، مصائب ٹوٹیں
راہ رو! گر مری آغوش نہ ہو وجہہ سکوں
بجلیاں، میرا سکوں، میرا نشیمن لوٹیں۔
(کتبہ ایک دروازے پر)

اگر تم ماضی کو پستول کا نشانہ بناؤگے
تو مستقبل تمہیں توپ کا نشانہ بنائے گا۔
(ابوطالب کا ایک قول)



دیباچے کی جگہ پر دیباچوں کے بارے میں کچھ عام باتیں

آنکھ کھلتے ہی بستر سے اس طرح اٹھ کر نہ بھاگو جیسے کسی چیز نے تمہیں ڈنک مار دیا ہو۔ سب سے پہلے اس خواب کے بارے میں سوچو جو تم نے دیکھا ہے۔

ھوائی جہاز فضا میں پرواز کرنے سے پہلے بڑا شور مچاتا ہے، پورے ھوائی اڈے کا چکر لگا کر رن‌وے پر پہنچتا ہے، پھر گرجتا دھاڑتا دوڑتا ہے اور یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد ھی وہ پرواز کے لئے روانہ ھوتا ہے۔

ھیلی کوپٹر کو دوڑ لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن وہ بھی پرواز پر روانگی سے پہلے خاصا شور مچاتا ہے، بھنبھناتا ہے اور اس طرح لرزتا اور تھرتھراتا ہے جیسے اس پر کوئی دورہ پڑا ھو۔

یہ صرف پہاڑی عقاب ہے، جو اپنی چٹان سے اٹھ کر سیدھا آسمان کی وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے اور بڑے شاھانہ انداز میں ھوا میں منڈلاتا لگاتار اوپر اٹھتا جاتا ہے، اوپر اور اوپر، یہاں تک کہ نگاھیں اسکا پیچھا نہیں کر پاتیں۔

ایک اچھی کتاب کا آغاز بھی اسی طرح ہونا چاہئے، طویل اور اکتا دینےوالے دیباچوں کے بغیر ۔ اگر آپ کسی سانڈ کی سینگیں پکڑنے میں اس وقت کامیاب نہ ہو سکیں جب وہ جست لگاتا آپ کے پہلو سے گذر رہا ہو تو آپ کےلئے دم پکڑ کر اسے روک لینا ناممکن ہوگا۔

فرض کر لیجئے کسی گلوکار نے اپنا پاندور * سنبھال لیا ہے ۔ میں جانتا ہوں کہ اسکی آواز بےحد سریلی ہے ، لیکن گانا شروع کرنے سے پہلے اسکی انگلیاں قطعی بےمقصد انداز میں تاروں کو کیوں چھیڑ رہی ہیں؟ یہی سوال اس تقریر کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے جو موسیقی کے کسی پروگرام سے پہلے پیش کی جاتی ہے اور اس لکچر کے بارے میں جو کسی ڈرامے سے پہلے دیا جاتا ہے یا اس نصیحت کے بارے میں بھی جس سے کوئی خسر اپنے ہونےوالے داماد کو نوازتا ہے، بجائے اسکے کہ اسے کھانے کی میز پر مدعو کرے اور شراب سے لبریز جام اس کے سامنے پیش کرے۔

ایک دن شامیل ** کے کئی مرید ایک دوسرے پر اپنی تلواروں کی دھار کا رعب ڈال رہے تھے ۔ وہ اس فولاد کی مضبوطی کی دھاک بٹھا رہے تھے جس سے تلواریں بنی تھیں اور قرآن کی ان مقدس آیات کا ذکر کر رہے تھے جو ان تلواروں پر نقش تھیں ۔ ان مریدوں میں بزرگ شامیل کے خلیفہ حاجی مراد بھی شامل تھے، انہوں نے کہا :

---

* قفقاز کے علاقوں میں مقبول قدیم ساز ۔ (ایڈیٹر)

** شاہ میل (۱۷۹۸ء تا ۱۸۷۱ء) ایک بزرگ تھے جنہوں نے مقامی جاگیرداروں اور روسی زارشاہی کے خلاف داغستان میں اپنے مریدوں کے ساتھ مسلح بغاوت کا پرچم بلند کیا ۔ انہوں نے امام ہونے کا دعوی کیا، رہنمائی کی صلاحیت اور فوجی دوراندیشی کا مظاہرہ کیا ۔ گونیب گاؤں میں گھر جانے پر انہوں نے ۱۸۵۹ء میں ہتھیار ڈال دئے، کچھ عرصہ کالوگا شہر میں قید رہے ۔ ۱۸۷۰ء میں مکہ چلے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا ۔ (ایڈیٹر)

"گھنے چنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر تم لوگ کیا بحث کر رہے ہو۔ کل صبح جو لڑائی ہوگی اس میں تمہاری تلواروں کے جوہر آپ ہی سامنے آجائیں گے۔"

اور ہاں، یہ بھی ہے کہ میرے کوہستانی وطن میں یہ دستور نہیں کہ گھوڑسوار گھر کی دہلیز سے ہی گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ جب تک وہ گاؤں سے باہر نہیں نکل جاتا، وہ گھوڑے کی لگام پکڑے پیدل ہی چلتا رہتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس دوران میں ایک بار پھر یہ سوچتا ہے کہ کیا کچھ چھوڑ کر جا رہا ہے اور سڑک پر آگے کیا کچھ اس کے سامنے آنے والا ہے۔ اسے کتنی ہی جلدی کیوں نہ ہو گاؤں سے باہر آنے تک وہ گھوڑے کی باگ پکڑے، سوچتا ہوا آہستہ چلتا رہتا ہے اور پھر اس طرح اچھل کر زین پر بیٹھ جاتا ہے گویا رکاب پر اس نے پیر رکھے ہی نہ ہوں، پھر وہ کاٹھی کے اگلے حصے کی طرف جھک کر ایڑ لگاتا ہے اور گرد و غبار کے اڑتے ہوئے بادلوں میں ڈوب جاتا ہے۔

میں بھی اپنی کتاب کے زین پر اچھل کر سوار ہونے سے پہلے کچھ سوچتا ہوا چل رہا ہوں۔ گھوڑے کی باگ ہاتھ میں لئے خیالوں میں کھویا ہوا اس کے ساتھ چل رہا ہوں۔ کچھ کہنے سے پہلے میں ھچک رہا ہوں۔

انسان کی زبان سے الفاظ کی ادائیگی میں دیر صرف اسی صورت میں نہیں لگتی جب وہ ھکلا ہو، بلکہ اس وقت بھی الفاظ کی ادائیگی میں وقت لگتا ہے جب اسے برمحل، ضروری اور ایسے الفاظ کی تلاش ہو جو عقل و دانش کا اظہار کر سکیں۔ میں اس طرح کے الفاظ کے ذریعے نہ تو کسی پر اپنے علم و دانش کا رعب جمانا چاہتا ہوں اور نہ میں ھکلا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے مناسب اور برمحل الفاظ کی تلاش ہے اور اسی لئے میں کبھی کبھی رک جاتا ہوں۔

ابوطالب کا قول ہے: کسی کتاب کا دیباچہ اس تنکے کی طرح ہے جیسے کوئی توہم پرست بیوی اس وقت اپنے دانتوں کے

بیچ دبا لیتی ہے جب وہ اپنے شوہر کا بھیڑ کی کھال والا کوٹ رفو کر رہی ہو۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ اگر رفو کرتے ہوئے ایسا نہ کیا جائے تو وہ کوٹ کفن بھی بن سکتا ہے۔

ابوطالب ہی کا قول ہے: میں اس آدمی کی طرح ہوں جو اندھیرے میں کوئی دروازہ تلاش کر رہا ہو، یا اس دروازے تک تو پہنچ گیا ہو لیکن یقین کے ساتھ یہ طے نہ کر پا رہا ہو کہ اندر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں، اور جانے سے کوئی فائدہ ہوگا بھی یا نہیں اور اس بیچ دروازے پر دستک بھی دئے جا رہا ہو۔ تھپ، تھپ، تھپ، تھپ۔

''اندروالے! اگر تجھے گوشت پکانا ہے تو اٹھ جا، کیونکہ وقت کم رہ گیا ہے۔ ''

''اندروالے! اگر تجھے جئی کا دلیا کوٹنا ہے تو کوئی فکر نہیں، بہت وقت ہے، اٹھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ ''

''اندروالے! اگر تیرا ارادہ بوزا* پینے کا ہے تو پڑوسیوں کو دعوت دینا نہ بھول۔ ''

تھپ، تھپ، تھپ، تھپ۔

''میں اندر آجاؤں، یا تجھے میری ضرورت نہیں؟''

بچہ دو سال میں بولنا سیکھ جاتا ہے اور انسان ۶۰ سال کے بعد جا کر کہیں یہ جان پاتا ہے کہ زبان کیسے بند رکھی جائے۔

نہ میں دو سال کا بچہ ہوں نہ ۶۰ سال کا بوڑھا۔ میں اپنی زندگی کی درمیانی منزل میں ہوں۔ لیکن نسبتاً آخری منزل سے زیادہ نزدیک ہوں، اسی لئے وہ لفظ جو ابھی میری زبان سے نکلا نہیں ہے میرے نزدیک ان تمام الفاظ کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہے جو زبان سے نکل چکے ہیں۔

وہ کتاب جو ابھی میں نے لکھی نہیں ہے، میرے لئے ان تمام کتابوں سے زیادہ قیمتی ہے جنہیں میں لکھ چکا ہوں۔ وہ انمول ہے، میرے دل سے بےحد قریب ہے اور جرأت آزمائی کی طالب ہے۔

---

* بیئر کی طرح کا ایک داغستانی مشروب۔ (ایڈیٹر)

ایک نئی کتاب میرے نزدیک وہ گھاٹی ہے جس میں میں کبھی داخل نہیں ہوا۔ لیکن راستے کھلتے جا رہے ہیں اور دھند میں پٹی وسعتیں سامنے آتی جارہی ہیں۔ ایک نئی کتاب وہ گھوڑا ہے جس پر میں نے کبھی سواری نہیں کی، وہ تلوار ہے جسے میں نے نیام سے کبھی باہر نہیں نکالا۔

پہاڑیوں میں ایک کہاوت ہے کہ "کسی معقول وجہ کے بغیر تلوار نیام سے باہر نہ نکالو اور اگر نکالنی ہی پڑ جائے تو ایسی ضرب لگاؤ کہ ایک ہی وار میں سوار اور رہوار دونوں ہی کا قصہ پاک ہوجائے۔"

پہاڑی لوگو! تمہاری باتیں کتنی صحیح ہوتی ہیں۔

پھر بھی تلوار نیام سے نکالنے سے پہلے اطمینان کر لینا چاہئے کہ اسکی دھار تیز ہے یا نہیں۔

اے میری کتاب! میرے دل کی گہرائیوں میں برسوں سے تیرا گھر رہا ہے۔ تو اس خوبصورت محبوبہ کی طرح ہے جسے میں دور دور سے دیکھتا رہا ہوں، جس کے خواب میں نے دیکھے ہیں لیکن جسے چھونے کی ہمت کبھی نہ ہوئی۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ بہت قریب آ گئی، اتنے قریب کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا، لیکن ایسے ہر موقع پر میں شرما کر اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا ہوں۔

مگر وہ زمانہ گذر گیا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کے قریب جاؤنگا اور اسکی بانہوں میں بانہیں ڈالنے کی جرأت کرونگا۔ شرمیلے عاشق کی جگہ اب میں ایک دلیر اور آزمودہ کار انسان بننا چاہتا ہوں۔ میں اس نئے گھوڑے پر سوار ہوتا ہوں، اسے تین بار چابک لگاتا ہوں اور روانہ ہو جاتا ہوں، اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

پھر بھی میں سب سے پہلے پہاڑوں میں پیدا ہونے والی خالص تمباکو سے ایک سگریٹ بناتا ہوں، اور لطف لے لے کر بناتا ہوں۔ جب سگریٹ بنانے میں اتنا مزہ آرہا ہے تو سگریٹ پینے میں کتنا مزہ آئے گا۔

اے میری کتاب! تجھے شروع کرنے سے پہلے میں یہ بتانا چاھتا ھوں کہ میری شخصیت کی گہرائیوں میں کس طرح تیری کونپل پھوٹی، تیرا نام کیسے میرے ذھن میں آیا، میں تجھے کیوں لکھ رھا ھوں اور زندگی میں خود میرے منصوبے کیا ھیں۔

میں اپنے مہمانوں کو اپنے باورچی‌خانے میں بلا لیتا ھوں، جہاں ابھی ذبح کیا ھوا مینڈھا صاف کیا جا رھا ھے۔ کبابوں کی مہک ابھی آنی شروع نہیں ھوئی ھے۔ باورچی‌خانے میں خون، گوشت اور تازہ اتاری ھوئی کھال کی بو بھری ھے۔

میں اپنے دوستوں کو اس کمرے میں بلا لیتا ھوں جہاں بیٹھ کر میں لکھتا پڑھتا ھوں اور جہاں ھر طرف میرے مسودے بکھرے ھوئے ھیں۔ میں انہیں اپنے مسودے دیکھنے کی کھلی چھوٹ دے دیتا ھوں۔

حالانکہ ابا کہا کرتے تھے کہ دوسرے کے مسودے الٹنے پلٹنے والا اس آدمی کی طرح ھے جو دوسرے آدمی کی جیب ٹٹول رھا ھو۔

ابا یہ بھی کہا کرتے تھے کہ پیش لفظ اس آدمی کی طرح ھے جس کے شانے چوڑے چکلے ھوں، سر پر فروالی بڑی اور اونچی پاپاخ ٹوپی ھو اور وہ کسی تھیٹر کی اگلی صف میں بالکل آپ کے سامنے بیٹھا ھو۔ اب یہ آپ کی قسمت ھے کہ وہ سیدھا بیٹھا رھے، ادھر ادھر جھکے نہیں۔ میں کوئی تماشا دیکھ رھا ھوں اور سامنے اس طرح کا کوئی آدمی بیٹھا ھو تو مجھے بڑی کوفت ھوتی ھے اور جھنجھلاھٹ ھوتی ھے۔

اپنی نوٹ بک سے۔ اکثر مجھے ماسکو اور روس کے دوسرے شہروں میں اپنی نظمیں سنانی پڑتی ھیں۔ ان شہروں میں لوگ میری مادری زبان آوار نہیں سمجھتے۔ چنانچہ میں شروع میں اپنے مخصوص لہجے میں اپنے بارے میں کچھ باتیں بتاتا ھوں اور پھر میرے دوست روسی شعراء میری نظموں کے ترجمے سناتے ھیں۔ لیکن

ترجمہ سننے سے پہلے لوگ عام طور پر مجھ سے فرمائش کرتے ھیں کہ ان میں سے کوئی ایک نظم اپنی زبان میں سناؤں۔ ''ھم آوار زبان کی موسیقی اور آپکی نظم کی شعریت سے واقف ھونا چاھتے ھیں۔،، میں فرمائش پوری کرتا ھوں، اور یہ ایسا ھی ھے جیسے گانا شروع کرنے سے پہلے کوئی گلوکار ساز کے تاروں کو بےمقصد انداز میں چھڑتا ھے۔

کیا کسی کتاب کا پیش لفظ بھی کچھ اسی طرح کی چیز نہیں؟

اپنی نوٹ‌بک سے۔ جن دنوں میں ماسکو میں زیر تعلیم تھا، ابا نے گرم کوٹ خریدنے کےلئے مجھے کچھ پیسے بھیجے۔ بات کچھ ایسی ھوئی کہ پیسے خرج ھو گئے اور میں کوٹ نہ خرید سکا۔ سردی کی چھٹیاں گذارنے کےلئے مجھے داغستان آنا پڑا۔ بدن پر وھی کپڑے تھے جنہیں پہن کر گرمیوں میں ماسکو کےلئے روانہ ھوا تھا۔

گھر پہنچا تو میں نے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈے، مگر ھر بہانہ پہلے سے زیادہ مضحکہ‌خیز اور ناقابل اعتبار تھا۔ جب میں خود کو پوری طرح اس جال میں الجھا چکا تو ابا نے مداخلت کرتے ھوئے کہا:

''بس کرو، رسول! میں تم سے صرف دو باتیں پوچھنا چاھتا ھوں۔،،

''فرمائیے۔،،

''تم نے کوٹ خریدا تھا یا نہیں؟،،

''نہیں۔،،

''اور پیسے خرج کر دئے؟،،

''جی ھاں۔،،

''بس بات صاف ھو گئی۔ اگر بات دو جملوں میں کہی جاسکتی ھے تو اتنے الفاظ ضایع کرنے اور لمبی چوڑی تمہید باندھنے سے کیا فائدہ۔،،

جی ھاں ابا نے مجھے یہی سکھایا ھے۔

پھر بھی بچہ جنم لیتے ہی بولنا شروع نہیں کر دیتا۔ پورا لفظ ادا کرنے سے پہلے وہ غوں غاں کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جب وہ کسی شدید تکلیف کی وجہ سے رو رہا ہو تو خود اسکی ماں بھی یہ نہیں سمجھ پاتی کہ تکلیف کیا ہے۔

کیا شاعر کی روح بھی ایک بچے کی طرح نہیں ہوتی؟

ابا کہا کرتے تھے: پہاڑی چراگاہوں سے بھیڑوں کا کوئی گلہ واپس لوٹ رہا ہو تو سب سے پہلے جو چیز نظر آتی ہے وہ بکرے کی سینگیں ہیں جو ہمیشہ آگے آگے چلتا ہے، پھر خود بکرا دکھائی دیتا ہے اور تب کہیں جا کر گلہ سامنے آتا ہے۔

کسی برات یا کسی جنازے کا انتظار ہو تو سب سے پہلے خبررساں نظر آتا ہے۔

کسی پہاڑی گاؤں میں خبررساں کا انتظار ہو تو سب سے پہلے غبار کا بادل نظر آتا ہے اور تب گھوڑ سوار۔

جب شکاری واپس آنےوالا ہو تو پہلی چیز جس پر نظر پڑتی ہے، وہ ہے اسکا کتا۔



یہ کتاب کیسے وجود میں آئی اور کہاں لکھی گئی

چھوٹے چھوٹے بچے بھی بڑے بڑے خواب دیکھتے ہیں۔
(پالنے پر ایک کتبہ)

جو ہتھیار صرف ایک بار استعمال ہوتا ہے،
اسے بھی ساری زندگی ڈھونا پڑتا ہے۔

جو اشعار زندگی بھر گنگنائے جاتے ہیں،
بیک جنبش قلم وجود میں آتے ہیں۔

بہار کا موسم ہے۔ ایک پہاڑی گاؤں پر موسم بہار کی ایک چڑیا منڈلا رہی ہے، اسے کسی ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں وہ کچھ دیر بیٹھ کر اطمینان کی سانس لے سکے۔ پھر اسے ایک مکان کی چوڑی چکلی، ہموار اور صاف ستھری چھت اور اس پر رکھا ہوا پتھر کا ایک بیلن نظر آتا ہے۔ وہ پر سمیٹتی ہے اور آسمان کی وسعتوں سے نیچے بیلن پر اتر کر آرام کرنے لگتی ہے۔ ایک نازک اندام دوشیزہ کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ وہ چپکے چپکے

آتی ہے اور چڑیا پکڑ کر گھر میں لے جاتی ہے۔ چڑیا محسوس کرتی ہے کہ گھر کے سبھی لوگ اس سے پیار کرتے ہیں، وہ ہمیشہ کےلئے اس گھر میں بس جاتی ہے اور مکان کی ایک پرانی دھواں زدہ شہتیر میں جڑی نعل کے سہارے اپنے لئے ایک گھونسلا بنا لیتی ہے۔

اگر میں اپنی کتاب کو اس چڑیا سے تشبیہہ دوں تو کیسا رہے؟

کتنی بار میں نے اپنی شاعری کے نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے نثر کی وادی کی جانب اشتیاق بھری نظر ڈالی ہے، اور کسی ایسے مقام کی تلاش کرتا رہا ہوں جہاں اتر کر سکون و اطمینان کی سانس لے سکوں۔

لیکن نہیں یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میں وہ ہوائی جہاز ہوں جو زمین پر اترنے کےلئے ہوائی اڈے کے اوپر منڈلا رہا ہے۔ میں اترنا چاہتا ہوں لیکن ہوائی اڈے کے کنٹرول مینار سے موسم کی خرابی کی وجہ سے اجازت نہیں مل رہی ہے۔ میں چکر لگانا بند کر دیتا ہوں، اور ایک جانب روانہ ہوجاتا ہوں۔ میں جس زمین پر اترنا چاہتا تھا وہ اب پھر پیچھے چھوٹتی جارہی ہے... بارہا ایسا ہوتا رہا ہے۔

اور یوں میں نے سوچا کہ نیچے کسی ٹھوس پتھریلی زمین پر اترنا میری قسمت میں نہیں، ناہموار اور دشوار گذار زمین پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے آگے بڑھنا ہی میرے قدموں کا مقدر بن چکا ہے۔ میری آنکھوں کو روئے زمین پر نت نئی جگہوں کی تلاش سے کبھی فرصت نہیں ملنےوالی ہے اور دل کا مقدر ہی یہ ہے کہ وہ ہر گھڑی نو بہ نو اور تازہ بہ‌تازہ نغموں کو جنم دیتا رہے۔

اس کسان کی طرح جو اپنے سر کے اوپر سے گذرنےوالے بادل کے کسی ٹکڑے کو نظر بھر کر دیکھتا ہے، یا سارسوں کی مخروطی قطار سے لطف اندوز ہو کر دوبارہ مضبوط ہاتھوں سے ہل کو پکڑ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا ہے، میں بھی اپنی اس نظم کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو ادھوری رہ گئی تھی۔

جی‌ہاں! میں اپنی شاعری کو آسمان کا ہم‌پلہ کتنا ہی کیوں نہ قرار دوں، شاعری میرے لئے میرا کھیت ہی رہی ہے،

ھل کے نوک کی چبھن کا انتظار کرنےوالی زمین اور سنگین کام۔ ابھی تک میں نے نثر کے میدان میں کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔

ایک دن مجھے ایک خط موصول ھوا۔ لفافے میں ایک ایسے رسالے کے مدیر کا پیغام تھا جسکا میں بےحد احترام کرتا ھوں اور مزید طرہ یہ کہ خود مدیر محترم سے بھی مجھے خاصی عقیدت ھے۔ مدیرمحترم نے اپنے خط کا آغاز جس جملے سے کیا تھا وہ تھا ''محترم رسول،، اور سچ تو یہ ھے کہ یہ احترام ھمہ گیر تھا۔

خط کھولا تو اتنا بڑا تھا جیسے یہ خط نہیں بھینس کی وہ کھال ھو جسے پہاڑی لوگ سوکھنے کےلئے اپنے مکان کی چھت پر پھیلا دیتے ھیں۔ جب میں خط پڑھ رھا تھا تو اسکے صفحات بھی اسی طرح چرچرا رھے تھے جیسے بھینس کی سوکھی کھال جس کو نیچے مکان میں لے جانے کےلئے لپیٹا جاتا ھے تو وہ چرچرانے لگتی ھے۔ بس کمی تھی تو کھال سے نکلنےوالی تیز بو کی۔ خط میں کسی طرح کی مہک نہ تھی۔

مدیر محترم نے لکھا تھا: ''ھم نے یہ فیصلہ کیا ھے کہ رسالے کے آئندہ چند شماروں میں داغستان کی کامیابیوں، اچھے کاموں اور روزمرہ کے کاموں کی رپورٹ شایع کریں۔ ھماری خواھش ھے کہ اس میں ھمارے عام محنت کش مردوں اور عورتوں کی کہانی ھو، انکی بےلوث کوششوں اور امنگوں کی کہانی آپ کے کوھستانی وطن کا روشن ''مستقبل،، اور اسکی صدیوں پرانی روایات کا ذکر ھونے کے ساتھ ساتھ اس کے شاندار ''حال،، پر اس داستان میں زیادہ زور دیا جائے۔ ھم نے یہ بھی فیصلہ کیا ھے کہ اس موضوع پر آپ سے زیادہ بہتر کوئی دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اب رھی یہ بات کہ اس موضوع کو برتا کس طرح جائے، اظہارخیال کے لئے کونسی صنف اختیار کی جائے، تو اسکا فیصلہ ھم آپ پر چھوڑتے ھیں، مختصر افسانہ لکھئے، مضمون لکھئے، خاکے تیار کیجئے یا مختصر نوٹ۔ مضمون ٹائپ کے ۹، ۱۰ صفحات پر مشتمل ھو تو بہتر ھے اور اسے ھر حال میں ۲۰، ۲۵ دن کے اندر ھمارے پاس پہنچ جانا چاھئے۔ ھمیں آپ کے تعاون کی امید ھے... اور ھم آپکا پیشگی شکریہ ادا کرتے ھیں...،،

ایک زمانہ تھا جب لڑکیوں کی شادیاں انکی مرضی کے بغیر کر دی جاتی تھیں، بس انہیں اتنا بتا دیا جاتا تھا کہ ساری باتیں طے ہو چکی ہیں اور اب تمہیں فلاں ابن فلاں کے ساتھ زندگی گذارنی ہے۔ لیکن اس زمانے میں بھی کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ بیٹے کی شادی طے کر دے اور اسکی مرضی معلوم نہ کرے۔ لوگ کہتے ہیں کہ گیداتلی گاؤں کے کسی فرد نے ایسا کیا تھا تو کیا مدیرمحترم بھی پہاڑی گاؤں گیداتلی سے کوئی تعلق رکھتے ہیں؟ انہوں نے تو مجھ سے متعلق ساری باتیں طے کر دیں۔ لیکن کیا میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنے داغستان کی کہانی ۹ صفحات میں سمو دوں اور وہ بھی ۲۰ دن کے اندر اندر؟

مجھے غصہ آگیا اور اس غصے میں وہ خط میں نے جہاں تک ہو سکتا تھا اپنے سے دور پھینک دیا۔ کچھ دنوں بعد میرے فون کی گھنٹیاں اس شدت اور تکرار کے ساتھ بجنے لگیں جیسے وہ فون نہ ہو بلکہ کوئی مرغی ہو جو انڈا دینے کے بعد چیخ چیخ کر اپنی فتح کا اعلان کر رہی ہو۔ فون رسالے کے دفتر ہی سے تھا۔

''ہیلو رسول! آپ کو ہمارا خط مل گیا؟''

''جی ہاں۔ مل گیا۔''

''تو مضمون کا کیا ہوا؟''

''دیکھئے... آپ تو میری مصروفیت جانتے ہی ہیں... بات یہ ہے کہ مجھے وقت نہ مل سکا۔''

''دیکھئے رسول! آپ ہمیں ٹال نہیں سکتے۔ ہمارے رسالے کی تعداد اشاعت ۱۰ لاکھ کے قریب ہے اور اسے بیرونی ملکوں میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ اگر آپ واقعی اس قدر مصروف ہیں تو ہم کسی کو آپ کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ آپ بس اتنا کیجئے کہ اسے کچھ خیالات اور تفصیلات بتا دیجئے، باقی سارا کام وہ خود کر لے گا۔ اس کے تیار کردہ مسودے پر آپ ایک نظر ڈال لیجئے، جو تبدیلیاں کرنی ہوں کیجئے اور پھر اپنے دستخط کر دیجئے، ہمارے لئے آپ کا نام ہی اہم ہے۔''

''جسے مہمان دیکھ کر خوشی نہ ہوتی ہو وہ اس قابل ہے کہ اسکی ہڈی پسلی ایک کر دی جائے۔ اگر کسی کے چہرے پر

مہمان کو دیکھ کر ناگواری کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہو یا بھنویں تن‌جاتی ہوں تو خدا کرے کہ اس کے یہاں نہ تو نیک صلاح دینےوالے بزرگ باقی بچیں نہ ان پر کان دھرنے اور عمل کرنے کےلئے خورد زندہ رہ جائیں۔ ہمارے علاقے میں مہمانوں کی اتنی ہی قدر کی جاتی ہے۔ لیکن خدا کے لئے میرے پاس کسی سالیخالوف کو مت بھیجئے (آوار زبان میں جب یہ کہنا ہو کہ کام ٹھیک طرح چل رہا ہے تو اسکے لئے یہ استعارہ اپنایا جاتا ہے کہ ''بالکل سالیخالوف کے طنبورے کی طرح ،،) میں اسکی مدد کے بغیر اپنا طنبورہ کس سکتا ہوں، اپنی صراحی میں دستہ لگا سکتا ہوں۔ اگر میری پیٹھ میں کھجلی ہو رہی ہو تو مجھ سے زیادہ اچھی طرح یہ بات کون جان سکتا ہے کہ کس جگہ کھجلانے سے سکون ملےگا۔ ،،

اور پھر والسلام، والکلام کے بعد بات ختم ہو گئی۔ میں نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور اپنے آبائی گاؤں سدا کی طرف چل پڑا۔

یہ ہے میرا گاؤں سدا۔ ستر گرم چولھوں کی بستی۔ ستر چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں کوھستانی علاقے کے صاف شفاف آسمان میں بکھرتا جا رہا ہے۔ کالی زمین پر سفید مکانات سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ گاؤں کے باھر اور سفید مکانوں کے سامنے سرسبز میدان اور کھیت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ گاؤں کے پیچھے پہاڑوں کی فصیل ہے، جسکی بھوری چوٹیاں گاؤں کے عقب میں اس طرح ابھری ہوئی ہیں جیسے کسی چوڑی چکلی چھت پر بچوں کا گروہ جمع ہو اور صحن میں ادا کی جانےوالی شادی کا تماشا دیکھ رہا ہو۔

گاؤں پہنچتے ہی میں نے ابا کا ایک خط نکالا جو انہوں نے ماسکو کی پہلی سیر کے دوران گھر لکھا تھا۔ ابا کی تحریر و تقریر میں سنجیدگی اور مزاح کا ایک ایسا امتزاج ہوتا تھا کہ دونوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوجاتا تھا۔ بہرحال ماسکو دیکھ کر وہ متحیر رہ گئے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا:

''ایسا لگتا ہے جیسے یہاں ماسکو میں کھانا پکانے کےلئے چولھے نہیں جلتے کیونکہ نہ تو یہاں مجھے کوئی عورت گھر کی

دیوار پر گوبر پاتھتی دکھائی دی اور نہ ہی گھروں کی چھت سے اس طرح کا دھواں اٹھتا دکھائی دیا جسکی شکل ابوطالب کی بڑی پاپاخ ٹوپی جیسی ہوا کرتی ہے۔ مجھے یہاں وہ بیلن بھی نظر نہیں آیا جس کی مدد سے ہم لوگ اپنی چھتوں پر مٹی دباتے ہیں۔ چھتوں پر چارے کے ذخیرے بھی دکھائی نہیں دئے، سوال یہ ہے کہ اگر یہاں چارہ سکھایا نہیں جاتا تو مویشیوں کو کھلایا کیا جاتا ہے ؟ مجھے یہاں ایک بھی ایسی عورت نظر نہیں آئی جو سر پر گھاس کا گٹھا اٹھائے اپنے گھر کی طرف جارہی ہو۔ نہ میں نے یہاں زورنا (بانسری) کی دھنیں سنیں نہ طنبورے کی آواز۔ ایسا لگتا ہے کہ لوگ یہاں شادیاں نہیں کرتے یا ان کو دھوم دھام سے نہیں مناتے۔

''اس عجیب و غریب شہر کی سڑکوں پر میں دور دور تک ٹہلتا رہا ہوں لیکن مجھے ایک بھی بھیڑ نظر نہیں آئی۔ سوال یہ ہے کہ ماسکو والوں کے یہاں جب کوئی مہمان آتا ہے تو وہ اسکی خاطر تواضع کےلئے کونسا جانور ذبح کرتے ہیں؟ اور اگر بھیڑ ذبح نہیں کی جاتی تو پھر وہ اپنے بےحد عزیز دوست کی خاطر کس چیز سے کرتے ہیں؟ نہیں، مجھے یہ طرزمعاشرت پسند نہیں آئی، میں گھر واپس آنا چاھتا ہوں، اپنے گاؤں سدا کو لوٹنا چاھتا ہوں، جہاں میں اپنی بیوی سے فرمائش کرکے خوب لہسن ملی مزیدار خنکالی * پکواؤں اور اطمینان کے ساتھ سیر ہوکر کھا سکوں ...،،

ابا نے جب ماسکو کا موازنہ اپنے گاؤں سے کیا تو وہاں انہیں اور بھی کئی کمیاں نظر آئیں۔ ماسکو کی دیواروں پر اپلوں کو سوکھتے نہ دیکھ کر حیرت کا اظہار یقیناً انکی ظریفانہ طبیعت کا نتیجہ ہے لیکن جہاں انہوں نے یہ لکھا ہے کہ وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں کو اس عظیم شہر پر ترجیح دیتے ہیں، وہاں وہ قطعی سنجیدہ ہیں۔ انہیں اپنے گاؤں سدا سے محبت تھی اور وہ اسے روئے زمین کی تمام راجدھانیوں کے عوض بھی چھوڑنے کےلئے تیار نہ تھے۔

---

* گوشت بھرے سموسے۔ (ایڈیٹر)

میرے محبوب سدا! میں اس وسیع دنیا سے لوٹ کر تیرے پاس آیا ھوں جس میں ابا کو اتنی ساری ''خامیاں،، نظر آئی تھیں۔ میں ساری دنیا میں گھوما پھرا ھوں اور بہت ساری چیزیں دیکھ کر عش عش کر اٹھا ھوں۔ اپنے چاروں طرف بکھرے ھوئے حسن کی بہتات نے میری آنکھیں خیرہ کر دیں، اس حد تک کہ وہ کسی ایک چیز پر جم نہ پائیں۔ ایک سے ایک شاندار مندر اور ایک سے ایک دل کش چہرے میری نگاھوں کے سامنے سے گذرے ھیں، لیکن مجھے ھر لمحہ اس بات کا یقین رھا ھے کہ کل مجھے آج سے زیادہ خوبصورت مناظر اور حسین چہرے دیکھنے کو ملینگے... کیونکہ دنیا بہرحال لامحدود ھے۔

میں ھندوستان کے مندروں سے، مصر کے اھراموں سے، اطالوی محلوں سے معذرت خواہ ھوں۔ امریکہ کی شاھراھوں، پیرس کے خیابانوں، برطانیہ کے پارکوں اور سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں سے معافی مانگتا ھوں۔ پولینڈ، جاپان اور روم کی خوبصورت عورتو! مجھے معاف کرنا۔ میں تم سب کی رعنائیوں سے متاثر ھوا ھوں، لیکن ایسا کبھی نہیں ھوا کہ تمہیں دیکھنے کے بعد میرے دل کی دھڑکنیں تیز ھو گئی ھوں۔ اور اگر تھوڑی دیر کےلئے میری نبض کی رفتار تیز ھوئی بھی ھے تو اتنی نہیں کہ میرا گلا سوکھ گیا ھو، یا ایک پل کےلئے میں ھوش و حواس کھو بیٹھا ھوں۔

مگر جب میں پہاڑ کی سربلند چوٹیوں کے درمیان بکھرے ھوئے اپنے گاؤں کے ان ستر مکانوں کو دیکھتا ھوں تو ایسا کیوں ھوتا ھے کہ میرے دل کی رفتار تیز ھو جاتی ھے، میری پسلیوں میں چبھن ھونے لگتی ھے، میری آنکھیں دھندلا سی جاتی ھیں، میرا سر چکرانے لگتا ھے جیسے مجھ پر کسی بیماری کا حملہ ھوا ھو یا میں نے اس قدر پی لی ھو کہ ھوش و حواس نے ساتھ چھوڑ دیا ھو؟

کیا اس کا مطلب یہ ھے کہ داغستان کا یہ چھوٹا سا گاؤں وینس، قاھرہ یا کلکتہ جیسے شہروں سے زیادہ خوبصورت ھے؟ یا میں سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے کسی پہاڑی پگڈنڈی سے جس آوار عورت کو گذرتے ھوئے دیکھتا ھوں وہ اسکینڈی‌نیویا کی کسی قدآور اور سنہرے بالوں والی دوشیزہ سے زیادہ حسین ھے؟

سدا! میں تیرے کھیتوں میں پھرتا ہوں اور صبح کی ٹھنڈی اوس میرے تھکے پیر دھوتی ہے۔ میں پہاڑی نالے سے نہیں بلکہ اس سوتے سے وہاں منہ دھوتا ہوں جہاں سے وہ پھوٹتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پیاس لگے تو اس جگہ جاکر پیاس بجھاؤ جہاں چشمہ زمین سے پھوٹتا ہے۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے اور خود ابا بھی کہا کرتے تھے کہ انسان کو صرف دو صورتوں میں جھکنا چاہئے، کسی بہتے ہوئے چشمے سے پیاس بجھانے کےلئے یا پھر کسی شاخ پر کھلا ہوا کوئی پھول توڑنے کےلئے۔ سدا! تو میرا چشمہ ہے، میں تجھ پر جھکتا ہوں اور تیری رعنائیوں سے جی بھر کر اپنی پیاس بجھاتا ہوں۔

مجھے ایک چٹان نظر آتی ہے اور اس پر ایک دھندلی سی پرچھائیں ابھرتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ میں ہوں، تیس سال پہلے کا رسول۔ میں چٹان پر بیٹھا ہوا بھیڑوں کے ایک گلے کی نگرانی کررہا ہوں۔ میرے سر پر ایک پاپاخ ٹوپی ہے، ہاتھ میں ایک لمبی سی لاٹھی اور میرے پیر گرد میں اٹے ہوئے ہیں۔

مجھے ایک پگڈنڈی نظر آتی ہے اور اس پگڈنڈی پر بھی وہی پرچھائیں ابھرتی ہے، جو میری اپنی پرچھائیں ہے۔ یہ میں ہی ہوں، تیس سال پہلے کا رسول۔ میں پاس کے کسی گاؤں کی طرف جارہا ہوں، غالباً ابا نے کسی کام سے بھیجا ہے۔

قدم قدم پر میری ملاقات میری اپنی ذات سے ہوتی ہے، اپنے بچپن سے ہوتی ہے، ان بہاروں سے، برسات کے موسموں سے، پھولوں سے اور پت‌جھڑ کے زمانے میں ہر طرف بکھر جانےوالی پتیوں سے ہوتی ہے جو میرے بچپن کی یاد سے وابستہ ہیں۔

میں کپڑے اتار دیتا ہوں اور ایک بلوریں آبشار کے نیچے کھڑا ہوجاتا ہوں۔ پہاڑ کی چٹان سے گرنےوالی پانی کی چادر آٹھ بار حصوں میں ہٹ جاتی ہے اور آگے بڑھ کر پھر ملتی ہے، پھر جدا ہوتی ہے اور پھر ایک دوسرے سے مل کر آبشار کا روپ دھار لیتی ہے اور اپنا سارا سرمایہ میرے شانوں، میرے بازوں اور میرے سر پر انڈیل دیتی ہے۔ میرے اس ٹھنڈے آبشار کے مقابلے میں پیرس کے پیلانس روائل ہوٹل کا غسل‌خانہ ایسا لگتا ہے جیسے پلاسٹک کا کوئی کھلونا۔

چٹانوں کے درمیان ایک پہاڑی نالے کے دھارے نے جمع ہو کر تالاب کی شکل اختیار کر لی ہے جسکا پانی دن کو گرم ہو جاتا ہے۔ لندن کے میٹروپول ہوٹل میں نہانے کا نیلگوں ٹب میرے اس پہاڑی غسل‌خانے کے آگے اس حقیر طشت کی طرح ہے جو ہاتھ منہ دھونے کےلئے استعمال کیا جاتا ہے۔

بڑے بڑے شہروں کی سڑکوں پر چکر لگانا میرا محبوب مشغلہ ہے، مگر پانچ، چھ بار طویل مسافت کے بعد شوق کی یہ آگ بجھ جاتی ہے، شہر کی اجنبیت ختم ہوجاتی ہے اور گھومنے پھرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔

لیکن یہاں میں اپنے گاؤں کی چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر ہزاروں چکر لگا رہا ہوں، لیکن اکتاھٹ کا نام و نشان بھی نہیں اور نہ ہی چکر لگانے کی شدید خواھش میں ذرا سی کمی آئی ہے۔

اس بار میں گاؤں کے ایک ایک گھر میں گیا، میں نے ایک ایک چولھے پر حاضری دی، چاہے ان میں شعلوں کا رقص جاری ہو یا شعلوں کی جگہ دھکتے ہوئے انگارے لے چکے ہوں یا خاکستر میں دبی ہوئی چنگاریاں بھی سرد پڑ چکی ہوں۔ ان سب پر میں نے اپنا سر جھکایا جس پر وقت کی ٹھنڈی راکھ پھیل چکی ہے۔

میں ان پالنوں کے قریب کھڑا ہوا جن میں پہاڑی علاقوں کا مستقبل بچوں اور بچیوں کی صورت میں مصروف استراحت تھا، کچھ پالنے خالی تھے لیکن انسانی بدن کی حرارت اب بھی ان میں موجود تھی، اور کچھ ایسے بھی تھے جن میں رکھے ہوئے کمبل اور تکیئے بہت پہلے ہی سرد پڑ چکے تھے۔

جب بھی میں ان پالنوں کے پاس کھڑا ہوا مجھے یوں لگا ہے کہ یہ میں ہوں جو ان کی آغوش میں سورہا ہوں اور ابھی میری زندگی کا سفر شروع نہیں ہوا ہے۔ پہاڑی پگڈنڈیاں، روس کی چوڑی چکلی شاھراھیں اور غیرملکی علاقوں کی سڑکیں اور ہوائی اڈے ابھی دور کی باتیں ہیں۔

میں نے پالنوں پر جھک کر بچوں کو لوریاں سنائی اور اس وقت تک سناتا رہا جب تک وہ میرے سیدھے سادے گیت سن کر سو نہ گئے۔

میں سدا کے قبرستان بھی گیا جہاں ان پرانی قبروں کے شانہ بہ شانہ جن پر گھاس اگی ہوئی ہے، مجھے نئی نئی قبریں بھی دکھائی دیں جن سے ابھی تازہ کھدی مٹی کی مہک بھی دور نہیں ہوئی۔

میں ان گھروں میں بھی سر جھکائے بیٹھا رہا جہاں تجہیز و تکفین کے انتظامات ہو رہے تھے اور شادیوں کے موقع پر ہنگامہ خیز ناچوں میں بھی شامل ہوا۔ میں نے بہت ساری ایسی کہانیاں اور داستانیں سنیں جو میرے لئے قطعی نئی تھیں، بہت ساری ایسی تھیں جنہیں میں پہلے سن چکا تھا، لیکن بھول بیٹھا تھا اور اب وہ ایک بار پھر میری یاد کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھر کر ذہن کی بالائی سطح پر آگئی تھیں...

جو کچھ نیا تھا وہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا، جو کچھ پرانا تھا وہ میں نے دوسروں کی زبانی سنا اور یادوں کے نقوش ابھر آئے، میری یادوں کے نقوش جو ایک بڑی تکلی پر لپٹے ہوئے رنگا رنگ دھاگوں کی طرح تھے۔ اور پھر میرے ذہن میں اس خوش رنگ قالین کی تصویر ابھر آئی جو ان دھاگوں کی مدد سے تیار کیا جا سکتا تھا۔

ابھی کل تک نہ تھا احساس مجھ میں ذمہ‌داری کا
لڑکپن، رات دن آوارہ گردی، زندگانی تھا
اچانک نیل گوں آنکھوں نے دنیا ھی بدل ڈالی
وہ بچپن کی شرارت کا زمانہ اب کہانی تھا

ابھی کل ھی ھوا احساس مجھ کو ذمہ‌داری کا
کہ سنجیدہ مزاجی ھی تقاضائے محبت ھے
اچانک نیل گوں آنکھوں نے وہ جادو کیا مجھ پر
کہ بچپن کی شرارت کا زمانہ پھر حقیقت ھے

ھاں! میں ایک عشقیہ نظم لکھ رہا ھوں جو ابھی پوری نہ ھوئی ھے۔ اسکا موضوع ھے عاشق اور محبوبہ۔ اس میں عاشق میں ھوں اور ھیروئن وہ دوشیزہ جس سے میں پیار کرتا ھوں۔ مجھے اس نظم کی تکمیل کی طرف متوجہ ھونا چاھئے لیکن مجھے

اچانک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی مجھے کوئی ہنگمی ایک تار ملتا ہے اور اب مجھے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہوائی اڈے کی طرف دوڑ جانا چاہئے۔

یا کچھ اس طرح کی بات ہوتی ہے کہ پہاڑی گاؤں میں رہنےوالی کوئی عورت صبح سویرے چولھے میں آگ جلا رہی ہے۔ وہ رات کا باقی بچا کھانا گرم کرنا چاہتی ہے جو پورے گھرانے کےلئے کافی ہوگا۔ اچانک قطعی غیرمتوقع طور پر کوئی مہمان آجاتا ہے، اب اسے وہ پتیلی چولھے پر سے اتار لینی ہے جس میں باسی کھانا گرم ہورہا تھا اور اسکی جگہ تازہ کھانا تیار کرنا ہے۔

یا پھر کچھ ایسا ہوتا ہے کہ کسی برات میں دولھا کے نوجوان دوست اور ساتھی اسے گھیرے بیٹھے ہیں لیکن اچانک انہیں اٹھنا پڑتا ہے، کیونکہ کچھ بزرگ کمرے میں داخل ہو گئے ہیں اور ان کےلئے جگہ خالی کرنا ضروری ہے۔

یا پھر یہ صورت ہوتی ہے کہ مہمان‌خانے میں بزرگ جمع ہیں اور وہاں بچے بھی کھیل رہے ہوں۔ اچانک بچوں کو کمرے سے باہر نکال دیا گیا کیونکہ بزرگوں کو کچھ اہم مشورے کرنے ہیں۔

اکثر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی شکاری، کوئی ماہی‌گیر یا گھوڑسوار ہوں۔ میں خیالات کا شکار کرتا ہوں، انہیں مچھلی کی طرح پکڑتا ہوں، گھوڑے کی طرح ان پر زین کستا ہوں اور ایڑ لگاتا ہوں۔ اور کبھی کبھی یہ احساس قطعی مختلف صورت اختیار کر لیتا اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ہی کوئی ہرن، کوئی مچھلی یا کوئی گھوڑا ہوں اور یہ میرے افکار، میرے خیالات اور احساسات ہیں جو شکاری کی طرح میرا پیچھا کررہے ہیں، مجھے پکڑ رہے ہیں، مجھ پر سوار ہورہے ہیں اور میری باگ مضبوط ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ہیں۔

جی ہاں، خیالات و احساسات بھی پہاڑی علاقوں میں بن‌بلائے مہمانوں کی طرح ہیں، جنہیں نہ کوئی مدعو کرتا ہے اور نہ جن

کے آنے کی پہلے سے کوئی خبر ہوتی ہے اور آنےوالے مہمان سے نہ تو چھپا جاسکتا ہے نہ بھاگا جا سکتا ہے۔

ہمارے پہاڑی علاقوں میں مہمانوں کے درمیان کسی طرح کی تفریق نہیں برتی جاتی ، مہمان صرف مہمان ہوتا ہے، نہ اہم نہ غیراہم، نہ برتر نہ کم تر۔ انتہائی معمولی مہمان بھی ہمارے لئے اہمیت رکھتا ہے اور محض اس لئے کہ وہ مہمان ہے۔ ہم اپنے معمولی سے معمولی مہمان کو بھی، معززترین اور معمرترین میزبان سے زیادہ عزت و احترام کا مستحق سمجھتے ہیں۔ ہم اپنے مہمان سے یہ کبھی نہیں پوچھتے کہ وہ کہاں سے آیا ہے، بس دروازے پر اسکا استقبال کرتے ہیں، اسے آتش دان کے قریب سب سے اچھی جگہ دیتے ہیں اور سب سے نرم گدے پر بٹھاتے ہیں۔

پہاڑوں میں مہمان ہمیشہ اچانک آتے ہیں، لیکن وہ کبھی غیرمتوقع نہیں ہوتے، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ مہمان آئیں اور ہم ان کے استقبال کےلئے پوری طرح تیار نہ ہوں، کیونکہ ہم ہر وقت، ہر دن، ہر گھنٹے اور ہر لمحے ان کے منتظر رہتے ہیں۔

اس کتاب کا تصور بھی میرے ذہن میں اسی طرح آیا ہے جس طرح پہاڑی علاقوں میں مہمان آیا کرتے ہیں۔

یا کچھ ایسی صورت ہوتی ہے کہ آپ کے پاس کوئی خاص کام نہیں ہے، آپ محض یہ دیکھنے کےلئے کہ آپ کا ساز ٹھیک ٹھاک ہے یا نہیں اسے دیوار سے اتار لیتے ہیں۔ اور اسکے تاروں کو یوں ہی چھیڑنا شروع کر دیتے ہیں، پھر آپ کے ذہن میں کوئی نغمہ جاگ اٹھتا ہے، آواز کا بہاؤ شروع ہوجاتا ہے اور آپ یہ محسوس کئے بغیر گانے لگتے ہیں کہ رات ڈھل چکی ہے اور صبح ہونے ہی والی ہے۔

یا پھر یوں کہا جائے کہ ایک نوجوان کسی معمولی کام سے پڑوس کے گاؤں گیا، مگر لوٹا تو گھوڑے کی زین پر اسکے پیچھے ایک عورت بیٹھی نظر آئی جو اسکی نئی نویلی دولہن تھی۔

تو مدیر محترم! میں آپ کے حکم کی تعمیل کرونگا۔ جلد ہی میں داغستان پر ایک کتاب شروع کررہا ہوں۔ لیکن اگر میں آپکی مقررہ مدت تک اسے مکمل نہ کرسکوں تو مجھے معاف کردیجئے گا

کیونکہ مجھے بہت ساری راہوں سے گذرنا پڑے گا اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے پہاڑی علاقوں میں راہیں کتنی تنگ ہوتی ہیں اور ڈھلوان بھی۔ دور بہت دور میرے پہاڑ ناتراشیدہ ہیروں کی طرح چمک رہے ہیں۔ میرے صبارفتار گھوڑے کو وسیع و عریض میدان درکار ہے اور وہ اس تنگ گھاٹی میں چلنے کےلئے تیار نہیں جسکی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

میں اپنے داغستان کو آپ کی طرف سے دئے گئے ۹، ۱۰ صفحوں میں سمیٹ بھی نہیں سکتا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ ''کامیابیوں، کارناموں اور روزانہ محنت کی داستان،، قلمبند کرنا ''عام محنت کش عورتوں اور مردوں کی کہانی، انکی بےلوث کوششوں اور امنگوں کی کہانی،، لکھنا، ''اپنے کوھستانی وطن کے روشن 'مستقبل،' اسکی صدیوں پرانی روایات،، کا ذکر کرنا اور ساتھ ساتھ ''اس کے شاندار 'حال، پر،، زور دینا میرے بس میں نہیں ہے۔ میرا نازک قلم اتنا زبردست بوجھ نہیں اٹھا سکتا، اسکی نب پر مچلتے ہوئے سیاہی کے ایک قطرے میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ چھلکتی ہوئی ندیوں، لگاتار بہتے ہوئے آبشاروں کو، دنیا کے مقدر یا کسی ایک انسان کے مقدر کو اپنے آپ میں جذب کرسکے۔

پرندہ بڑا ہو تو اس میں خون کی مقدار بھی زیادہ ہوتی ہے، چھوٹا ہو تو اس میں خون بھی کم ہوتا ہے۔ خون کی مقدار کا انحصار پرندے کی جسامت پر ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی نے پھل کھا کر گٹھلی پھینکی جو اتفاق سے ایک ھرن کے سر پر جا پڑی اور اس سے خوبصورت سینگیں اگ آئیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر رات نہ ہوتی تو صبح کی روشنی بھی وجود میں نہ آتی۔

اور یہ بھی کہا جا چکا ہے:

''عقاب! تیرا جنم کہاں ہوا تھا؟،،

''ایک تنگ گھاٹی میں۔،،

''عقاب! تو کہاں پرواز کررہا ہے؟،،

''وسیع و عریض آسمانوں میں۔،،



کچھ اس کتاب کے مقصد اور اس کے نام کے بارے میں

وقتاً فوقتاً میں تقریبات کی نوید دیتی رہتی ہوں
لیکن میری آواز میں خبردار رہنے کی گونج
بھی ہو سکتی ہے۔
(ایک گھڑیال پر لکھی ہوئی عبارت)

اس کا باپ بھی مخلص اور بہادر تھا اور یہ
بھی بڑا ہو کر مخلص اور بہادر بنے گا
یہ بچہ باپ کے نام پر داغ نہ لگنے دے گا
اس کے باپ کا خنجر دیوار پر آویزاں ہے
اور لوریاں وہ کارنامے سنا رہی ہیں جو اس
نے انجام دئے۔
(پالنے پر ایک کتبہ)

پہاڑوں کے رہنے والوں کو دو چیزیں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں، اپنی پاپاخ ٹوپی اور اپنے نام کی عزت۔ پاپاخ کی لاج وہی رکھ سکتا ہے جس کے پاس سر ہو اور اپنے نام کی عزت وہی برقرار رکھ سکتا ہے جس کے دل میں شعلوں جیسی حرارت ہو۔

ہمارے چھوٹے سے گھر کی چھت میں گولیوں کے کئی نشان ہیں۔ یہ پستول کی ان گولیوں کے نشانات ہیں جو ابا کے دوستوں نے آس پاس کی چٹانوں میں بسیرا کرنےوالے عقابوں کو یہ اطلاع دینے کے لئے چلائی تھیں کہ ان کے یہاں ایک اور بھائی پیدا ہوا ہے، داغستان میں ایک اور عقاب کا اضافہ ہوا ہے۔

پستول داغ دینے یا گولی چلا دینے سے تو بیٹا پیدا نہیں ہوسکتا لیکن یہ ہمارے یہاں کا رواج ہے کہ بیٹا پیدا ہو تو بندوق داغنا چاہئے۔

ابا کے ایک دوست نے میرے اعزاز میں دو بار گولی چلائی، پہلی گولی کا نشانہ چھت کو بنایا گیا، یہ میری پیدائش کا اعلان تھا، اور دوسری گولی فرش پر چلائی گئی، یہ اس وقت جب میرا نام رکھا گیا۔

اماں نے مجھے بتایا تھا کہ میرا نام کس طرح رکھا گیا تھا۔ میں اپنے گھر میں تیسرا بیٹا تھا، ایک بیٹی، میری بہن، بھی تھی، مگر یہ تو مردوں کی، بیٹوں کی بات ہے۔

ہمارے گھر میں پیدا ہونےوالے پہلے بیٹے کا نام اسکی پیدائش سے بہت قبل ہی لوگوں کو معلوم رہتا تھا کیونکہ رسم کے مطابق اسے اپنے مرحوم دادا کا نام ملنا چاہئے۔ ہمارے گاؤں میں سبھی کو یہ بات یاد تھی اور سب کہتے تھے کہ بہت جلد حمزہ کے گھرانے میں ایک اور محمد آجائے گا۔

میرے دادا کے گھر میں بلیوں اور کتوں کو چھوڑ کر کبھی کوئی اور چوپایہ داخل نہ ہوا۔ انہوں نے شاید ہی کبھی کوئی کمبل استعمال کیا ہو اور غالباً انڈرویر کا تو نام بھی نہ سنا ہوگا۔ دنیا کا کوئی بھی ڈاکٹر اس بات پر فخر نہیں کر سکتا کہ اس نے کبھی ان کو دیکھا ہو، ان کے منھ کا معائنہ کیا ہو، انکی نبض ٹٹولی ہو، ان سے لمبی اور گہری سانس لینے کو کہا ہو یا ان کے جسم کی جانچ کی ہو۔ ہمارے گاؤں میں انکی پیدائش اور انتقال کی صحیح تاریخیں بھی کسی کو یاد نہ تھیں۔ ابا کو بدنام کرنے کی غرض سے لکھی تحریر کو اگر قابل اعتبار سمجھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ میرے دادا محمد عربی زبان

میں کچھ شدید ضرور رکھتے تھے۔ یہ دادا ہی کا نام تھا جو ابا کے پہلے بیٹے، میرے سب سے بڑے بھائی کو ملا۔

ابا کے ایک چچا بھی تھے جن کا انتقال میرے دوسرے بھائی کی پیدائش سے ذرا ہی پہلے ہوا تھا، ان کا نام اخیلچی تھا۔

پھر جب میرے منجھلے بھائی نے جنم لیا تو گاؤں والوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، سب نے کہا ''لو! دوسرا اخیلچی آ گیا، ہمارا اخیلچی پھر جی اٹھا۔ اگر اس کے مکان پر کوئی کوا آ بیٹھے تو خوشی ہی لائے کسی مصیبت کی علامت نہ ثابت ہو۔ خدا کرے یہ بچہ بھی بڑا ہو کر اتنا ہی شریف‌النفس اور نیک نکلے جتنا وہ تھا جسکا نام اسے دیا جارہا ہے۔''

مگر میری ولادت کے وقت تک کوئی نام ایسا نہ بچا تھا جو مجھے مل سکتا۔ ابا کے کسی عزیز یا دوست کا نہ تو اس زمانے میں انتقال ہوا تھا نہ کوئی دیارغیر میں جا کر گم ہوا تھا کہ اس کا نام مجھے دیا جا سکتا تا کہ اس نام کی لاج رکھ سکوں۔

جب میں پیدا ہوا تو ابا نے گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو دعوت دی کہ وہ جمع ہو کر میرے لئے کوئی نام چن دیں۔ سبھی لوگ آئے اور اتنی سنجیدگی اور اطمینان سے بیٹھ گئے گویا کسی ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے جا رہے ہوں۔ ہر ایک کے ہاتھ میں بلخار کے کوزہ گروں کا بنایا ہوا بڑا سا جام تھا، سارے ہی جام جھاگدار بوزا سے لبریز تھے۔ صرف ایک شخص کا ہاتھ خالی تھا، یہ گاؤں کے سب سے معمر بزرگ تھے، جنکے سر اور داڑھی کے بال یکسر سفید ہوچکے تھے اور جن کے چہرے پر پیغمبروں جیسا نور برس رہا تھا۔

پھر بغل کے کمرے سے اماں داخل ہوئیں اور انہوں نے مجھے انہی بزرگ کے حوالے کر دیا۔ ادھر میں انکی گود میں لہک رہا تھا اور ادھر اماں ان سے کہہ رہی تھیں:

''محترم بزرگ! آپ نے ہماری شادی پر گیت گائے تھے، کبھی ہاتھ میں پاندور لے کر کبھی طنبورہ لے کر۔ آپ کے گیت بہت ہی پرلطف تھے۔ اب جبکہ میرا بچہ آپ کے ہاتھوں پر ہے، آپ کون‌سا نغمہ عنایت کرینگے؟''

''نیک دل خاتون! ماں کی حیثیت میں اب تو اسے گیت سنائے گی، اسکا پالنا ہلا ہلا کر، پھر پرندے اور دریا اسے گیت سنائینگے، یوں تو یہ تلواروں اور گولیوں سے بھی گیت سنےگا لیکن سب سے اچھا اور خوبصورت‌ترین گیت تو اسے اسکی دولہن ہی سنائے گی۔ ''

''تو پھر آپ اسکا نام رکھ دیجئے، تاکہ میں، ہمارا سارا گاؤں اور سارا داغستان اس نام سے واقف ہو جائے جو اس کےلئے آپ اس وقت تجویز کرینگے۔ ''

اس بزرگ انسان نے مجھے اپنے ہاتھوں پر اوپر اٹھایا اور کہا:

''لڑکی کا نام ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں ستاروں جیسی چمک اور پھولوں جیسی مہک ہو۔ لیکن مرد کے نام میں تلوار کی جھنکار یا کتابوں کے علم و دانش کا اظہار ہونا چاہئے۔ میں نے کتابوں میں بہت سے نام پڑھے ہیں اور تلواروں کی جھنکار نے بھی مجھے بہت سارے نام سکھائے ہیں۔ میری کتابیں اور میری تلواریں اس وقت مجھ سے سرگوشی کررہی ہیں اور اس سرگوشی میں ایک ہی نام گونج رہا ہے وہ ہے رسول۔''

پھر اس بزرگ نے جس کے چہرے پر پیغمبروں جیسا نور تھا جھک کر میرے ایک کان میں سرگوشی کی: ''رسول'' اور پھر دوسرے میں بلند آواز سے اعلان کیا: ''رسول''۔ پھر انہوں نے روتے ہوئے بچے کو ماں کے حوالے کیا اور انہیں نیز وہاں بیٹھے دوسرے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''یہ لو! یہ رسول ہے۔ ''

پورے گھر پر چھائی ہوئی خاموشی نے میرا یہ نام قبول کیا۔ پھر دوسرے بڑے بوڑھوں نے اپنے اپنے جام خالی کئے، مونچھوں کو ہاتھ کی پشت سے پونچھتے ہوئے ہوں کہہ کر بزرگ کی تائید کی۔

ہاں پہاڑوں میں رہنےوالوں کو دو چیزیں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں، اپنی پاپاخ اور اپنا نام۔ ہو سکتا ہے کہ کسی سر کےلئے پاپاخ بہت بھاری ہو۔ نام بھی بھاری ہو سکتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ سفید بالوں‌والے اس بزرگ نے جو بڑے پڑھےلکھے تھے اور دیس دیس کی سیر کر چکے تھے، میرے

نام کے ساتھ ایک خاص معنی اور ایک خاص مقصد وابستہ کر دیا تھا۔

عربی میں رسول کے معنی ہوتے ہیں ''پیغامبر،، یا ''ایلچی،،۔ سوال یہ ہے کہ میں کس کا پیغامبر یا ایلچی ہوں؟

میری نوٹ بک سے۔ بلجیم کی بات ہے۔ میں شاعروں کے ایک اجتماع میں شریک تھا جو ساری دنیا سے یہاں اکٹھا ہوئے تھے اور مختلف قوموں اور ملکوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جتنے لوگ بھی اسٹیج پر آئے انھوں نے اپنی قوم، اسکی تہذیب، شاعری اور اس کے مستقبل کی بات کی۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو وطن سے نہیں کہیں اور سے آئے تھے، مثلاً ہنگری کا ایک شاعر لندن سے آیا تھا، ایک استونیائی شاعر پیرس سے آیا تھا اور ایک پولستانی شاعر سان‌فرانسسکو سے... اب یہ تو مقدر کا کھیل تھا، زندگی کی ہواؤں کا کھیل تھا جو ان لوگوں کو اپنے ساتھ اڑا کر مختلف ملکوں میں، دوردراز سمندروں اور پہاڑوں کے اس پار اپنے وطن سے ہزارہا میل دور پہنچا گئی تھیں۔

مجھے سب سے زیادہ تعجب ایک شاعر کی تقریر سن کر ہوا جس نے بڑے طمطراق کے ساتھ اعلان کیا:

''صاحبو! آپ لوگ مختلف ملکوں سے آئے ہیں، آپ مختلف قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہاں اکیلا آدمی میں ہوں جو نہ کسی ملک کی نمائندگی کرتا ہے، نہ کسی خاص قوم کی۔ میں سارے ملکوں اور ساری قوموں کا نمائندہ ہوں۔ میں شاعری کا نمائندہ ہوں، میں شاعری ہوں، میں وہ سورج ہوں جو اپنی روشنی سے پوری دنیا کو فیض پہنچاتا ہے، وہ بادل ہوں جو خطۂ زمین کے گوشے گوشے پر برستا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ اس کی قوم کیا ہے۔ میں وہ پیڑ ہوں جو دنیا کے ہر گوشے میں پھول پھل سکتا ہے۔،،

یہ کہکر وہ شاعر اسٹیج سے اتر گیا۔ بہت سارے لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ میں نے بھی سوچا کہ بات تو صحیح ہے، ہم شاعروں پر پوری دنیا کی ذمہ‌داری ہے، لیکن جس شخص کو اپنے وطن سے پیار نہ ہو، وہ ساری دنیا کی نمائندگی نہیں کرسکتا۔ میرے نزدیک تو اس شخص کی مثال ایسی ہے جو اپنے وطن عزیز کو

چھوڑ کر کسی اور جگہ جا بسا ہو، وہیں شادی کر لی ہو اور اپنی ساس کو ماں کہنے لگا ہو - میں ساسوں کا احترام کرتا ہوں، لیکن ماں تو ماں ہی ہوتی ہیں -

اگر کوئی آپ سے پوچھے کہ آپ کون ہیں تو آپ اس کے سامنے اپنے کاغذات پیش کر سکتے ہیں، اسے اپنا پاسپورٹ دکھا سکتے ہیں جس میں آپ سے متعلق ساری ضروری اطلاعات موجود ہوتی ہیں - یہی سوال جب کسی قوم سے کیا جائے تو وہ اپنی اسناد کی صورت میں اپنے سائنس‌دانوں کو ، اپنے ادیبوں، اپنے فنکاروں اور اپنے مدبروں کو پیش کرتی ہے -

ہر انسان کو ابتدائے شباب سے ہی یہ جان لینا چاہئے کہ وہ اس دنیا میں اس لئے آیا ہے کہ اپنی قوم کی نمائندگی کرے اور اسے اس فریضے کی ادائیگی کےلئے تیار رہنا چاہئے -

اسی لئے ہر انسان کو ایک نام دیا جاتا ہے، پاپاخ دی جاتی ہے، خنجر دیا جاتا ہے اور پالنے ہی میں اسے اس کے وطن کے گیت سنائے جاتے ہیں -

قسمت مجھے جہاں جہاں بھی لے گئی ہے، میں نے اپنے آپ کو اس سرزمین، ان پہاڑوں اور اس گاؤں کا نمائندہ سمجھا ہے جہاں مجھے پہلی بار گھوڑے پر زین کسنا سکھایا گیا - میں جہاں بھی رہا ہوں اپنے آپ کو اپنے وطن داغستان کا خصوصی نمائندہ سمجھا ہے -

لیکن جب کبھی میں اپنے وطن داغستان واپس آیا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوا ہے کہ میں مجموعی طور پر پوری انسانی تہذیب کا خصوصی نمائندہ ہوں، سارے سوویت ملک کا اور یہی نہیں پوری دنیا کا سفیر اور خصوصی نمائندہ ہوں -

میرے وطن تری تعریف کیا بیان کروں
ہزار عزم ہے، پر گیت گا نہیں سکتا
یہ میرا دل ہے کہ سامان سے بھرے تھیلے
ہزار چاہوں، لب ان کے ملا نہیں سکتا

میں چاہتا ہوں کہ دنیا پر ایک نظم لکھوں
اسی زبان میں جس میں ہزار گیت لکھے

مگر کچھ ایسا ہے، جیسے کہ کوئی کیسۂ زر
ہزار چاہوں، یہ مجھ سے کبھی بھی کھل نہ سکے

جب میں سفر سے لوٹ کر گھر آتا ہوں تو میرے گاؤں کے لوگ مجھے گھیر لیتے ہیں۔ میرے گھر کی چھت پر محفل جمتی ہے اور میں ان کے طرح طرح کے سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔

''کیا تمہیں دوسرے ملکوں میں ہمارے دیس کا بھی کوئی آدمی ملا؟''

''اپنے سفر میں تم نے ہمارے جیسے پہاڑ بھی کہیں دیکھے؟''

''وطن سے دور کبھی تمہیں اپنا گھر بھی یاد آتا تھا، اپنے گاؤں کا بھی خیال آتا تھا؟''

''کیا بیرونی ملکوں میں رہنےوالے ہمارے بارے میں بھی کچھ جانتے ہیں؟ کیا انہیں معلوم ہے کہ ہم بھی انکی دنیا کا ایک حصہ ہیں؟''

میں جواب دیتا ہوں:

''بات یہ ہے کہ جب ہم ہی اپنے بارے میں ٹھیک ٹھیک نہیں جانتے تو دوسرے کیسے جانینگے؟ ہماری تعداد لگ بھگ دس لاکھ ہے اور یہ سارے ہی لوگ چاروں طرف سے داغستان کی پہاڑیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہم دس لاکھ لوگ ہیں اور چالیس مختلف زبانیں بولتے ہیں...''

''تو پھر تم ہمیں ہمارے اپنے وجود سے واقف کراؤ اور دوسرے لوگوں کو جو دنیا کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں ہمارے وجود کا احساس دلاؤ۔ صدیوں سے ہماری تاریخ تلواروں اور خنجروں سے لکھی جاتی رہی ہے، اب ان کرداروں کو ایسی زبان عطا کرو جسے سبھی لوگ سمجھ سکیں۔ تم جو سدا کے گاؤں میں پیدا ہوئے ہو اگر تم یہ کام نہ انجام دوگے تو پھر کون انجام دے سکے گا۔

''اپنے افکار کو چنے ہوئے غولوں کی صورت دیدو جن میں تمام گھوڑے ایک دوسرے کے برابر ہوں، کوئی کسی لحاظ سے دوسرے سے کم نہ ہو۔ پھر انہیں اپنے صفحات کے پاکیزہ میدانوں میں چھوڑ دو۔ اپنے افکار کو سراسیمہ گھوڑوں اور ڈری سہمی بھینسوں کی طرح ان صفحات سے گذرنے دو۔

"اپنے خیالات چھپا کر نہ رکھو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو بھول جاؤگے کہ تم نے انہیں کہاں رکھا ہے، بالکل اس کنجوس کی طرح جو اپنا خزانہ کہیں دفن کر دیتا ہے کچھ دن بعد بھول جاتا ہے کہ اس نے اپنا سرمایہ کہاں دفن کیا تھا اور یوں محض لالچ میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتا ہے۔

"لیکن اپنے خیالات دوسروں کے حوالے بھی نہ کرو۔ بچوں کو کھلونے کے بجائے کھیل کےلئے کوئی قیمتی اور نازک اوزار نہیں دیدینا چاہئے۔ بچہ اسے کھو دےگا، توڑ دےگا یا اپنے ہاتھ زخمی کر لےگا۔

"تمہارے گھوڑے کی عادتیں تم سے زیادہ بہتر کوئی اور نہیں جان سکتا۔"

میرے والد کے راستے کی کہانی۔ ہمارے چھوٹے سے گاؤں سدا سے ایک پختہ سڑک ضلع کے صدرمقام حنزہ کو جاتی ہے۔ لیکن ابا نے اس عام سڑک سے الگ اپنے لئے ایک پگڈنڈی تلاش کر لی تھی اور جب انہیں حنزہ جانا ہوتا تو وہ اسی پگڈنڈی کا استعمال کرتے۔ انہوں نے یہ راستہ تلاش کیا تھا، اسے ہموار بنایا تھا اور صبح شام اسی سے گذرتے تھے۔

ابا کو اس راستے پر چلتے ہوئے دونوں طرف کی جھاڑیوں سے رنگارنگ اور خوبصورت پھول چننے میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ ان خوبصورت پھولوں سے وہ اور بھی زیادہ خوبصورت گلدستے بنایا کرتے تھے۔

جاڑا آتا تو وہ اپنے راستے کے اردگرد برف کے تودوں سے طرح طرح کی شکلیں بناتے، کہیں آدمی کا بت، کہیں گھوڑا اور کہیں گھوڑسوار۔ سدا اور حنزہ دونوں ہی جگہ کے لوگوں کو انکے یہ بت بڑے اچھے لگتے، چنانچہ لوگوں کا ھجوم انہیں دیکھنے کےلئے امنڈ آتا۔

ابا کے بنائے ہوئے پھولوں کے گلدستے کب کے مرجھا چکے ھیں اور برف کی شبیہیں پگھل کر بہہ گئی ھیں لیکن داغستان کے یہ پھول اور پہاڑیوں کے خدوخال آج بھی ان کی شاعری میں زندہ ھیں۔

اپنے لڑکپن میں ایک بار جب ابا زندہ تھے مجھے حنزہ جانا پڑا۔ میں نے سوچا کہ پکی سڑک چھوڑ کر ابا والی پگڈنڈی اختیار کروں۔ ابھی میں نے ادھر کا رخ ہی کیا تھا کہ ایک بزرگ مل گئے، انہوں نے مجھے روک دیا اور کہنے لگے:

''باپ کے بنائے راستے پر مت چلو! اپنی راہ خود نکالو!''

میں نے انکی یہ هدایت مان لی اور ایک نئے راستے کی تلاش شروع کی۔ میرے نغموں کا یہ راستہ طویل بھی رہا ہے اور دشوار گذار بھی، لیکن میں آج بھی اسی راستے پر چل رہا ہوں اور خود اپنے گلدستے کےلئے پھول جمع کرتا جا رہا ہوں۔

اور اسی راستے پر چلتے ہوئے زیرنظر کتاب لکھنے کا خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا۔

اس طرح کے خیال کا ذہن میں جنم لینا ایسا ہے جیسے حمل کا قرار پانا۔ تخلیق تو معینہ مدت پوری ہونے کے بعد ہی وجود میں آئےگی، لیکن اس دوران تخلیق کو ذہن میں ان ہی ارتقائی مدارج سے گذرنا پڑےگا جن سے نطفہ ماں کے رحم میں گذرتا ہے اور پھر زبردست محنت اور دردزہ کی جان‌لیوا اذیت کے بعد بچہ جنم لیتا ہے۔ کتاب لکھتے ہوئے بھی مصنف کو ان مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔

بچے کےلئے نام کا انتخاب اسکی پیدائش سے پہلے بھی کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر میں اپنی کتاب کےلئے کون‌سا نام منتخب کروں؟ کسی پھول کا؟ کسی ستارے کا؟ یا پھر علم و دانش کے کسی صحیفے میں کوئی مناسب نام تلاش کروں؟

نہیں! میں اپنے گھوڑے پر کسی اور کی زین نہیں کسونگا۔ کہیں اور سے لیا ہوا نام عرفیت یا لقب تو ہوسکتا ہے، اصل نام نہیں ہو سکتا۔

یہ سب تو ٹھیک ہے۔ لیکن جب آپ اپنی کتاب کےلئے کوئی نام تلاش کر رہے ہوں تو آپ کو کتاب کے مواد کا بھی خیال رکھنا پڑےگا اور اس مقصد کا بھی جو آپ انجام دینا چاہتے ہیں۔ آپ پاپاخ خریدتے ہوئے اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے سر کےلئے موزوں ثابت ہو، پاپاخ کےلئے سر تو

نہیں خریدا جاتا۔ کسی ساز میں تار کی لمبائی کا انحصار اس بات پر ھوتا ھے کہ ساز کتنا بڑا یا کتنا چھوٹا ھے۔

میرا گاؤں، میرے پہاڑ اور میرا داغستان وہ نشیمن ھے جہاں میرے خیالات، میرے احساسات اور میری امنگوں نے جنم لیا اور یہی وہ نشیمن تھا جہاں سے بال و پر ملتے ھی میں نے پرواز شروع کی۔ میرے سارے گیت اسی نشیمن کی دین ھیں۔ داغستان میرا گھر بھی ھے اور میرا گہوارہ بھی۔

تو پھر تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے کی کیا ضرورت ھے ؟ ھمارے پہاڑی علاقوں میں پوتے کو عام طور پر دادا ھی کا نام دیا جاتا ھے، یہ کتاب میرے ذھن کی پیداوار ھے اور میں داغستان کا بیٹا ھوں، اس لئے میں اسے ''داغستان،، کہوں گا۔ کیا اور کوئی نام اس سے زیادہ موزوں، زیادہ مناسب یا زیادہ صحیح ھو سکتا ھے؟

کسی ملک کے سفیر کی پہچان اس قومی پرچم سے ھوتی ھے جو اسکی کار پر لہراتا ھے۔ میری کتاب میرا ملک ھے اور اسکا نام اسکا جھنڈا ھوگا۔

ھر ادیب کے ساتھ ایسا ھوتا ھے کہ اس کے خیالات ایک ایک صفحے، ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ پر اس سے بحث کرتے ھیں۔ میرے خیالات نے بھی کتاب کے نام کے سلسلے میں مجھ سے بحث شروع کردی ھے۔ کسی بین الاقوامی کانفرنس میں شریک بہت سارے وزیروں کی طرح اس بات پر بھی متفق نہ ھو پا رھے ھوں کہ ایجنڈا کیا ھو۔

یوں سمجھئے کہ وزیروں میں سے ایک نے یہ تجویز رکھی ھے کہ کتاب کےلئے صرف یک لفظی نام ''داغستان،، ھی موزوں ھوگا۔ دوسرے وزیر کو یہ بات قطعی پسند نہیں آئی ھے، اس نے اپنے کاغذات سنبھالے ھیں اور بحث کےلئے اٹھ کھڑا ھوا :

''اس سے کام نہیں چلےگا، قطعی نہیں چلےگا۔ ایک چھوٹی سی کتاب کو ایک پورے ملک کا نام کیسے دیا جا سکتا ھے؟ اگر کسی بچے کے سر پر اسکے باپ کی پاپاخ رکھ دی جائے تو اس کا سر ھی غائب ھو جائےگا۔ ،،

''کام کیوں نہیں چلے گا؟،، تجویز پیش کرنےوالے نے جواب دیا۔ ''چاند آسمان کی وسعتوں میں تیرتا ہے اور اسکا عکس نیچے زمین پر دریا یا سمندر میں لرزتا نظر آتا ہے، ہم اس عکس کو بھی چاند ہی کہتے ہیں، اسکے لئے کوئی دوسرا لفظ نہیں گڑھتے۔ اور کیا اسکی کوئی ضرورت ہے؟ مجھے وہ کہانی یاد ہے جس میں ایک چالاک لومڑی نے ایک خونخوار بھیڑیئے کو چاند کا عکس دکھا کر کہا تھا کہ وہ دیکھو چربی کا ایک ٹکڑا وہاں پڑا ہے اور بےوقوف بھیڑیئے نے اس ٹکڑے کی طلب میں دریا میں چھلانگ لگا دی تھی، لیکن یہ تو لومڑی کی مکاری اور دغابازی تھی۔،،

''پھر بھی اس سے کام نہیں چلے گا، قطعی نہیں چلیگا،، تجویز کی مخالفت کرنےوالا وزیر اپنی بات پر اڑا رہا۔ ''داغستان دراصل سب سے پہلے ایک جغرافیائی تصور ہے۔ اس میں پہاڑ ہیں، دریا ہیں، گھاٹیاں ہیں، آبشار اور جھرنے ہیں اور یہی نہیں سمندر بھی اس میں شامل ہیں۔ جب بھی میں داغستان کا لفظ سنتا ہوں تو میری نگاہوں میں فوراً ایک نقشہ ابھر آتا ہے۔،،

''قطعی نہیں!،، میں بیچ میں بول پڑتا ہوں۔ ''داغستان سے میرا دل لبریز ہے اور میرا دل قطعی کوئی جغرافیائی نقشہ نہیں ہے۔ میرا جو داغستان ہے اسکی نہ کوئی جغرافیائی سرحد ہے، نہ کسی اور طرح کی کوئی حدبندی۔ میرا داغستان صدیوں کا کوئی ہموار تسلسل بھی نہیں۔ اگر میں اپنی کتاب لکھنے میں کامیاب ہوگیا تو یہ داغستان کی کوئی گائڈبک نہیں ہوگی۔ میں ساری صدیوں کو ایک دوسرے میں گلمڈ کر دونگا اور پھر اسکی تاریخ کا نچوڑ، وہاں کے عوام کی اصل روح اور ''داغستان،، کا جوہر نکال کر لوگوں کے سامنے پیش کرونگا۔،،

یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ داغستان ہر داغستانی کے لئے ایک ہی مطلب اور ایک ہی مفہوم رکھتا ہے، لیکن ہر داغستانی کی نگاہوں میں اس کے اپنے داغستان کی تصویر الگ ہوتی ہے۔

میرا بھی اپنا ایک داغستان ہے، صرف وہ داغستان جو میں دیکھتا ہوں اور جانتا ہوں اس کا تانا بانا ہر اس چیز سے بنا گیا ہے جس کا تجربہ مجھے اور ماضی اور حال کے ہر داغستانی کو

ہوا ہے، اس کے نغموں اور دریاؤں سے، اس کی کہاوتوں اور چٹانوں سے، عقابوں اور نعلوں سے، راہوں اور حتی کہ ان بازگشتوں سے جو پہاڑوں میں گونجی ہیں۔

اپنی نوٹ بک سے۔ کسلاوودسک صحت گاہ کے ایک کمرے میں ہم دو آدمی مقیم ہیں، ایک میں ہوں اور دوسرا ازبک قوم کا آدمی۔ صبح کو جب پو پھٹتی ہے یا شام کو جب شفق کا رنگ بکھرتا ہے تو ہمارے کمرے کی کھڑکی سے کوہ البرز کی دو چوٹیاں نظر آتی ہیں۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ دونوں چوٹیاں ان دو نڈر دوستوں کے منڈے ہوئے رن میں زخمی سروں کی طرح ہیں جو شامیل کے مرید تھے۔

اچانک میرا ساتھی بول اٹھتا ہے:

''ان دونوں چوٹیوں کو دیکھ کر مجھے بخارا کے اس معمر بزرگ کا خیال آجاتا ہے جسکے سر کے بال بالکل سفید ہوچکے تھے۔ وہ دو طشتریوں میں پلاؤ لئے کسی طرف جارہا تھا، لیکن اپنے سامنے پھیلی ہوئی وادی میں صبح کا سہانا منظر دیکھ کر اسقدر محو ہوا کہ اسی جگہ جم کر کھڑا ہوگیا۔''

اپنی نوٹ بک سے۔ کلکتہ کی سیاحت کے دوران میں رابندرناتھ ٹیگور کے گھر بھی گیا، وہاں مجھے ایک ایسے پرندے کی تصویر نظر آئی جسکا کبھی کوئی وجود ہی نہ رہا ہوگا۔ یہ تو ٹیگور کی روح میں پیدا ہوا اور اسکی دنیا وہیں تک محدود رہی، یہ انکی قوت تخئیل کا کرشمہ تھا۔ لیکن اگر انہوں نے دنیا میں سچ مچ کے پرندے نہ دیکھے ہوتے تو یقین مانئے وہ اس عجیب و غریب پرندے کی تخلیق سے بھی قاصر رہتے۔

میرے پاس بھی ایک ایسا ہی عجیب و غریب پرندہ ہے یہ ہے میرا داغستان۔ اور اسی لئے زیادہ موزوں یہ ہوگا کہ میں اپنی کتاب کا نام رکھوں ''میرا داغستان''۔ یہ اس لئے نہیں کہ داغستان میری ملکیت ہے بلکہ اس لئے کہ میرے ذہن میں داغستان کا جو تصور ہے وہ دوسروں کے تصور سے مختلف ہے۔

تو اب بات طے ہو گئی، میری کتاب کے سرورق پر لکھا جائے گا: ''میرا داغستان،،۔

ایک لمحے کےلئے وزیروں کی کانفرنس پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے، اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔ اچانک ایک اور وزیر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پلیٹ‌فارم پر پہنچ جاتا ہے۔

''میرا داغستان، میرے پہاڑ، میرے دریا، ہوسکتا ہے یہ سب کچھ کہنا کچھ زیادہ غلط نہ ہو۔ لیکن یہ سب جوانی کی باتیں ہیں، طالب‌علمی کے دور کی باتیں ہیں، جب ایک ساتھ مل جل کر رہنا اچھا لگتا ہے۔ بعد میں آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے پاس ایک الگ کمرہ ہو اور یہی نہیں بلکہ اسکا مکان ہو جسے وہ اپنا مکان کہہ سکے۔ صرف اتنا ہی کہنا کافی نہیں کہ آپ کے پاس اپنا چولھا ہے، بلکہ چولھے میں آگ کا جلنا بھی ضروری ہے اور نہ ہی یہ کہنا کافی ہے کہ یہ ''میرا پالنا،، ہے، پالنا ہے تو اس میں بچے کا ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ''میرا داغستان،، کہنا بھی کافی نہیں، ان الفاظ کے پیچھے کسی خیال کا ہونا ضروری ہے، داغستان کے مقدرات کا، اور اس داغستان کا ہونا ضروری ہے جو آج کا داغستان ہے۔ ہمارے قومی شاعر سلیمان استالسکی کی دانشمندی سے تو آپ سب ہی واقف ہیں۔ میں جو بات کہہ رہا ہوں اسکا سلیمان استالسکی کو پورا عرفان حاصل تھا۔ انہوں نے کہا تھا: 'نہ میں لیزغین شاعر ہوں، نہ داغستانی، نہ قفقازی۔ میں سوویت شاعر ہوں۔ اس پوری وسیع و عریض سرزمین کا مالک ہوں۔، یہ بات بوڑھے سفید ریش دانشور سلیمان نے کہی تھی۔ اور آپ ہیں کہ ہاتھ دھو کر اسی کے پیچھے پڑے ہیں: میرا گاؤں، میرے پہاڑ، میرا داغستان، گویا آپ کی دنیا صرف داغستان تک ہی محدود ہے، وہیں شروع ہوتی ہے اور وہیں ختم ہوجاتی ہے۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ دنیا کا آغاز کریملن سے ہوتا ہے؟ مجھے آپ کے دئے ہوئے نام میں یہی کمی نظر آتی ہے۔ آپ نے ایک سینہ تو تیار کر لیا ہے لیکن اس میں دھڑکتا ہوا دل رکھنا بھول گئے ہیں۔ دو آنکھیں تیار کر لی ہیں لیکن

ان میں فکر کی آب و تاب پیدا کرنا آپ نے فراموش کردیا ہے اور اس کے بغیر آنکھیں مردہ محسوس ہوتی ہیں، ان میں اور انگور کے دو دانوں میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ ،،

تشبیہات و استعارات سے پر اس تقریر کے بعد مقرر موصوف بڑی آن بان کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اترا اور بغل میں کاغذات کا ایک پلندہ دبائے جس میں بڑی بڑی کتابوں کے اقتباس درج تھے اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار ادھر ادھر نظر ڈالی اور یوں لگا جیسے اس کی نظریں کہہ رہی ہوں کہ میرے الفاظ حرف آخر تھے، اب اس میں اسی طرح کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا جس طرح عدالت کے صادر کردہ فیصلے میں۔

ٹھیک اسی لمحے کانفرنس کے ایک اور رکن نے اسٹیج کا راستہ لیا۔ یہ زندگی سے بھرپور اور ہنس مکھ دکھائی دیتا تھا اور دوسروں کے مقابلے میں زیادہ جواں سال بھی۔ اس کی تقریر دوسروں سے اس لحاظ سے مختلف تھی کہ اس نے نظم سے اسکا آغاز کیا:

''اگر بیٹھا ہو کوئی — کون کہہ سکتا ہے اسکے پیر کج رو ہیں
اگر سوتا ہو کوئی — کون کہہ سکتا ہے بینائی سے عاری ہے
اگر کھاتا ہو کوئی — کون کہہ سکتا ہے بزدل یا بہادر ہے
اگر چپ ہو — خبر کس کو کہ اسکا دل بھی خالی ہے۔ ،،

پھر اس نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: ''اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کسی خیال کا موجود ہونا بڑی اچھی بات ہے اور خاص طور سے ایسے خیال کی موجودگی جسکی جانب ابھی ابھی میرے لائق دوست نے اشارہ کیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہن میں صرف خیالات کی فراوانی نہیں بلکہ نظریے کی فراوانی بھی ہوتی ہے اور یہ فراوانی خیال کےلئے نقصان‌دہ بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ ،،

کتاب کا نام پاپاخ کی طرح ہے۔ سوال یہ ہے کہ اہمیت پاپاخ کی ہے یا سر کی؟ میں اس سلسلے میں آپکو تین شکاریوں کی کہانی سنانا چاہتا ہوں کہ کس طرح وہ ایک بھیڑیا پکڑنے گئے۔

شکاری کے پاس سر تھا بھی یا نہیں؟ تین شکاریوں کو پتہ چلا کہ گاؤں کے قریب گھاٹی میں ایک بھیڑیا آ گیا ہے۔ تینوں نے طے کیا کہ اسے پکڑ کر مار ڈالنا چاہئے۔ اس کےلئے انہوں نے جو طریقے اپنائے انکے بارے میں لوگوں میں بہت ساری کہانیاں مشہور ہیں۔ میں آپ کو وہ کہانی سناتا ہوں جو میں نے بچپن میں سنی تھی۔

شکاریوں سے بچنے کی کوشش میں بھیڑیا ایک غار میں جا چھپا۔ غار کے اندر جانے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ بھی بہت تنگ، بس اتنا کہ ایک آدمی کا صرف سر اندر جا سکے۔ شکاری ایک چٹان کی اوٹ میں چھپ گئے اور اپنی رائفلوں سے غار کے تنگ دھانے کا نشانہ لے کر انتظار کرنے لگے کہ بھیڑیا غار سے باھر آئے۔ لیکن بھیڑیا بھی بیوقوف نہ تھا وہ بڑے اطمینان سے اپنی پناہ‌گاہ میں آرام کرتا رھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ھار اسی کی ھونی تھی جو صبر کھو بیٹھتا۔

آخر ایک شکاری اس انتظار سے اکتا گیا۔ اس نے غار میں گھسنے اور بھیڑیئے کو باھر نکلنے پر مجبور کرنے کی ٹھانی۔ شکاری دھانے پر پہنچا اور پھر اس نے غار کے دھانے میں سر ڈال دیا۔ اس کے ساتھی خاصی دیر تک انتظار کرتے رہے اور یہ سمجھ نہ سکے کہ آخر شکاری نے کیوں نہ اندر جانے کی کوشش کی اور نہ سر باھر نکالنے کی۔ انتظار کی بھی حد ھوتی ہے، آخر انہوں نے اپنے ساتھی کو باھر نکالنے کی کوشش کی۔ اسے کھینچ کر باھر نکالا گیا تو پتہ چلا کہ سر غائب ہے۔

اب باقی دونوں شکاریوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ جب اس نے غار کے اندر گھسنے کی کوشش کی تھی تو اسکے سر تھا بھی یا نہیں؟ ایک شکاری کا کہنا تھا کہ مجھے تو لگتا تھا کہ اس کے پاس سر ہے، دوسرے کو اس پر اصرار تھا کہ اسکے پاس سر ھو ھی نہیں سکتا تھا۔

آخر وہ لوگ بے‌سر کی لاش گاؤں لائے اور لوگوں کو اس المناک واقعے کی تفصیل بتائی۔ ایک معمر بزرگ نے کہا کہ بھیڑیئے کی ماند میں گھسنے کا اس نے جو فیصلہ کیا اسے دیکھتے ھوئے میں سمجھتا ھوں کہ ایک عرصہ پہلے ھی وہ سر سے محروم

ھو چکا تھا یا غالباً بچپن سے ھی اس کے پاس سر نہ تھا۔ لوگوں نے سوچا کہ اس سوال کا مستند جواب اسکی بیوہ ھی سے مل سکتا ھے۔ اس نے جواب دیا:

"میں کیسے بتا سکتی ھوں کہ اس کے پاس سر تھا یا نہیں؟ میں تو صرف اتنا جانتی ھوں کہ وہ ھر سال اپنے لئے ایک نئی پاپاخ خریدا کرتا تھا۔"

خیال کو صرف قول تک محدود نہیں رھنا چاھئے اسے عملی روپ بھی لینا چاھئے۔ اسے پوری کتاب میں جاری و ساری ھونا چاھئے، یہ نہیں کہ صرف سرورق پر اسکا ڈھنڈورا پیٹ دیا جائے۔ جس بات کو آخر میں کہنا چاھئے اسکا ذکر ابتدا میں ھی کر دینا بےمحل ھے۔

بچہ جب پیدا ھوتا ھے تو اکثر اس کے گلے میں ایک تعویذ ڈال دیا جاتا ھے تاکہ وہ بلاؤں، بیماریوں، مصیبتوں اور اذیتوں سے محفوظ رھے اور ایک خوشگوار زندگی گذار سکے۔ اس بحث میں کیوں پڑا جائے کہ تعویذ سے کوئی اثر ھوتا بھی ھے یا نہیں، بہر حال یہ تو سبھی جانتے ھیں کہ تعویذ اس طرح پہنایا جاتا ھے کہ باھر سے نظر نہ آسکے، کپڑوں کے نیچے سب کی نگاھوں سے چھپا کر اسے رکھا جاتا ھے...

ھر کتاب میں بھی اس طرح کا تعویذ ھونا چاھئے، جو نگاھوں سے اوجھل ھو تاکہ پڑھنے والا اسے سوچنے اور دریافت کرنے کی کوشش کر سکے۔

یا یوں سمجھئے کہ اربیج بناتے وقت اس میں ذرا سا شہد بھی ملا دیا جاتا ھے۔ یہ شہد اس خوشبودار اور میٹھے شربت میں اس طرح گھل مل جاتا ھے کہ نہ آپ اسے دیکھ سکتے ھیں اور نہ چھو سکتے ھیں۔

یا یوں سمجھئے کہ بمبئی میں ایک باغ ھے جو ھمیشہ ھرا بھرا نظر آتا ھے۔ جس پر اس وقت بھی کوئی اثر نہیں پڑتا جب گرمی شباب پر ھوتی ھے اور لو کے تھپیڑے چلتے رھتے ھیں۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے زمین کی تہہ میں ایک تالاب سا ہے جو اوپر سے نظر نہیں آتا لیکن درختوں کو ٹھنڈا اور جاں‌بخش پانی فراہم کرتا رہتا ہے۔

خیال پانی کا وہ دھارا نہیں جو چٹانوں سے ٹکراتا، الجھتا ہر طرف پانی کی بوچھار کرتا بہتا رہتا ہے بلکہ اس قسم کا دھارا ہے جو نگاہوں کو دکھائی تو نہیں دیتا لیکن جھلستی زمین کو رطوبت اور نمی فراہم کرتا ہے اور پودوں اور درختوں کی جڑوں کو سوکھنے نہیں دیتا۔

''آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں،، اس وزیر نے میز تھپتھپاتے ہوئے کہا جسکے سامنے کتابوں اور مختلف طرح کے حوالہ‌جات کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ''کیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کی پاپاخ پر سفید پگڑی بندھی ہوئی ہے یا سرخ فیتہ یا پھر پنج گوشی ستارہ اسکی زینت ہے؟ کیا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سرخ تمغہ آپ کے سینے پر لگا ہوا ہے یا سیاہ صلیب لٹک رہی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اہم‌ترین چیز انسان کی نیک دلی ہے؟ نہیں، نہیں اور قطعی نہیں۔ خیال تو ایک پرچم کی طرح ہے، اسے چھپا کر نہیں رکھنا چاہئے، پرچم کو لہراتے ہوئے لے کر چلنا چاہئے اس طرح کہ لوگ اسے دیکھ سکیں اور اس کے پیچھے چل سکیں۔،،

''ان الفاظ سے اگر کوئی اتفاق نہ کرے تو خدا کرے اسکی بیوی بے‌وفا ثابت ہو،، جواں‌سال وزیر نے کہا۔ ''لیکن آپ یہ چاہتے ہیں کہ پرچم ان لوگوں سے الگ ہو جو اسے دیکھ رہے ہیں۔ آپکی خواہش یہ ہے کہ خیال کا وجود انسان کی روح اور ذہن سے دور ہو۔ آپ ان دونوں کو دو مختلف بیل گاڑیوں میں رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن فرض کیجئے کہ یہ دونوں بیل گاڑیاں الگ الگ راستوں پر چل پڑیں تو کیا ہوگا؟ آپ فرماتے ہیں کہ سوویت شہری کو محض سوویت شہری ہونا چاہئے آوار یا داغستانی نہیں۔ لیکن میں اپنی ہی بات بتاؤں کہ میں اپنے آپ کو بیک‌وقت ایک آوار، داغستان کا باشندہ اور سوویت شہری بھی سمجھتا ہوں اور یہ ساری باتیں یقیناً ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتیں۔

''یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ دنیا کا آغاز کریملن سے ہوتا ہے اور خود میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن میرے نزدیک دنیا صرف کریملن ہی سے شروع نہیں ہوتی بلکہ میرے اپنے گھر سے بھی شروع ہوتی ہے، میرے مکان کی ڈیوڑھی سے بھی شروع ہوتی ہے اور اس گاؤں سے بھی شروع ہوتی ہے جس کا میں باشندہ ہوں۔ کریملن اور میرا گاؤں، کمیونزم کے افکار اور حب‌الوطنی کا احساس اس طرح ہیں جیسے ایک پرندے کے دو پر یا کسی پاندور کے دو تار۔

''ایک پیر پر لڑکھڑانے سے کیا فائدہ؟ اور اسی لئے کتاب کا ایک اور نام تلاش کرنا ہوگا جو اس کے باطنی مفہوم کو واضح کر سکے۔''

میں اسے ہر جگہ تلاش کرتا پھرا ہوں۔ ہندوستان میں سیاحت کے دوران بھی داغستان کا خیال میرے ساتھ رہا۔ وہاں کی قدیم تہذیب اور فلسفے میں مجھے ایک طرح کی پراسرار آواز کی گونج سنائی دی۔ لیکن میرے لئے میرے داغستان کی آواز واضح اور حقیقی آواز ہے جو دنیا کے کونے کونے میں سنائی دیتی ہے۔ وہ بھی دن تھے جب داغستان کا لفظ صرف اجاڑ گھاٹیوں اور ننگی چٹانوں ہی سے ٹکرا کر رہ جاتا تھا۔ آج سارے ملک میں، ساری دنیا میں اور کروڑوں دلوں میں اسکی گونج سنائی دیتی ہے۔

داغستان نیپال کے بودھ مندروں میں بھی میرے ساتھ رہا جہاں ۲۲ ایسے چشمے بہتے ہیں جنکا پانی بیماروں کےلئے شفابخش ہے۔ لیکن نیپال ابھی تک ایک ناتراشیدہ ہیرا ہے جبکہ داغستان کا ہیرا کئی بار تراشا جا چکا ہے، اس لئے میں نیپال سے اپنے داغستان کا موازنہ نہیں کرسکتا۔

افریقہ میں بھی داغستان کا خیال میرے ساتھ رہا۔ مجھے افریقہ ایک ایسا خنجر محسوس ہوا جسکا صرف ایک چوتھائی حصہ ہی نیام سے باہر نکل سکا ہے۔ داغستان کا تصور کناڈا، برطانیہ، اسپین، مصر اور جاپان میں بھی میرا ہم رکاب رہا ہے اور ہر جگہ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ کون‌سی چیزیں ان

ملکوں کو داغستان کا مماثل بناتی ہیں اور کونسی چیزیں مختلف ۔

یوگوسلاویہ کے سفر کے دوران ایک بار مجھے وہاں کے خوبصورت شہر دوبروفنیک جانے کا موقع ملا، جو بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحل پر واقع ہے ۔ اس شہر کے مکانوں اور سڑکوں کو دیکھ کر کھائیوں اور اونچی اونچی چٹانوں کا خیال آتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے سنگ خارا کی چٹانیں ہوں جن میں بہت سارے زینے اور چبوترے تراش دئے گئے ہوں ۔ گھروں کے دروازے کبھی کبھی ایسے لگتے تھے جیسے چٹانوں کو کاٹ کے غاروں میں جانے کےلئے در بنا دئے گئے ہوں، لیکن ازمنۂ وسطی اور اس سے بھی قبل کی ان یادگاروں کے شانہ بہ شانہ جدید وضع کی بلند و بالا عمارتیں بھی سر اٹھائے کھڑی تھیں ۔

شہر کے اردگرد اسی طرح کی فصیل تھی جیسے ہمارے دربینت کے گرد ہے ۔ میں ڈھلوان سڑکوں اور چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئی سیڑھیوں سے گذرتا اس فصیل پر پہنچا ۔ ساری فصیل پر برابر فاصلے سے پتھر کے مینار بنائے گئے ہیں اور ہر مینار میں دو روشندان ہیں جیسے سوچ میں ڈوبی ہوئی دو آنکھیں ۔ مجھے ان میناروں کو دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی امام کے مرید اپنے پیر کے حکم کے مطابق اپنی اپنی جگہ پر خلوص کے ساتھ اٹل کھڑے ہوں ۔

جب میں فصیل تک پہنچ گیا تو میرا جی چاہا کہ کسی مینار کے روشندان سے باہر جھانکنے کی کوشش کروں ۔ لیکن سیاحوں کی اتنی بھیڑ تھی کہ مجھے روشندان تک پہنچنے کےلئے انتظار کرنا پڑا ۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں میرے آگے اور لوگ بھی تھے اور مجھے صرف دو چھوٹے چھوٹے نیلگوں دھبے سے نظر آئے ۔ یہ دھبے اتنے ہی بڑے تھے جتنے خود روشندان اور روشندان ہتھیلی سے زیادہ بڑے نہ رہے ہونگے ۔

لیکن جب میں ایک روشندان تک پہنچ پایا اور اس سے آنکھ لگا کر باہر دیکھا تو حیران رہ گیا ۔ جنوری کی خوشگوار دھوپ میں ایک وسیع سمندر سامنے تھا ۔ جس میں نرمی تھی کیونکہ بہرحال یہ بحیرۂ ایڈریاٹک تھا اور تندی بھی کیونکہ

مہینہ تو جنوری کا تھا۔ سمندر نیلا نہیں تھا، طرح طرح کے رنگ اس میں جھلک رہے تھے۔ اس کی لہریں لگاتار ساحلی چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں اور توپوں کی طرح گرجتی ہوئی پسپا ہو رہی تھیں۔ سمندر کے سینے پر جہاز آجا رہے تھے جن میں سے ہر ایک ہمارے گاؤں کے برابر رہا ہوگا۔

اس وقت بھی جب میں سیاحوں کی قطار میں شامل پنجوں کے بل کھڑا ہوکر وسیع و عریض دنیا کی جھلک دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر جب میں روشندان تک پہنچ گیا اور باہر نظر دوڑائی تو اس وقت بھی مجھے داغستان یاد آیا۔

وہ بھی میری طرح لوگوں کے پیچھے کھڑا اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے پنجوں کے بل کچھ اونچا ہوکر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا ہے مگر کچھ خوش نصیبوں کی چوڑی چکلی پیٹھیں حائل تھیں جو اسکے آگے کھڑے تھے۔ پھر قلعہ کے ایک روشندان سے اس نے دنیا دیکھ لی اور اب وہ پوری وسیع و عریض دنیا کا حصہ بن گیا ہے اور اس نے اپنے رسم و رواج، اپنے گیت، اپنا وقار ساری دنیا کے لئے عام کر دیا ہے۔

مختلف شاعروں نے اپنے اپنے دور میں خاصی سرمغزی کے بعد داغستان سے متعلق اپنے تصور کو ٹھوس شکل دینے کی کوشش کی ہے۔

حزنیہ شاعر محمود نے داغستان کی قومیتوں کو ان پہاڑی چشموں سے تشبیہہ دی ہے جو مل کر ایک ندی بن جانا چاہتے ہیں لیکن بن نہیں پاتے اور الگ الگ بہے جارہے ہیں۔ ایک اور موقع پر اس نے کہا ہے کہ داغستان کی قومیتوں کو دیکھ کر اسے کسی تنگ گھاٹی میں کھلنے والے ان پھولوں کا خیال آتا ہے جو ایک دوسرے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بغل گیر نہیں ہو پاتے۔ مگر اب یہ بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ داغستان کی قومیتوں نے مل کر ایک پرجوش ندی کا روپ لے لیا ہے، الگ الگ بکھرے ہوئے پھول ایک گلدستے میں سمٹ گئے ہیں۔

بتیرائی نے کہا تھا: "جیسے کوئی غریب آدمی اپنا پھٹا پرانا کوٹ گھر کے تاریک کونے میں پھینک دیتا ہے، اسی طرح

داغستان کو لپیٹ لپاٹ کے پہاڑوں کے کھڈوں میں ڈال دیا گیا ہے۔"

داغستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد ابا نے کہا تھا کہ یہ سینگ کے اس جام کی طرح ہے جو مےنوشی کی محفل میں ھاتھوں ھاتھ گردش کرتا رھتا ہے۔

میرے داغستان! میں تجھے کس چیز سے تشبیہ دوں؟ میں کونسی تمثیل ڈھونڈوں جو تیری تاریخ اور تیرے مستقبل کے بارے میں میرے خیالات اور تصورات کی ترجمانی کر سکے۔ ممکن ہے آگے چل کر مجھے اور زیادہ بہتر نیز زیادہ شایان شان الفاظ مل سکیں، مگر آج تو میں صرف اتنا ھی کہہ سکتا ھوں کہ "تو وہ چھوٹا سا روشندان ہے جس میں سے دنیا کے وسیع و عریض سمندر کی ایک جھلک نظر آتی ہے"، یا اسے اور مختصر کرکے یہ کہہ دوں کہ "بحر بیکراں کی جھلک دکھانےوالا ایک چھوٹا سا روشندان" ہے۔

لو! میرے وزیرو! یہ رھا اس کتاب کا دوسرا نام جو میں لکھنے جا رھا ھوں۔ مجھے احساس ہے کہ پڑوس کے دوسرے ممالک بھی اپنے بارے میں یہی تمثیل استعمال کر سکتے ھیں۔ تو کیا ھوا، اس کے کچھ اور ھمنام ھو جائینگے۔

میں آپ کی خدمت میں اپنی پاپاخ پیش کرتا ھوں، جو "میرا داغستان" ہے اور اس پاپاخ کی زینت ایک ستارہ ہے، یعنی "بحر بیکراں کی جھلک دکھانےوالا ایک چھوٹا سا روشندان"۔

گانا شروع کرنےوالے مطرب کی طرح میں نے اپنے پاندور کے دونوں تاروں کو ملا لیا ہے۔ اس آدمی کی طرح جو سلائی کی تیاری کر رھا ھو میں نے اپنی سوئی میں دھاگا ڈال دیا ہے...

میرے وزیروں نے کتاب کے نام کی توثیق کر دی ہے اسی طرح جیسے کسی بین‌الاقوامی کانفرنس میں شامل وزرا آخرکار ایجنڈے پر متفق ھو جاتے ھیں۔

ایسا بھی ھوسکتا ہے کہ دو بھائی ایک دوسرے سے لڑے بغیر ایک ھی گھوڑے پر سوار ھوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ

ایک ہی شہسوار دو گھوڑوں کی لگامیں سنبھال کر انہیں پانی پلانے لے جائے۔

ایک بار ابوطالب نے کہا تھا: اس نے لیو تالستائی جیسی ہیٹ تو خرید لی ہے، مگر ان کا جیسا سر کہاں سے لائے؟

یہ کہاوت ہے کہ بچے کا نام تو بہت اچھا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ بڑا ہو کر انسان کیسا نکلتا ہے۔



کتاب کی ہیئت اور انداز تحریر

نیام میں ہمہ وقت قید رہنے والے خنجر میں
آب باقی نہیں رہتی۔
بستر پر ہمہ وقت سونے والا سوار اپنی چستی
اور پھرتیلاپن کھو بیٹھتا ہے۔
(ایک خنجر پر نقش تحریر)

میں نے سوئی میں دھاگا ڈال لیا ہے لیکن
کس طرح کا کوٹ میں تیار کرونگا؟
میں نے پاندور کے تار کس لئے ہیں لیکن
کس طرح کا گیت میں گاؤنگا؟

میرے بےقرار اور وفادار گھوڑے کی نعلیں اچھی طرح جڑی ہوئی ہیں، مزید اطمینان کے لئے میں نے گھوڑے کی ایک ایک ٹاپ دیکھ لی ہے، ایک ایک نعل کا جائزہ لے لیا ہے۔ میں نے اس پر زین رکھی ہے اور زیربند کس دیا ہے، اس طرح کس دیا ہے کہ تسمے کے اندر انگلی کا جانا بھی مشکل ہے۔ جی ہاں! میرے

گھوڑے پر اچھی طرح اور پوری احتیاط کے ساتھ زین کسی جاچکی ہے۔

ابا سے ملتے جلتے ایک بزرگ نے میرے ہاتھوں میں باگ تھما دی ہے۔ ایک چھوٹی سی لڑکی نے جسکی آنکھوں میں شرارت مچل رہی ہے مجھے چابک پکڑا دیا ہے۔ پڑوس کے مکان سے ایک پہاڑی دوشیزہ پانی سے بھرا گھڑا اٹھائے باہر آئی ہے، سفر پر جانےوالے کو خیرباد کہنے کا یہ روائتی انداز ہے۔ گاؤں سے گھوڑا باہر نکالتے ہوئے راستے میں مجھے جو بھی ملتا ہے وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور مجھے خداحافظ کہتا ہے۔

گاؤں کے آخری کونے پر ایک اور دوشیزہ ایک جلتا ہوا چراغ لا کر کھڑکی پر رکھ دیتی ہے، جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو :

''یاد رکھنا اس کھڑکی کو اور اس چراغ کو۔ یہ اس وقت تک جلتا رہےگا جب تک تم واپس نہ آؤگے۔ تم دیس بدیس پھرتے رہوگے، طوفان‌خیز موسموں کی طویل راتیں آتی جاتی رہینگی، لیکن یہ چراغ اتھاہ تاریکی میں روشنی بکھیرتا برسوں تمہارا انتظار کرتا رہےگا۔ اور جب تم سفر سے تھکے ماندے گھر لوٹوگے اور گاؤں کے قریب پہنچوگے تو سب سے پہلے یہی جلتا ہوا چراغ تمہارا خیرمقدم کرےگا۔ یاد رکھنا اس کھڑکی کو اور اس چراغ کو۔،،

میں اپنے گاؤں پر آخری نظر ڈالنے کے لئے مڑتا ہوں۔ مجھے اپنے گھر کی چھت پر ماں کھڑی دکھائی دیتی ہے۔ وہ سیدھی کھڑی ہے اور تنہا تنہاسی لگ رہی ہے۔ اسکا ہیولا دم‌بہ‌دم سکڑتا جارہا ہے اور پھر اسکی صورت چھپ جاتی ہے بس یوں لگتا ہے جیسے چھت کے افقی پس‌منظر میں ایک عمودی خط کھنچا ہوا ہو۔ پھر سڑک پر ایک اور موڑ آتا ہے اور ایک پہاڑ اس منظر کو میری نگاہوں سے دور کردیتا ہے۔ اب میں پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو پہاڑوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

میرے آگے بھی ایک پہاڑ ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ اس کے پیچھے ایک وسیع و عریض دنیا موجود ہے، دوسرے دیہات ہیں، سمندر ہیں، چھوٹے اور بڑے شہر ہیں، ریلوے اسٹیشن ہیں، ہوائی اڈے اور کتابیں ہیں۔

میرے داغستان کی پتھریلی سڑکوں پر میرا گھوڑا دوڑ رہا ہے اور پہاڑوں میں اسکی ٹاپوں کی آواز گونج رہی ہے۔ سر پر پہاڑوں سے گھرا آسمان ہے جو کبھی سورج کی روشنی سے چمک اٹھتا ہے، کبھی ستاروں کی چادر تان لیتا ہے، کبھی بادلوں میں ڈوب جاتا ہے اور کبھی پانی انڈیلنے لگتا ہے۔

ٹھہرجا ایک ذرا میرے بیقرار سمند
بس ایک بار مجھے مڑکے دیکھ لینے دے
بلا کا درد جدائی اٹھا ہے پہلو میں
جھلک میں گاؤں کی دیکھوں تو کچھ سکون ملے

قدم بڑھائے چلا چل یونہی صبا کی طرح
نہ ایک پل کو ٹھہرنا کہیں مرے رھوار
یہ ابتدائے سفر ہے، یہ انتہا تو نہیں
ابھی ملےگی سرراہ دوستوں کی قطار

میں کہاں جارہا ہوں؟ میں اپنے لئے صحیح راستے کا انتخاب کس طرح کروں؟ مجھے جو نئی کتاب لکھنی ہے، اسکے لئے کونسا انداز تحریر منتخب کروں؟

اپنی نوٹ‌بک سے۔ اب داغستان کے نوجوان اپنا قومی لباس نہیں پہنتے۔ وہ بھی ماسکو، تبلیسی، تاشقند، دوشنبے یا منسک کے نوجوانوں کی طرح کوٹ، پتلون، عام قسم کی قمیصیں اور لباس استعمال کرتے ہیں۔

ان دنوں ہمارا قومی لباس اگر کوئی پہنتا ہے تو وہ ہیں داغستانی ناچ گانے کی منڈلیوں کے فنکار یا پھر شادی بیاہ کے موقع پر کسی محفل میں قومی لباس پہنے کوئی آدمی دکھائی دے جاتا ہے۔ کبھی کبھی کسی کا جی چاہتا ہے کہ قومی لباس پہنا جائے تو یا تو اسے کسی دوست سے مانگنا پڑتا ہے یا پھر کہیں سے کرائے پر لینا پڑتا ہے، کیونکہ اس کے پاس اس قسم کا لباس باقی نہیں رہا ہے۔ غرضیکہ ہمارا قومی لباس غائب ہورہا ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تقریباً غائب ہوچکا ہے۔

خیر یہ تو کوئی بات نہیں، قلق اس کا ہے کہ بعض شعرا' بھی قومی اسلوب کو طلاق دے چکے ھیں اور اس پر فخر بھی کرتے ھیں۔

جہاں تک یورپی طرز کے لباس پہننے کا سوال ہے میں بھی ابا کے پہاڑی کوٹ کی جگہ اسی کو استعمال کرتا ھوں۔ لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے اشعار بھی ایسی پھیکی پوشاک پہنیں جو ھماری روایات سے مختلف ھو۔ میں اپنی شاعری کو داغستان کے قومی لباس میں ھی ملبوس رکھنا چاھتا ھوں۔

میری زندگی کی مدت کچھ بہت زیادہ نہیں۔ مجھے صرف چند دھائیاں ھی دنیا میں گذارنی ھیں اور ان دھائیوں کے دوران لوگ کوٹ، پتلون اور جوتے ھی استعمال کرتے رہے ھیں۔ لیکن شاعری کی مدتحیات مختلف ھوتی ہے، اسکی پیدائش اور موت کی اپنی تاریخیں ھوتی ھیں۔ یہ بات میں اپنی شاعری کے بارے میں نہیں کہہ رھا ھوں کیونکہ ھو سکتا ہے کہ میری شاعری میری آنکھوں کے سامنے ھی دم توڑ دے۔

ایک بار میں نے ماسکو میں شاہبلوط کا ایک پرانا درخت دیکھا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ زار ایوان خوفناک نے لگایا تھا۔ اس نے نشوونما کے مختلف مرحلوں پر لوگوں کو مختلف لباس پہنتے دیکھا ہے۔ پہلے لوگ 'بویار' کپڑے پہنتے تھے، پھر کامی‌سول اور سفید وگوں کا استعمال ھوا، پھر اونچی ٹوپیوں اور لمبے کوٹوں کا زمانہ آیا، پھر 'بدیونی'، فوجی ٹوپیوں اور چمڑے کی جیکٹوں کا چلن ھوا، کچھ دنوں بعد معمولی کوٹ اور بڑی مہری کے پتلون مقبول ھوئے اور پھر تنگ مہری کے ... لیکن شاہبلوط کا وہ پیڑ ان سب تبدیلیوں سے بےنیاز جیسے یہی کہتا رھا ہے کہ لوگو، اگر تمہارے پاس کوئی بہتر کام نہیں ہے تو جاؤ کپڑوں کے فیشن تبدیل کرتے رھو، لیکن میرے سامنے زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مجھے سورج کی کرنیں جذب کرنی ھیں اور انہیں مضبوط اور شاندار شاخوں نیز شاہبلوط کے پھلوں کی شکل دینی ہے جن سے شاہ بلوط کے دوسرے طاقتور پیڑ جنم لینگے۔

پہاڑی علاقوں میں ایک کہاوت بہت عام ہے، وہ یہ کہ کپڑے انسان کو انسان بناتے ہیں اور گھوڑا سورما کو سورما۔ کہاوت بڑی خوبصورت لگتی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی صداقت ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر سورما شیر کی کھالوں‌والا لباس پہنے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زرہ‌بکتر کے نیچے جو دل دھڑک رہا ہے وہ کسی بزدل کا ہو۔

کیونکہ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ میں نے محض ظاہری حسن کی بنا پر کسی تربوز کا انتخاب کیا ہے لیکن اندر سے وہ سفید اور بدمزہ نکلا ہے اور میں جھنجھلا کر رہ گیا ہوں۔

اسی طرح اونتسوکولی نامی گاؤں کا ایک مرد اپنی محبوبہ کو اٹھالایا جو فر کے خوبصورت کوٹ میں لپٹی ہوئی تھی، لیکن جب اس نے کوٹ اتارا تو اس میں سے محبوبہ کے بجائے اسکی بوڑھی کھوسٹ دادی برآمد ہوئی۔

اسی طرح کی ایک کہانی مجھے ابوطالب نے بھی سنائی تھی۔ ہوا یہ کہ انہیں دور کے ایک گاؤں سے کسی شادی میں شرکت کا دعوت‌نامہ موصول‌ ہوا۔ وہ وہاں گئے اور زورنا بجاتے رہے۔ شادی بڑی شان و شوکت کے ساتھ ہوئی۔ گاؤں کے سامنے ایک کھلے ہوئے میدان میں شادی کا جشن منایا جاتا رہا۔ تین روز تک زورنا، طبلے، وائلن اور اکارڈین کی دھنیں گونجتی رہیں اور لوگ جوش و خروش کے ساتھ گاتے رہے۔ جیسا کہ ہم داغستان‌والے کہتے ہیں شادی بڑی دھوم دھام اور زور شور سے ہوئی۔ لوگوں نے جی بھر کر موسیقی سے لطف اٹھایا اور دعوتیں اڑائیں۔ سارا گاؤں شادی میں شریک تھا اور بوڑھے اور جوان سبھی نے رقص میں حصہ لیا۔

تیسرے دن شادی کے منتظمین نے بلند آواز سے یہ اعلان کیا کہ اب دولھا دولہن بھی ہمارے ساتھ رقص کرینگے۔ جہاں تک دولھا کا سوال تھا اسے تو سہ‌روزہ تقریب کے دوران سبھی لوگ بار بار دیکھ چکے تھے، البتہ دولہن اب تک گھونگھٹ نکالے بیٹھی

ہی رہی تھی، اس طرح کہ اسکا چہرہ کسی کو نظر نہیں آسکا تھا۔ سہ روزہ تقریب کے دوران ابوطالب نے کئی بار اسکی جانب دیکھا تھا جسکے لباس عروسی کی رنگارنگی کے آگے قفقاز کی شاعری کے شایع شدہ گلدستے کا دل کش اور خوبصورت سرورق بھی بے کیف محسوس ہوتا تھا۔

جب اس نے رقص شروع کیا تو ابوطالب اسکے قدوقامت کو دیکھ کر ششدر سے رہ گئے۔ وہ اتنی ہی بھاری بھرکم تھی جتنی کرغیز رزمیے ''مانس،، کی وہ جلد جوریاستی ادبی اشاعت گھر سے شایع کی گئی ہے۔ پھر وہ موقع آنے لگا جب دولہن اپنا گھونگھٹ اٹھانے والی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں توقعات کی ایک سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔ ابوطالب بھی کھڑے ہوگئے اور ایک لمحے کے لئے یوں لگا جیسے لوگوں کی سانس رک گئی ہو۔ آخر گھونگھٹ ہٹا اور وہ گھڑی آگئی جسکا سب کو پچھلے تین دنوں سے انتظار تھا...

دولہن کی آنکھوں کی ایک پتلی حنزہ کی طرف تھی تو دوسری بوتلیخ کی طرف۔ آنکھوں کے نیچے جو ایک دوسرے سے مختلف سمت دیکھتی تھیں، ایک بہت لمبی ناک تھی، اسے جیسے چہرے پر چپکا دیا گیا ہو...

ابوطالب کا دل اتنا کھٹا ہو گیا کہ انہیں زورنا بجانا یا کھانا کھانا بھی دوبھر محسوس ہونے لگا، وہ اٹھے اور شادی کی محفل چھوڑ کر اپنے گاؤں واپس آ گئے۔

میرے خیال میں ابوطالب نے کہانی بیان کرنے میں کچھ مبالغے سے کام لیا ہے۔

پھر بھی کتاب اگر اچھی نہیں تو اسکا خوبصورت ڈیزائن بھی اس کے کام نہیں آسکتا۔ یہاں بھی مناسب جائزے کے لئے نقاب الٹنا ضروری ہے۔

کیونکہ ایک زمانے میں پہاڑی علاقوں میں عورتوں کی حیثیت اور انکی جانب مردوں کا رویہ اہم ترین اور اصولی مسئلہ بن گیا تھا۔

اس زمانے میں کوئی شوہر ایک پل کے لئے یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ بیوی کی کسی بات کی تردید کرے۔ معمولی سی گھریلو کشمکش کی بنا پر بھی شوہر کو پارٹی کی ضلع کمیٹی کے سامنے طلب کر لیا جاتا اور اسکی سرزنش کی جاتی۔ معاملات کو ٹھیک رکھنے کے لئے ضلع کمیٹی کے پورے عملے سے جواب طلب کیا جاتا۔ اس زمانے میں پہاڑی عورتوں کی کانفرنسیں لگاتار ہوتی رہتیں اور ان میں اتنی لمبی لمبی تقریریں ہوتیں جتنی مجموعی طور پر تمام کانگریسوں میں بھی نہ ہوئی ہونگی۔

اسی زمانے میں ایک قدآور عورت نے اتوار کو لگنے والے بازاروں میں مسلسل آنا شروع کر دیا۔ وہ بازار میں آتی اور ممنوعہ اشیا کھلے بندوں فروخت کرتی۔ ملیشیا کے سپاہی کی ہمت نہ پڑتی کہ اس پر ہاتھ ڈالے۔ اسے ڈر لگا رہتا کہ کہیں پہاڑی عورتوں کی آزادی اور مساوات پر دست‌درازی کے جرم میں ماخوذ نہ ہو جائے۔ تیسرے اتوار کو بھی جب یہ سلسلہ جاری رہا تو اس نے ڈرتے ڈرتے اسے تنبیہہ کی اور ۵ ویں اتوار کو بڑی ہمت کرکے اس نے بیوپاری عورت کو اپنے ہمراہ تھانے چلنے کا حکم دیا۔

جب وہ اسے لے کر سڑکوں سے گذرا تو لوگ اسکی جرأت پر ششدر رہ گئے۔ اسکی جانب انگلیاں اٹھنے لگیں کہ اس نے اتنی ہمت دکھائی تھی کہ پہاڑی علاقوں کی ایک آزاد اور نجات‌یافتہ عورت کو گرفتار کیا تھا۔

بھرے پرے بازار میں وہ ٹھیک سے عورت کا جائزہ نہ لے سکا تھا لیکن اب اسے جو دیکھنے کا موقع ملا تو کچھ عجیب سی چیزیں نظر آئیں۔ مثلاً اسکرٹ کے نیچے عورت کے جوتوں پر نظر پڑی، جن میں نزاکت کے بجائے مردوں کے جوتوں جیسا بھاری پن تھا۔

''معاملہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے،، اس نے سوچا اور عورت کے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔ اس کے سامنے ایک بدمعاش مرد کا چہرہ تھا، خوفناک آنکھوں اور نوکدار مونچھوں کا حامل چہرہ، جو اس طرح لگ رہی تھیں جیسے کسی پہاڑی پر اگنےوالی جھاڑیوں کے کالے نوکدار کانٹے۔

بعض فنکار بھی جن کے پاس اپنی جگہ بنانے کی نہ صلاحیت ہوتی ہے، نہ استقلال اور وقار، اپنی تخئیل کی مفلسی کو شاندار الفاظ اور دلفریب ملمع سازی کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتے ھیں۔ لیکن جب پیٹ خالی ھو تو کج کلاھی سے کیا حاصل؟

اسی طرح آپ کے پاس لکڑی کا کتنا ھی خوبصورت خنجر کیوں نہ ھو آپ اس سے ایک چوزے کو بھی حلال نہیں کر سکتے۔ بہت ھوا تو یہ کر سکتے ھیں کہ لگاتار برسنےوالے پانی کی دھار کاٹ دیں۔

اسی طرح گڈے گڑیئے کا بیاہ کر دیا جائے تو بچوں کی پیدائش کا سلسلہ نہیں شروع ھوسکتا۔

اسی طرح ختنے کے وقت بچے کو ھنس کا پر دکھایا جاتا ہے، یہ محض اس لئے کیا جاتا ہے کہ اسکی توجہ دوسری طرف مبذول ھو جائے۔ لیکن ھنس کے پر سے ختنہ تو نہیں کیا جا سکتا، اسکے لئے تو تیز دھاروالے استرے کی ضرورت ھوتی ہے۔

بھرنوع قاری بچے تو نہیں ھوتے کہ ان کو بھکایا بھلایا جا سکے یا چکمہ دیا جاسکے، اسی طرح میں کوئی ایسا اداکار نہیں ھوں جو ایک منقش اور مرصع نیام میں دفتی کا خنجر لئے پھرتا ھو۔

یقیناً نیام بھی ضروری ہے کیونکہ اسکے بغیر دھار پر زنگ لگ جائےگی۔ اور نیام کا خوبصورت ھونا بھی خوش ذوقی کا ثبوت ہے۔

یقیناً جب کوئی قفقاز کا شہسوار لوٹ کا مال لےکر لوٹتا تھا تو اسکی بیوی اسکے گھوڑے کی گردن میں خوبصورت ریشمی رومال باندھ دیتی تھی۔

یقیناً انتہائی گھرے خیالات کےلئے کھردری اور بےکیف زبان ایسی ھی ہے جیسے بھیڑیئے کے سامنے میمنہ۔

اور یقیناً اگر سڑک خراب ہے تو مضبوط ترین یکے کے بھی انجرپنجر ڈھیلے ہو جائینگے اور یہی نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی گہرے کھڈ میں گر جائے۔

یقیناً کسی گدھے کی کاٹھی کسی گھوڑے کےلئے موزوں نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح کسی اچھی نسل کے گھوڑے کی زین کسی گدھے پر پھب نہیں سکتی۔

اس سلسلے میں میں آپ کو بلخار کے ایک باشندے اور اسکے مریل گھوڑے کی کہانی سنانا چاھتا ھوں۔

بلخار کے ایک باشندے اور اس کے مریل گھوڑے کی کہانی۔ ھوا یوں کہ بلخار میں رھنےوالے ایک آدمی نے اپنے مریل گھوڑے پر مٹی کے برتن، آبخورے اور گھڑے لادے اور پاس کے دیہاتوں میں انہیں بیچنے نکل کھڑا ھوا۔

اسی دن ایک آوار گاؤں میں شہسواری کا مقابلہ ھونے جارھا تھا جس میں حصہ لینے کےلئے بہت سارے پرجوش شہسوار اور ان ھی کی طرح پھرتیلے گھوڑے دور دور سے آئے تھے۔ اطراف و جوانب میں یہ شہسوار بھی مشہور تھے اور انکے گھوڑوں کی بھی دھوم تھی۔ شہسوار بھی کسرتی بدن کے خوبصورت جوان تھے اور انکی ھی طرح ان کے گھوڑے بھی پھرتی اور توانائی میں آپ اپنا جواب تھے۔ شہسواروں کی آنکھوں سے بھی جوش اور دلیری ٹپک رھی تھی اور گھوڑے بھی مقابلے کےلئے بیتاب نظر آرھے تھے۔

دوڑ شروع ھی ھونےوالی تھی کہ یہ سیدھا سادا بلخاری بھی اس میدان میں آ نکلا۔ اسکی آنکھوں میں نیند بھری ھوئی تھی اور اسکے مریل گھوڑے نے تو باقاعدہ اونگھنا شروع کر دیا تھا۔ شہسواروں نے اسکا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔

''آؤ! تم بھی ھمارے ساتھ دوڑ میں حصہ لو،، سب نے ایک ساتھ کہا۔

''اپنے گھوڑے کو مقابلے سے محروم نہ کرو!،،

''اسے دوڑ میں شریک ہونے اور اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے دو !،،

''اچھا یہی سہی۔ دوڑ میں شامل ہوجاؤ تاکہ ہمارے گھوڑوں کی جو نعل گر جائے اسے جمع کرتے رہو !،،

طنز و مزاح کے اس طوفان کے دوران وہ آدمی خاموشی کے ساتھ اپنے گھوڑے پر لدا ہوا سامان اتارتا اور اسے احتیاط کے ساتھ رکھتا رہا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ سامان ایک طرف رکھا، آہستگی کے ساتھ اپنے گھوڑے پر بیٹھا اور شہسواروں کی صف میں آ کھڑا ہوا۔

دوسرے گھوڑے پیر پٹخ رہے تھے، ہنہنا رہے تھے اور جوش و خروش کے ساتھ اچھل کود رہے تھے لیکن بلخاری کا مریل گھوڑا اپنی جگہ اسی طرح کھڑا اونگھ رہا تھا اور اس کا سر کچھ اور جھک گیا تھا۔

دوڑ شروع ہوئی، شہسواروں کے گھوڑے بجلی کی رفتار سے لپکتے ہوئے آگے بڑھے۔ پورا میدان گرد و غبار میں ڈوب گیا، بلخاری کا گھوڑا سب سے پیچھے اپنی معمولی رفتار کے ساتھ چل رہا تھا۔ دوڑ کا پہلا چکر پورا ہوا، پھر دوسرا اور پھر تیسرا، اب شہسواروں کے گھوڑے تھکے تھکے نظر آنے لگے، ان کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور تپتی ہوئی زمین پر گررہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے پاؤں سن ہوتے جارہے ہوں، اب ان میں وہ برق‌رفتاری بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ گھوڑسوار بڑی بے‌رحمی کے ساتھ چابک چلا رہے تھے اور ایڑ لگا رہے تھے مگر کوئی اثر نہیں ہورہا تھا۔ بس بلخاری کا گھوڑا تھا جو اپنی اسی چال سے لگاتار چلے جا رہا تھا، نہ بہت تیز نہ بہت آہستہ۔ پہلے یہ گھوڑا سب سے پچھلے گھوڑے کے برابر آیا، پھر اس نے درمیانی قطار کو جا لیا اور پھر گھوڑوں کی اگلی قطار کے ساتھ چلنے لگا اور دسویں چکر میں جو آخری چکر تھا وہ سب سے آگے تھا۔

فتح کا رومال اس کی گردن میں باندھ دیا گیا۔ اس کا مالک اسی سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ وہاں پہنچا جہاں اس نے برتن

اتارے تھے، دوبارہ اپنے مریل گھوڑے پر برتن لادے اور اپنی راہ لی۔

اس طرح کے واقعے گھڑدوڑ کے میدان کے مقابلے سے ادب کے میدان میں کہیں زیادہ پیش آتے رہتے ہیں۔

اپنی نوٹ‌بک سے۔ آسانی سے لکھے جانےوالے اشعار کبھی کبھی خاصی دقت سے پڑھے جاتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے اشعار اکثر آسانی سے پڑھ لئے جاتے ہیں جنھیں لکھنے میں خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ ہیئت اور مواد میں وہی رشتہ ہے جو لباس اور لباس پہننےوالے میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی آدمی نیک، ہوشیار اور اعلی کردار کا حامل ہے تو وہ ایسے لباس کیوں نہ پہنے جو اس کے شایان‌شان ہوں۔ اگر کوئی خوبصورت چہرے کا مالک ہے تو اسکے خیالات بھی چہرے کی طرح خوبصورت کیوں نہ ہوں؟

اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ دل ربا اور خوبصورت عورتیں ذہانت سے محروم ہوتی ہیں اور ذہین اور ہوشیار عورتیں خوبصورتی سے۔ کسی فن‌پارے پر بھی یہ بات صادق آسکتی ہے۔

لیکن بعض ایسی خوش‌نصیب عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کے پاس ظاہری حسن بھی ہوتا ہے اور ذہن کی تیزی اور نفاست بھی۔ یہی بات ان کتابوں پر بھی صادق آتی ہے جنکے لکھنےوالے حقیقی معنوں میں باصلاحیت ہوتے ہیں۔

ایک بار ساحلی کے ایک باشندے نے کہا: ''میرے گاؤں کی طرف آنےوالا کوئی آدمی اگر مجھے پہاڑی درے سے گذرتے ہوئے دکھائی دے جائے تو میں بتا سکتا ہوں کہ یہ آدمی اچھا ہے یا خراب۔''

کوباچی کے ایک باشندے کا کہنا ہے کہ ''سونے اور چاندی کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں، اہم بات یہ ہے کہ ان دھاتوں

سے مختلف چیزیں بنانے والے کے ہاتھ سونے کے ہوں۔ "

باؤار کی زینت ہوتے ہیں وہ رنگین و منقش برتن جو
اطراف میں بکھری مٹی سے کمہار بنایا کرتے ہیں
ہاں یونہی وہ اشعار جنہیں سن سن کے زمانہ جھوم اٹھے
ہر لب پہ مچلتے لفظوں سے فنکار تراشا کرتے ہیں
(صراحی پر نقش چند مصرعے)

میں اپنی اس دنیا میں پندرہ ہزار سے زائد دن گذار چکا ہوں۔ میں بہت سارے راستوں سے گذرا ہوں اور بہت ساری سڑکوں پر گھوما ہوں۔ ہزارہا انسانوں سے مل چکا ہوں اور میں نے جو گوناگوں تاثرات قبول کئے ہیں وہ اتنے ہی لاتعداد ہیں جتنے پہاڑوں پر بارش کے بعد یا برف پگھلنے کے بعد پھوٹ پڑنے والے سوتے۔ لیکن ان سب کو ایک دھارے میں سمو کر کتاب کی شکل کیسے دی جائے؟ ایسی کتاب کا لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی وادی میں گھرے اور چوڑے چکلے دریا کےلئے راہ بنانا۔ اور محض اتنا بھی کافی نہیں، اصل کام تو یہ ہے کہ پہاڑ سے پھوٹنے والے تمام سوتوں کا رخ اس دریا کی طرف موڑا جائے تاکہ سب مل کر ایک زبردست دھارے کی شکل میں آگے بڑھیں۔ میں یہ کام کس طرح انجام دوں؟ عرفان حیات کے علاوہ اس کام کےلئے اور کن کن علوم کی واقفیت ضروری ہے؟ غالباً نظریۂ ادب کی؟ لیکن شاعر کو اس بارے میں سوچنے سے کہ اشعار لکھے کیسے جائیں، کہیں زیادہ زور خود شعر کی تخلیق پر دینا چاہئے۔

دراصل میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نہ میرا کوئی خاص دبستان شاعری ہے اور نہ ہی پسندیدہ رجحانات۔ البتہ کچھ ایسے ادیب، فنکار اور استاد ضرور ہیں جنہیں میں پسند کرتا ہوں اور جنکی قدر کرتا ہوں۔

اپنی نوٹ بک سے۔ ادارۂادب میں امتحان کے دوران ایک آوار طالب علم سے سوال کیا گیا کہ حقیقت نگاری اور رومانیت میں کیا فرق ہے؟ غالباً اس طالب علم نے اس موضوع پر کوئی کتاب

نہیں پڑھی تھی۔ مگر جواب تو دینا ہی تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا اور پھر اس نے ممتحن پروفیسر کو جواب دیا :

''عقاب کو عقاب کہنا حقیقت نگاری ہے اور کسی مرغ کو عقاب کہنا رومانیت۔ ،،

پروفیسر صاحب ہنس دئے اور طالب علم کو پاس کردیا۔

جہاں تک میرا سوال ہے میں نے ہمیشہ گھوڑے کو گھوڑا، گدھے کو گدھا، مرغ کو مرغ اور انسان کو انسان ہی کہنے کی کوشش کی ہے۔

اپنی نوٹ بک سے۔ مشہور ادیب رابندرناتھ ٹیگور کے ایک بھائی بھی تھے جو ہندوستانی ادب کے بنگالی مدرسہ فکر کے پیرو تھے، جبکہ ٹیگور بذات خود ایک مدرسہ فکر، ایک رجحان اور ایک تحریک کی حیثیت رکھتے تھے، دونوں بھائیوں میں یہی فرق تھا۔

بات یہ ہے کہ رابندرناتھ ٹیگور کی روح میں ایک پرندے نے جنم لیا تھا جو خالص ان کا پرندہ تھا، دوسرے پرندوں سے قطعی مختلف، اس سے پہلے اس طرح کے کسی پرندے کا کوئی وجود نہ تھا اور اسی لئے جب انہوں نے اسے ادب کے میدان میں آزاد کیا تو دنیا پکار اٹھی کہ یہ ٹیگور اور صرف ٹیگور کا پرندہ ہے۔

اگر کوئی فنکار اپنی روح میں پرورش پانے والے پرندے کو آزاد کرے اور وہ اپنی طرح کے پرندوں کے جھنڈ کا ایک حصہ بن جائے تو اسے فنکار نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جو پرندہ خلق کیا ہے، وہ اسکا پرندہ نہیں، انوکھا اور ہوش ربا پرندہ، بلکہ ایک عام چڑیا ہے جسے چڑیوں کے کسی جھنڈ میں پہچانا نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے یہ چڑیاں بھی من موہنی ہوں لیکن ہیں تو معمولی چڑیاں جن میں کوئی خاص بات نہیں۔

انسان کو لازمی طور پر ایک گھر اور ایک چولہا چاہئے جس میں وہ آگ جلا کر اپنی بھوک مٹا سکے۔ کسی اور کے گھوڑے پر سواری کرنے والے کو دیر یا سویر گھوڑے سے اترنا

اور اسے اصلی مالک کے حوالے کرنا ھی پڑے گا۔ اسی لئے کسی اور کے خیالات کا سہارا نہیں لینا چاھئے بلکہ اپنے آپ میں خیالات و تصورات کو جنم دینے کی صلاحیت پیدا کرنی چاھئے۔

یہاں میں ذرا جرأت سے کام لینا چاھتا ھوں، میں کہنا چاھتا ھوں کہ ادب ایک ساز ھے اور ادیب وہ تار جو اس سے منسلک ھوتے ھیں۔ ھر تار اپنی ایک الگ آواز رکھتا ھے لیکن جب سب تار اکٹھے چھیڑ دئے جائیں تو ان سے موسیقی جنم لیتی ھے۔

آوار لوگ ایک ساز پاندور استعمال کرتے ھیں اس میں صرف دو تار ھوتے ھیں۔ ابا کے بارے میں البتہ کہا جاتا ھے کہ انھوں نے آوار ادب کے پاندور میں ایک تیسرے تار کا اضافہ کیا۔

میری بھی خواھش یہ ھے کہ میرے پاس میری ایک آواز ھو جو دوسروں سے مختلف ھو۔ میں اس قدیم آوار ساز میں ایک اور تار کے اضافے کا باعث بننا چاھتا ھوں۔

میں اس طرح کا شکاری نہیں بننا چاھتا جو بازار میں ھرن کا مردہ جسم خرید کر گھر لاتے ھیں اور لوگوں کو بتاتے ھیں کہ خود انھوں نے اس ھرن کو شکار کیا ھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ھوتا ھے کہ یہ افواہ سنتے ھی کہ کسی شکاری نے کسی گھاٹی میں ایک بڑے جنگلی بھینسے کا شکار کیا ھے، دوسرے شکاری اس گھاٹی کی طرف دوڑ پڑتے ھیں، اسی درمیان پہلا شکاری کسی اور جگہ کسی بھالو کو شکار کر چکا ھوتا ھے اور جس وقت دوسرے شکاری اس جگہ پہنچتے ھیں جہاں بھالو شکار کیا گیا تھا شاطر شکاری کسی اور گھاٹی میں کسی برفانی چیتے کو موت کے گھاٹ اتار چکا ھوتا ھے... سوال یہ پیدا ھوتا ھے کہ ان میں حقیقتاً شکاری کون ھے؟ وہ جو اپنا شکار خود تلاش کرتا ھے یا وہ جو اس کے نقش قدم پر بھاگتے رھتے ھیں؟ اس قسم کے لوگ کسی کے مارے ھوئے شکار کو چرا لینے میں بھی ھچکچاھٹ محسوس نہیں کرتے۔

ان کے بارے میں سوچتے ھوئے مجھے بعض ادیب یاد آجاتے ھیں۔ مثلاً کسی کو میرے ایک شناسا جیسا رویہ اختیار کرنا نہیں چاھئے جس نے کورنیئی چوکوفسکی سے ملاقات کے بعد کچھ

اس طرح کا انداز اختیار کیا جیسے وہ ابوطالب کو جانتا ہی نہ ہو۔
کسی ایسی ندی کو جو سمندر تک پہنچ چکی ہو اور لامحدود نیلی وسعتوں سے ھمکنار ہو چکی ہو، پہاڑوں کی گود میں واقع اس معمولی سوتے کو فراموش نہیں کرنا چاھئے جس نے اسے جنم دیا ھے اور نہ ھی اس طویل، تنگ، پتھریلے اور ناھموار راستے کو بھولنا چاھئے جسے یہاں تک پہنچنے کے سلسلے میں اس کو طے کرنا پڑا ھے۔

بیشک میں بھی پہاڑی ندی کی طرح ھوں۔ میں اس سرچشمے کو پیار کرتا ھوں جس نے مجھے جنم دیا ھے اور اس پتھریلے راستے کو بھی جس سے میں گذرا ھوں۔ مجھے دھند میں لپٹی وہ گھاٹیاں پیاری ھیں جن میں میں بہہ چکا ھوں، وہ چٹانیں پیاری ھیں جن سے میں آبشاروں کی صورت میں نیچے گرا ھوں اور وہ نچلے پرسکون میدان پیارے ھیں جہاں پہنچ کر میں نے وسعت اور گہرائی حاصل کی ھے اور شفاف آئینے کی طرح اردگرد کی پہاڑیوں، نیلے آسمان اور اس پر جگمگاتے ستاروں کے عکس کو اپنے سینے سے لگایا ھے۔ اور پھر وہ پانی آگے بہتا جاتا ھے کبھی آھستہ روی سے تو کبھی تندی و تیزی کے ساتھ۔

لیکن میں یہ نہیں کہونگا کہ وہ گھاٹیاں ھی میرے لئے کافی ھیں۔ میں نے اپنا بہاؤ جاری رکھا ھے تو اس کے معنی یہ ھیں کہ میرے سامنے ایک منزل ھے۔ مجھے اس اتھاہ سمندر کی جو میرا منتظر ھے صرف توقع ھی نہیں ھے بلکہ میری تصور کی آنکھیں اسے دیکھ بھی رھی ھیں۔

اور میں اس معاملے میں اکیلا نہیں۔ میں پورے داغستان کا جس کے سامنے لامحدود وسعتوں کے دروازے کھل گئے ھیں ایک اٹوٹ انگ ھوں۔ ان تمام برسوں کے دوران ھمارے قبرستانوں کی چہار دیواریاں ھی وسیع نہیں ھوئی ھیں بلکہ زندگی اور دنیا کے بارے میں ھمارے تصور کی حدوں کو بھی وسعت حاصل ھوئی ھے۔

میں ایک آوار شاعر ھوں۔ لیکن میرے دل کی گہرائیوں میں شہری ذمہ‌داری کا جو احساس ھے وہ نہ صرف آوارستان تک

محدود ہے، نہ پورے داغستان تک اور نہ ہی سارے ملک تک۔ میں خود کو پورے کرۂ ارض کے سامنے جوابدہ محسوس کرتا ہوں۔ یہ ۲۰ ویں صدی ہے اور اس میں اس احساس کے بغیر کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔

لوگوں نے مجھے بتایا کہ میری ولادت کے کچھ ہی دن بعد ابا کو اپنے کام کے سلسلے میں کچھ عرصے کےلئے ارادیریخ گاؤں کو منتقل ہونا پڑا۔ ابا کے گھوڑے کی زین سے دو جھولے لٹک رہے تھے۔ ایک میں ہمارے گھر کا سارا اثاثہ تھا، کپڑے، بچا کھچا آٹا، جئی کا دلیا اور چکنائی۔ اسی میں کچھ کتابیں بھی تھیں، دوسری طرف جو جھولا تھا، اس سے میرا سر باہر نکلا ہوا تھا۔

سفر ختم ہوا تو اماں بیمار پڑ گئیں، بیماری بڑی شدید تھی اتنی شدید کہ وہ مجھے دودھ پلانے کے قابل نہ رہیں۔ لیکن اس گاؤں میں رہنےوالی ایک غریب عورت جسکا شیرخوار بچہ موت کا شکار ہو گیا تھا مجھے دودھ پلانے پر تیار ہوگئی۔ اور یوں وہ میری رضاعی ماں بنی۔

میں دنیا میں انھی دو عورتوں کا ممنون احسان ہوں۔ میری زندگی کی مدت کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو اور میں ان دونوں کےلئے یا ان دونوں کی خاطر کچھ بھی کیوں نہ کر ڈالوں ان کے باراحسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ کوئی بیٹا جیتے جی اپنی ماں کے احسانات کا بدلہ چکا ہی نہیں سکتا۔

یہ دونوں ہی عورتیں میری ماں ہیں۔ ایک نے مجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا اور وہ پہلی عورت تھی جس نے میرا پالنا ڈولایا اور مجھے لوریاں سنا سنا کر سلانے کی کوشش کی، دوسری نے مجھے دودھ پلا کر میری زندگی بچائی، مجھے اس وادی سے باہر نکالا جس پر موت کی بھیانک پرچھائیاں منڈلا رہی تھیں۔

میری قوم، میرے چھوٹے سے آبائی وطن اور میری ایک ایک کتاب کی بھی دو مائیں ہیں۔

پہلی ماں کا نام داغستان ہے، جہاں میں پیدا ہوا، جہاں میں نے پہلی بار اپنی مادری زبان کے بول سنے، میں نے اس زبان کے الفاظ اور اس کے لب و لہجے کا عرفان حاصل کیا جو اب میرے وجود کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں میں نے پہلی بار اپنی قوم کے گیت سنے اور پہلی بار اپنے نغمے گائے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے پانی کا پہلا گھونٹ پیا اور پہلی بار روٹی کا مزہ چکھا۔ لڑکپن میں نکیلی چوٹیوں پر چڑھتے ہوئے میں بار بار زخمی ہوا ہوں اور ہر بار میرے وطن کا پانی اور میرے پہاڑوں پر اگنےوالی جڑی‌بوٹیاں میرے زخم مندمل کرتی رہیں۔ پہاڑی لوگوں کا کہنا ہے کہ دنیا میں کوئی مرض ایسا نہیں جسکا علاج پہاڑی جڑی‌بوٹیوں سے نہ کیا جاسکے۔

میری دوسری ماں کا نام عظیم روس ہے، ماسکو ہے۔ اس‌نے میری پرورش کی، مجھے بازو عطا کئے، مجھے زندگی کی بلند تر منزل تک پہنچایا اور میری نگاہوں کو ایک وسیع افق سے، ساری دنیا سے روشناس کرایا۔

میں ان دونوں ماؤں کا ممنون احسان ہوں۔ میرے گھر کی دیواروں پر مشجر پر بنی ہوئی دو شبیہیں لٹکی ہوئی ہیں، ایک محمود کی ہے اور دوسری پشکن کی۔ میرے گاؤں کے پاس جو پہاڑی مرغزار واقع ہے وہاں کھلنے والے بہت سارے سرخ پھول بلوک کی شاعری کے مجموعوں کے صفحات کے درمیان رکھے ہوئے ہیں، میں جب ان مجموعوں کے اوراق پلٹتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پتروگراد کی سفید راتوں کی خنکی میرے اردگرد ناچ رہی ہے۔

میری دو مائیں دو بازوؤں، دو ہاتھوں، دو آنکھوں اور دو گیتوں کی طرح ہیں۔ میری دونوں ماؤں نے کبھی اپنے ہاتھوں سے مجھے تھپکی دی ہے اور کبھی ضرورت پڑنے پر میری گوشمالی کی ہے۔ میرے پاندور ساز میں جسکے دو تار ہیں ان دونوں نے ایک ایک تار کسے ہیں۔ دونوں نے مجھے اوپر اٹھایا ہے، اپنے گاؤں سے بھی اوپر اور ان کے شانوں کی بلندیوں سے میں نے ایسی بہت ساری چیزیں دیکھی ہیں جنہیں اگر ان شانوں کا سہارا نہ ملتا تو میں ہرگز نہ دیکھ پاتا۔ جس طرح کوئی اڑتا ہوا عقاب یہ

نہیں بتا سکتا کہ اسکے دونوں پروں میں کونسا سب سے زیادہ ضروری اور بیش قیمت ہے، اسی طرح میں بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ ان دونوں ماؤں میں سے کونسی ماں مجھے زیادہ عزیز ہے۔

پرانے زمانے میں پہاڑی لوگ ہر مرض کا علاج صرف اپنے یہاں کی جڑی بوٹیوں اور اپنے چشموں کے پانی سے کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنے معالجوں پر اعتماد ہوتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں بعض ایسے معالج بھی تھے جنہیں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ معالج سر کے معمولی درد کا علاج ذبح کئے ہوئے سیاہ دنبے کی کھال سے کیا کرتے تھے۔

آوارستان میں ہر شخص جانتا ہے کہ سفید یا بھورے دنبے کے مقابلے میں سیاہ دنبے کا گوشت زیادہ مزیدار ہوتا ہے اور اس میں چربی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ علاج کرنے والے سیاہ دنبے کی کھال مریض کے سر کے گرد لپیٹ دیتے اور اسے یہ حکم دیتے کہ وہ اسی طرح بیٹھا رہے۔ لیکن چلتے وقت وہ ذبح کئے ہوئے دنبے کو ساتھ لے جانا نہ بھولتے۔

ہم یہاں اس طرح کے معالجوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو ایماندار تھے، فن طبابت سے بھی واقف تھے اور دواؤں سے بھی۔

ابا کو ایک بار ماسکو کے کریملن اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ وہاں انہیں داغستان کا پانی اور جڑی بوٹیاں یاد آئیں۔ انہوں نے بیٹوں کو حکم دیا کہ بت‌سراخ پہاڑ پر واقع ایک خاص چشمے کا تھوڑا سا پانی ان کےلئے لے آئیں۔

کون بیٹا باپ کے حکم سے سرتابی کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ داغستان آئے، بت‌سراخ پہاڑ پر چڑھے، اس چشمے کو تلاش کیا اور وہاں سے ماسکو کے اسپتال میں زیرعلاج اس بیمار آوار شاعر کےلئے پانی لے کر آئے۔

ابا نے پانی پیا اور انہیں اپنی حالت بہتر محسوس ہونے لگی اور یہی نہیں وہ اچھے بھی ہو گئے۔ لیکن انہیں یہ بات نہیں معلوم تھی کہ اسی دن ان کے لئے ایک نئے انجکشن کا سلسلہ بھی شروع ہوا تھا جو باہر سے منگایا گیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ نہ تو عالمی طبی سائنس کی ایجاد کردہ دوائیں ہی تنہا ان پر کارگر ثابت ہوسکتی تھیں اور نہ آوارستان کا پانی جو ہماری عوامی دوا ہے۔ لیکن ان دونوں طرح کی دواؤں نے مل کر انہیں صحت‌یاب کیا۔

ادب کا بھی یہی حال ہے۔ ادیب کا دیس، اسکی قوم اور اسکی زبان اسکے سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن آج کے کسی سچے ادیب کا شعور اسکی قومیت سے کہیں زیادہ وسعت کا حامل ہوتا ہے۔ جو چیزیں ساری انسانیت پر، ساری دنیا پر اثرانداز ہوتی ہیں، ان سے ادیب نہ اپنے دل کو دور رکھ سکتا ہے نہ ذہن کو۔

سفر پہ نکلے تو کیا کوئی ساتھ لے کے چلے؟
شراب، گھر میں پکی روٹیوں کے کچھ ٹکڑے
مگر ہمارے یہاں آنےوالے مہمان کو
نہیں ہے اسکی ضرورت کہ کوئی فکر کرے

ہم اس کو گھر پہ ہر چیز سے نوازینگے
نہ ساتھ لائے وہ روٹی، نہ ساتھ لائے شراب
ہماری بیویاں روٹی پکا کے لائیں گی
وہ مے پلائینگے ہم خود، نہیں ہے جسکا جواب

سفر پہ نکلے تو کیا کوئی ساتھ لے کے چلے؟
دفاع جاں کےلئے، تیز دھار کا خنجر
مگر ہمارے یہاں آنےوالے مہمان کو
نہ رہزنوں کا خطر ہے نہ فکر تیغ و تبر

پہاڑ اٹھینگے اک ساتھ پیشوائی کو
بھلا مجال کہ آنکھیں دکھا سکے رہزن
کوئی جو راہ میں ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے
تو میزبان کا خنجر، اتار لے گردن

سفر پہ نکلے تو کیا کوئی ساتھ لے کے چلے؟
حسین، رس بھرے گیتوں کا دل نشیں تحفہ

قدیم گیت جنہیں گنگنا کے راہ کٹے...
جو اس کے دیس کی دولت ہوں، قوم کا ورثہ
ہمارے پاس بھی ہیں گیت، میہمان عزیز!
ہمیں یقین ہے، تم نے انہیں سنا ہوگا
مگر یہ گیت کوئی بوجھ تو نہیں ہوتے
تم اپنے گیت بھی لاؤ، تو کیا مزہ ہوگا

اگر ہم ادیب کو ڈاکٹر مان کر چلیں تو اسے اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ صدیوں پرانی آزمودہ جڑی بوٹیوں کا بھی استعمال کر سکے اور علم طب کی جدیدترین ایجادات کا بھی۔

اگر ہم ادیب کو وہ سیاح فرض کر لیں جو پیادہ پا دیس بدیس کا سفر کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ جب وہ کسی اجنبی دیس میں پہنچے تو اپنے وطن کے گیتوں سے اسکا دل معمور ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں اتنی گنجائش ضرور ہو کہ وہ گیت بھی اس میں جگہ پا سکیں جو اس کےلئے گائے جائیں۔

ایک طرف اسکی قوم ہوتی ہے جو اسے رخصت کرتی ہے اور دوسری طرف کسی دوسری قوم کے افراد ہونگے جو اسکا خیرمقدم کرینگے اور ان دونوں ہی کے پاس گیتوں کا گراں بہا خزانہ ہوگا۔

جب کیلب نامی گاؤں میں شروع شروع میں مدرسوں اور مقرروں نے آنا شروع کیا تو عورتیں جلسوں میں اس طرح بیٹھتی تھیں کہ ان کی پشت مقرر کی طرف ہوتی تھی تاکہ وہ انکے چہرے نہ دیکھ سکے۔ لیکن جب تقریر کے خاتمے پر کوئی مطرب گانا شروع کرتا تو موسیقی کا احترام انکی بےجا شرم‌وحیا پر غالب آجاتا، نہ صرف یہ کہ اب ان کا رخ مطرب کی طرف ہو جاتا بلکہ انہیں اسکی بھی اجازت ہوتی کہ ایسے موقعوں پر وہ اپنے نقاب بھی الٹ سکتی ہیں۔

ایک بھی دن بلکہ یہ کہوں کہ ایک بھی پل ایسا نہیں گذرتا جب وہ گیت جو میری ماں نے مجھے پالنے میں سنایا تھا اور میرے دل کی گہرائیوں میں مکین ہے، میرے ذہن میں نہ ابھر آتا ہو۔ وہ گیت میرے تمام اشعار کا گہوارہ ہے، وہ تکیہ ہے جس پر سر رکھتے ہی میرے تھکےماندے ذہن کو آرام محسوس ہونے لگتا

ہے، یہ وہ گھوڑا ہے جو مجھے میری منزل تک پہنچاتا ہے، وہ چشمہ ہے جس سے میں اپنی پیاس بجھاتا ہوں اور وہ آتشدان ہے جو مجھے تازیست حرارت عطا کرتا رہے گا۔

ساتھ ہی ساتھ میں وہ شوکوم بھی نہیں بننا چاہتا جو بڑے اور قدآور ہو جانے کے باوجود ماں کا دودھ چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''جسم تو بیل جیسا ہے لیکن دماغ ہے بچھڑے کا،،۔

آج کل ایک فیشن چل پڑا ہے، سوالناموں کا فیشن۔ مجھے تو اب یہ بھی یاد نہیں کہ کتنے سوالناموں کے جواب دے چکا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان میں سے کسی سوالنامے میں بھی حب‌الوطنی سے متعلق کوئی سوال نہ تھا۔ مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ عام طور پر حب‌الوطنی کا کوئی وجود نہیں۔

پھر یہ بات بھی ہے کہ کسی سوالنامے کے جواب میں محض اتنا لکھ دینا ہی کافی نہیں کہ آپ سوویت یونین کے شہری ہیں، بلکہ آپ کو اپنے عمل کے ذریعے اسکا ثبوت دینا ہوگا۔ صرف یہ اعلان کر دینا ہی کافی نہیں کہ آپ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں، آپ کو وہ فرائض بھی انجام دینے ہونگے جو ایک ممبر پر عائد ہوتے ہیں۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ ''آپکی مادری زبان کیا ہے؟،، تو جواب میں صرف ''آوار،، لکھ دینا ہی کافی نہیں، آپ کو اسے عمل کے میدان میں بھی اپنی مادری زبان کی طرح برتنا ہوگا۔ آپ میں اتنی جرأت ہونی ہی چاہئے کہ استقلال کے ساتھ اس زبان کے وفادار رہیں۔

میرے مہمانو! تم چاہے جہاں سے بھی آ رہے ہو، میں تمہارا خیرمقدم کرتا ہوں۔ تم بہنوں اور بھائیوں کی طرح میرے پاس آؤ! میں تمہارے ساتھ تمہارے گیتوں کا بھی استقبال کرتا ہوں، میرے دل میں تم میں سے ہر ایک کے لئے گنجائش موجود ہے۔

اگر کوئی پہاڑی کسی دوسری قوم کی لڑکی اپنے گھوڑے پر بٹھائے حنزہ آتا تھا تو قیامت برپا ہو جاتی تھی۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے اس کی یہ خطا کبھی معاف نہیں کرتے تھے۔ لیکن

آج بوڑھے اور جوان سبھی اسے زندگی کا معمول سمجھنے لگے ھیں - کسی بھی قوم کی لڑکی سے کسی آوار مرد کی شادی آج باعث ذلت نہیں سمجھی جاتی - اب ھمارے علاقوں میں صرف ایک طرح کی شادی مذموم سمجھی جاتی ھے، اور وہ ھے ایسی شادی جسکی بنیاد باھمی محبت پر نہ ھو -

یقیناً یہ بات سچ ھے کہ پھول جتنے ھی رنگا رنگ ھونگے ان کا گلدستہ بھی اسی قدر خوبصورت ھوگا - آسمان میں ستاروں کی تعداد جتنی زیادہ ھوگی آسمان اتنا ھی زیادہ روشن ھوگا - قوس قزح کے حسن کی وجہ یہی ھے کہ اس میں زمین کے سارے رنگ سمٹ آتے ھیں -

میں نے افریقہ میں ایک انوکھا پھول دیکھا - اسکی ھر پنکھڑی رنگ اور خوشبو کے لحاظ سے مختلف تھی اور ان میں سے ھر ایک کا اپنا نام بھی تھا - مختصر طور پر یوں کہوں کہ میں نے ایک شاخ پر ایک پورا گلدستہ کھلا ھوا دیکھا، فرق صرف اتنا تھا کہ گلدستے کی طرح اس میں بہت سارے پھول نہیں تھے بلکہ یہ اکیلا پھول تھا -

میں چاھتا ھوں کہ آوار زبان میں لکھی جانے والی میری یہ کتاب بھی اس پھول جیسی ھو تاکہ اس میں ھر شخص کو اپنی خواھشوں اور امنگوں کی جھلک مل سکے، ھر شخص اپنی پسند کا سامان حاصل کرسکے -

اور اس لئے میں اپنے آگے وہ ساری چیزیں پھیلا دیتا ھوں، ایک کتاب کی تکمیل کے لئے جو ضروری ھوا کرتی ھیں - کوباچی کے ماھر کاری گر کی طرح میں نے وہ ساری چیزیں اپنے قریب رکھ لی ھیں جنکی ضرورت پڑسکتی ھے - اس کے پاس چاندی، سونا، چھینیاں، برمے، ھتھوڑے اور ڈیزائن ھوتے ھیں - میرے پاس میری مادری زبان ھے، زندگی کا عرفان ھے، لوگوں کے خاکے ھیں، کردار ھیں، اپنے گیتوں کا ترنم ھے، تاریخ، انصاف اور محبت کا شعور ھے، میرے ملک کے قدرتی مناظر ھیں، ابا کی یادیں ھیں، اور میری قوم کا ماضی اور مستقبل ھے... یہ ساری چیزیں میرے ھاتھ میں سونے کے ڈلے کی طرح ھیں - مگر سوال یہ ھے کہ کیا میرے ھاتھ بھی اتنے ھی ھنرمند ھیں؟ کیا اس کام کی

انجام‌دہی کےلئے وہ صلاحیت اور ہنرمندی کافی ہوگی جسکا میں مالک ہوں؟

آخر میں وہ کون سا طریقہ اختیار کروں کہ اپنے گیتوں کو کانپتے ہوئے پرندوں کی طرح تمہاری ہتھیلیوں پر آزاد چھوڑ دوں تاکہ وہ اسی طرح بغیر طلب اور بغیر اطلاع تمہارے دلوں کو معمور کر سکیں جس طرح محبت تمہارے دلوں میں جگہ بنا لیتی ہے۔

ایک بار پھر میری نگاہیں ان تمام چیزوں کا جائزہ لیتی ہیں جو میری میز پر بکھری ہوئی ہیں...

لوگ کہتے ہیں کہ جس شہسوار کے پاس گھوڑا نہ ہو خدا کرے اسکی بیوی اسے دغا دے جائے۔

لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس شہسوار کی بیوی بھی خدا کرے اسے دغا دے جائے جس کے پاس نہ گھوڑے کے لئے زین ہو نہ چابک۔

لوگ کہتے ہیں: عقاب کو گھاس کھلانے اور گدھے کو گوشت کھلانے کی کوشش کبھی نہ کرو۔

لوگ کہتے ہیں کہ اگر دیواریں مضبوط نہ ہوں تو خوبصورت سے خوبصورت مکان بھی گر سکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک مرغی نے خواب دیکھا کہ وہ عقاب بن گئی ہے، وہ ایک چٹان سے اڑی اور نتیجے میں اپنے بازو توڑ بیٹھی۔

ایک نالے نے خواب دیکھا کہ وہ زبردست دریا بن چکا ہے، اس نے اپنا پانی ریگستان میں پھیلا دیا اور دیکھتے دیکھتے خشک ہو گیا۔



زبان

اک بچہ اس میں لیٹا ہے، ہنستا ہے، غوں غاں کرتا ہے
لیکن اب تک ہونٹ اسکے لفظوں سے مانوس نہیں
اک دن ایسا آئے گا، وہ بولے گا، بتلائے گا
وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے۔
(پالنے پر ایک کتبہ)

اگر دنیا میں لفظوں کا وجود نہ ہوتا تو وہ ایسی نہ ہوتی جیسی آج ہے۔

دنیا کی تخلیق سے سینکڑوں سال پہلے شاعر جنم لے چکا تھا۔
جو شخص زبان سے ناواقفیت کے باوجود شعرگوئی کا فیصلہ کرے وہ اسی طرح کا پاگل ہے جو تیراکی نہ جانتے ہوئے بھی دریا میں چھلانگ لگا دے۔

کچھ لوگ منھ کھولتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ ان کے ذہن کے افق پر منڈلانےوالے خیالات کے بادل نے انہیں زبان کھولنے پر مجبور کر دیا ہے، بلکہ محض اس لئے کہ انکی زبان کھجلا

رہی ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو شاعری کرتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کہ ان کے دل میں احساسات و جذبات کی گہری لہریں موجزن ہیں، بلکہ اس لئے کہ... لیکن یہ بتانا تو مشکل ہے کہ ایسے لوگ اچانک شعر گوئی کا فیصلہ کیوں کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے اشعار مجھے ایسے لگتے ہیں جیسے بھیڑ کی کچی کھال سے بنے کسی تھیلے میں سوکھے اخروٹ کھنک رہے ہوں۔

یہ لوگ پہلے اپنے اردگرد کی دنیا پر نظر ڈالنا اور یہ دیکھنا نہیں چاہتے کہ اس دنیا میں کس طرح کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ وہ ان آوازوں، گیتوں اور نغموں کو سننا اور تلاش کرنا بھی نہیں چاہتے جن سے دنیا کی فضا معمور ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ قدرت نے انسان کو آنکھیں، کان اور زبان کیوں عطا کئے ہیں؟ اور ایسا کیوں ہے کہ انسان کو آنکھیں بھی دو ملی ہیں اور کان بھی دو ملے ہیں لیکن زبان ایک ہی ملی ہے؟ مقصد یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ زبان سے کوئی لفظ ادا ہو انسان کو چاہئے کہ اپنی دونوں آنکھوں سے سب کچھ دیکھ بھال لے اور دونوں کانوں کی مدد سے سب کچھ سن لے۔

منہ سے نکلنے والا لفظ اس گھوڑے کی طرح ہے جو ایک ڈھلوان، سنگلاخ اور تنگ پہاڑی راستے سے اتر کر ایک وسیع و عریض اور ہموار میدان میں آپہنچا ہو۔ یہاں یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا کوئی انسان کسی ایسے لفظ کو زبان سے ادا کر سکتا ہے جو اس کے دل کی گہرائیوں میں اپنی جگہ نہ بنا چکا ہو؟

اس طرح کی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے جسے خالص لفظ کہا جا سکے۔ وہ بہت کچھ ہو سکتا ہے — دشنام، مبارکباد، حسن، درد، غلاظت، پھول، جھوٹ، سچائی، روشنی یا تاریکی۔

''گناہگار ہیں، دنیا سنوار دے یارب''\
وطن میں بارہا میں نے سنا ہے یہ جملہ\
نہ جانے عہد ہے؟ یا حکم؟ یا دعا کوئی\
یہ ایک جملہ، ہر اک لفظ جسکا سحرزدہ

بدی کے ہاتھوں اجاڑے ہوئے جہاں کےلئے
ہم ایک جنگ شروع کر رہے ہیں، پھر یارو!
زباں کھولو! کوئی عہد، کوئی حکم، دعا کوئی
جو اس جہاں کو بچالے، بس ایسی بات کہو!

ایک بار میرے ایک دوست نے کہا: میں اپنے قول کا مالک ہوں، چاہوں تو اسکا پاس کروں اور چاہوں تو اسے نظر انداز کردوں۔ ہو سکتا ہے میرے دوست کا یہ موقف ان کے لئے موزوں ہو لیکن ادیب کو حقیقی معنوں میں اپنے قول کا پابند ہونا چاہئے، چاہے اسکی نوعیت قسم کھانے کی ہو، چاہے بددعا دینے کی۔ اسے کسی ایک ہی چیز یا ایک ہی کام کے بارے میں دو مرتبہ قسم نہیں کھانا چاہئے۔ اور یوں بھی میرا خیال ہے کہ جو لوگ بار بار قسمیں کھاتے ہیں وہ یقیناً جھوٹے ہوتے ہیں۔

اگر یہ کتاب قالین سے مشابہہ ہے تو میں اسے آوار زبان کے رنگارنگ دھاگوں سے بن رہا ہوں۔ اگر یہ بھیڑ کی کھال کے گرم کوٹ سے مشابہہ ہے تو میں کھال کے الگ الگ ٹکڑوں کو آوار زبان کے مضبوط دھاگوں سے جوڑ رہا ہوں۔

لوگ کہتے ہیں کہ بہت عرصہ پہلے آوار زبان میں الفاظ کی تعداد بہت کم تھی۔ اتنی کم کہ ''آزادی''، ''زندگی''، ''ہمت''، ''دوستی'' اور ''شرافت'' جیسے تصورات کے اظہار کےلئے یا تو ایک ہی لفظ استعمال کیا جاتا تھا یا پھر جو الفاظ استعمال ہوتے تھے وہ صوت اور مفہوم کے لحاظ سے بے حد یکسانیت رکھتے تھے۔ اگر لوگ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری چھوٹی سی قوم کی زبان بڑی مفلس ہے تو شوق سے کہیں، لیکن میں جو کچھ بھی کہنا چاہوں اپنی مادری زبان میں کہہ سکتا ہوں اور مجھے احساسات اور افکار کی ترجمانی کے لئے کسی دوسری زبان کی ضرورت نہیں۔

داغستان میں ایک چھوٹی سی قوم آباد ہے جسے لاک کہتے ہیں۔ لاک زبان بولنےوالوں کی مجموعی تعداد ۵۰ ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں وثوق سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی

کیونکہ اس قوم میں بہت سے بچے ہیں جو ابھی بول ہی نہیں پاتے اور بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے باپ دادا کی زبان فراموش کر چکے ہیں۔

لاک یوں تو چھوٹی سی قوم ہے لیکن اس قوم کے لوگ متعدد دوردراز ملکوں میں بھی مل جاتے ہیں۔ سنگلاخ زمین پر روزی کی قلت نے انہیں دنیا بھر میں بکھر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان میں بہت سارے لوگ بڑے اچھے دستکار تھے، موچی، سنار، لوہار وغیرہ۔ کچھ ایسے لوگ تھے جو بڑے اچھے گلوکار تھے اور دیس بدیس گھوم گھوم کر اپنے اپنے گانے سنایا کرتے تھے۔ اس قوم کے بارے میں داغستان میں ایک کہاوت عام ہے:
"تربوز کاٹتے وقت احتیاط سے کام لو اس سے اچھل کر کوئی لاک قوم کا فرد بھی برآمد ہو سکتا ہے۔"

لاک قوم سے تعلق رکھنےوالی جب کوئی ماں اپنے بیٹے کو دوردراز سفر پر رخصت کرتی ہے تو ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی کرتی ہے: "جب تم شہر میں شوربہ کھانے بیٹھنا تو دیکھ لینا کہ کہیں پلیٹ کے نیچے تمہارا کوئی ہم‌قوم تو براجمان نہیں ہے۔"

اس سلسلے میں ایک کہانی سنئے۔ لاک قوم کا کوئی فرد ایک بار لینن گراد یا ماسکو یا پھر کسی دوسرے بڑے شہر میں گھوم پھر رہا تھا۔ اچانک اسے ایک آدمی نظر آیا جو داغستانی لباس میں تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اسکے وطن کی ہوا کا کوئی جھونکا پاس سے گذر گیا ہو، اس نے اس اجنبی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لپک کر اسکے پاس پہنچا اور لاک زبان میں اس سے مخاطب ہوا۔ اجنبی نے سر ہلا کر ظاہر کیا کہ اسے لاک زبان نہیں آتی۔ اب بیچارے نے کومیک کا سہارا لیا، وہ بھی بیکار رہی، پھر تات اور لیزغین کا، لیکن اسکی ساری کوشش بیکار رہی۔ وہ جس زبان کا سہارا لیتا، داغستانی راہ‌گیر اس سے ناواقف نکلتا، آخر اس نے روسی زبان میں بات شروع کی اور تب معلوم ہوا کہ وہ جس آدمی سے مخاطب ہے وہ آوار قوم سے تعلق

رکھتا ہے ۔ بات آگے بڑھی تو آوار اجنبی نے اس پر لعن طعن شروع کردی :

''تم کیسے داغستانی اور میرے ہم وطن ہو کہ تمہیں آوار زبان نہیں آتی ۔ نہیں، نہیں تم بدھو اونٹ ہو داغستانی نہیں ۔ ''

اس بحث میں اپنے ہم قوم آوار کا ساتھ دینا میرے لئے ممکن نہیں ۔ وہ بلاوجہ اس لاک آدمی سے الجھ پڑا ۔ ہاں، آدمی آوار زبان سے واقف ہو سکتا ہے لیکن یہ لازمی نہیں ہے ۔ اہم بات تو یہ تھی کہ لاک قوم کے فرد کو اپنی مادری زبان آتی تھی اور بہت ساری زبانیں بھی جبکہ آوار ان میں سے ایک سے بھی واقف نہ تھا ۔

ابوطالب ایک بار ماسکو گئے ۔ سڑک پر انہیں کچھ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی ۔ غالباً بازار کا راستہ ۔ انہوں نے ایک راہ گیر سے پوچھا ۔ اب اسے اتفاق ہی کہئے کہ انہوں نے جس سے سوال کیا وہ انگریز تھا ۔ ابوطالب کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ ماسکو کی سڑکوں پر بہت سارے غیرملکی گھومتے پھرتے مل جاتے ہیں ۔

انگریز ابوطالب کی بات نہ سمجھ سکا ۔ اس نے خود ان سے ہی سوالات شروع کر دئے، پہلے انگریزی میں، پھر فرانسیسی میں، پھر ہسپانوی زبان میں، غرضیکہ اس نے مختلف زبانوں میں انہیں اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی ۔

ادھر ابوطالب نے اس انگریز سے روسی زبان میں بات کرنی چاہی، پھر لاک، آوار، لیزغین، دارغین اور کومیک میں ۔ غرض جتنی بھی زبانیں وہ جانتے تھے انہوں نے استعمال کر ڈالیں مگر کچھ حاصل نہ ہوا ۔

آخر دونوں ایک دوسرے کا مطلب سمجھے بنا اپنی اپنی راہ چل دئے ۔

داغستان کے ایک باشندے نے جو ذرا ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا تھا اور کوئی دو ڈھائی لفظ انگریزی کے جان گیا تھا بعد

میں ابوطالب کو مخاطب کرکے کلچر کی اھمیت پر ایک لکچر جھاڑ دیا:

''دیکھا نا کلچر کے کیا معنی ھیں۔ اگر تم واقعی تہذیب یافتہ ھوتے تو تم نے اس انگریز سے انگریزی میں بات کی ھوتی۔ آئی بات تمہاری سمجھ میں؟''

''ھاں! میں تمہاری بات سمجھ گیا،، ابوطالب نے جواب دیا۔ ''البتہ مجھے یہ بتلا دو کہ اس انگریز کو مجھ سے زیادہ پڑھا لکھا کیوں سمجھا جائے؟ کیونکہ میں اتنی ساری زبانیں بولا لیکن وہ بھی تو ان کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکا۔''

میرے نزدیک زبانیں آسمان پر بکھرے ھوئے ستاروں کی حیثیت رکھتی ھیں۔ اور میں یہ نہیں چاھونگا کہ تمام ستارے ایک دوسرے میں ضم ھو کر ایک بڑے ستارے کا روپ لے لیں۔ کیونکہ اس کے لئے تو سورج موجود ھی ھے۔ لیکن سورج کے وجود کے بعد بھی یہ ضرورت باقی رہ جاتی ھے کہ ستارے آسمان پر چمکتے رھیں۔ اور ھر آدمی کے پاس اسکا اپنا ستارہ ھو۔

مجھے اپنے ستارے یعنی اپنی مادری زبان آوار سے محبت ھے۔ میں ارضیات کے ان ماھروں کی بات پر یقین رکھتا ھوں جو کہتے ھیں کہ چھوٹی سے چھوٹی پہاڑی میں بھی سونے کی کان نکل سکتی ھے۔

''خدا کرے تیرے بچے اس زبان سے محروم ھو جائیں جو ان کی ماں بولتی ھے،، یہ کوسنا میں نے ایک عورت کو دوسری عورت کو دیتے ھوئے سنا ھے۔

کچھ کوسنوں کے بارے میں۔ جن دنوں میں اپنی نظم ''پہاڑی عورت،، لکھ رھا تھا تو مجھے کچھ کوسنوں کی ضرورت محسوس ھوئی جنہیں نظم میں ایک تندخو اور غصہ‌ور عورت کی زبان سے ادا کرانا تھا۔ مجھے خبر ملی کہ بہت دور کسی پہاڑی گاؤں میں ایک ایسی عورت رھتی ھے جسکا کوسنے دینے میں پاس پڑوس میں کوئی جواب نہیں۔ یہ خبر ملتے ھی میں اس عجیب و غریب کردار سے ملنے کےلئے نکل کھڑا ھوا۔

وہ موسم بہار کی ایک ایسی خوشگوار صبح تھی جب ناخوشگوار باتیں کرنا ہی گناہ محسوس ہوتا ہے، جب میں ان خاتون کے دروازے پر پہنچا۔ بڑی صفائی کے ساتھ میں نے ان بزرگ خاتون کو اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایک نظم لکھ رہا ہوں جس میں مجھے کچھ سخت قسم کے کوسنے بھی نظم کرنے ہیں اور میں نے آپ سے اس طرح کے کوسنے سیکھنے کے لئے ہی یہ سفر کیا ہے۔

یہ سنتے ہی وہ عورت بھڑک اٹھی: ”خدا کرے تیری زبان میں کیڑے پڑ جائیں، تیری چہیتی کو تیرا نام بھی یاد نہ رہ جائے۔ تیرے کاروباری ساتھی تیری بات تک نہ سمجھ پائیں۔ خدا کرے جب تو سفر سے لوٹ کر گھر پہنچے تو گاؤں والوں کو سلام کرنا بھی بھول جائے۔ خدا کرے تیرے پوپلے منہ میں ہوائیں اس طرح گھسیں کہ سیٹیاں سی بجنے لگیں... سیار کے بچے، میں کس طرح ہنس سکتی ہوں (خدا تجھے اس مسرت سے محروم کر دے) جب میرا دل خوش نہ ہو؟ اگر گھر میں مردہ نہ پڑا ہو تو رونے سے کیا فائدہ؟ جب کسی نے نہ میرا قصور کیا ہے، نہ میری بےعزتی کی ہے تو میں محض تجھے سنانے کےلئے کیوں اپنی زبان خراب کروں؟ دور ہوجا۔ اس قسم کی واہیات فرمائش کے ساتھ کبھی یہاں آنے کی ہمت نہ کرنا۔“

”شکریہ! مہربان خاتون۔“ یہ کہتا ہوا میں گھر سے نکل آیا۔ لوٹتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ ”جب وہ غصے اور کسی اشتعال کے بغیر مجھ پر اتنے سخت کوسنوں کی بوچھار کر سکتی ہے، تو اگر وہ واقعی مشتعل ہو جائے تو میرا کیا حال کر ڈالےگی؟“

میرا خیال ہے کہ کبھی نہ کبھی داغستانی لوک کتھاؤں کا کوئی طالبعلم ان کوسنوں کو کتاب کی شکل میں مرتب کرےگا جو پہاڑی علاقوں میں رائج ہیں۔ اور تب دنیا دیکھےگی کہ ہمارے پہاڑی لوگوں میں کتنی اختراعی قوت ہے، کتنی روانی اور تخئیل میں کتنی ندرت ہے، اور ہماری زبان اظہار کی کس بےپناہ قوت کی مالک ہے۔

ہر گاؤں کے کوسنے الگ ہیں اور خدا ان سے بچائے کسی کوسنے میں یہ کہا جائےگا کہ خدا تمہارے ہاتھ پیر مفلوج کر دے،

کسی میں تم کو اپنا جنازہ اٹھتا نظر آئے گا۔ کبھی کہا جائے گا کہ خدا کرے جب تم کھانا کھا رہے ہو تو تمہاری دونوں آنکھیں نکل کر طشتری میں آ گریں، اور کبھی یہ کہ خدا کرے تمہاری آنکھیں ٹپک کر پہاڑی ڈھلوان پر گریں اور پتھروں سے ٹکراتی کسی گہرے کھڈ میں غائب ہو جائیں۔ سخت سے سخت کوسنا جو تم کو دیا جائے گا وہ تمہاری آنکھوں سے متعلق ہوگا اور اس سلسلے میں پہاڑی لوگوں نے اپنی قوت اختراع کے وہ ثبوت مہیا کئے ہیں جنکا جواب مشکل ہی سے ملے گا۔ لیکن بعض کوسنے اس سے بھی زیادہ ہولناک ہیں۔ مثلاً میں نے ایک گاؤں میں دو عورتوں کی لڑائی سنی۔

''اللہ تیرے بچوں کو اس انسان سے محروم کر دے جو انہیں انکی زبان سکھانے والا ہے،، ایک عورت نے دوسری عورت کو کوسنا دیا۔

''اللہ کرے تیرے یہاں ایک آدمی بھی ایسا نہ بچے جو تیرے بچوں کو انکی زبان سکھا سکے،، دوسری نے نہلے پر دہلا لگایا۔

جی ہاں! کوسنے ایسے ہی ہولناک ہوا کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوسنا نہ بھی دیا جائے تب بھی اگر پہاڑی علاقوں کا کوئی آدمی اپنی مادری زبان کا احترام نہ کرے تو اسکی وقعت دو کوڑی کی بھی نہیں رہ جاتی۔ کسی شاعر کی ماں اپنے بیٹے کی وہ نظمیں سننے سے بھی انکار کر دے گی جن کی زبان خراب ہو۔

اپنی نوٹ بک سے۔ پیرس میں میری ملاقات ایک مصور سے ہوئی جو داغستانی تھا۔ انقلاب کے کچھ ہی دن بعد وہ تعلیم کی غرض سے اٹلی چلا گیا، وہیں اس نے ایک اطالوی خاتون سے شادی کر لی اور ہمیشہ کےلئے بس گیا۔ بےچارہ پہاڑی رسم و رواج کا ساختہ پرداختہ تھا اس لئے اس نئے وطن میں بسنے اور وہاں کے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے میں اسے خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خود کو اس نئی دنیا کا عادی بنانے کےلئے اس نے سیر و سیاحت کا سہارا لیا۔ دوردراز ملکوں کی راجدھانیوں میں دل بہلانے کی کوشش کی، مگر جہاں بھی گیا وطن کی یاد اور اپنے وطن سے جدائی کا احساس سایہ کی طرح اسکے ساتھ رہا۔ میں

نے اس سے کچھ تصویریں دکھانے کی خواہش کی، محض یہ دیکھنے کےلئے کہ اس مصور نے اپنے ان جذبات اور اپنی ان کیفیات کو رنگ کے قالب میں کس طرح ڈھالا ہے۔

ان میں ایک تصویر نظر آئی جسکا عنوان تھا ''وطن کی غمگین یاد''۔ اس تصویر میں ایک اطالوی عورت (مصور کی بیوی) دکھائی دی جو داغستانی عورتوں کا روایتی لباس پہنے ایک پہاڑی چشمے کے کنارے کھڑی تھی۔ اسکے ہاتھ میں چاندی کی ایک منقش صراحی تھی جس پر گوتساتلی کے کاریگروں جیسے نقش بنے تھے جن کی کاری گری دور دور تک مشہور ہے۔ پس‌منظر میں پہاڑ کی ڈھلوان پر بسا ہوا ایک سنسان سا تنہا آوار گاؤں تھا۔ گاؤں کے پتھریلے مکانوں کے پس‌منظر میں پہاڑ تھے، جو گاؤں سے زیادہ اداس اور بےجان لگ رہے تھے۔ پہاڑ کی چوٹیاں کہر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''کہر پہاڑوں کے آنسو ہیں'' مصور نے وضاحت کی۔ ''کہر جب ڈھلوانوں پر چھا جاتی ہے تو شبنم کا روپ لے کر صاف شفاف قطروں کی صورت میں ڈھلکتی نیچے، گہرائیوں میں جا گرتی ہے۔ یہ کہر میں ہوں۔''

ایک دوسری تصویر میں ایک چڑیا دکھائی گئی تھی جو بنجر پہاڑوں پر اگنے والی ایک خاردار جھاڑی پر بیٹھی تھی۔ چڑیا چہچہا رہی تھی اور ایک مکان کی کھڑکی میں ایک پہاڑی دوشیزہ کا افسردہ اور مغموم چہرہ نظر آرہا تھا۔ مجھے یہ تصویر کافی دلکش لگی، میری دلچسپی محسوس کرتے ہوئے مصور نے کہا:

''یہ ایک پرانی آوار لوک کتھا پر مبنی ہے۔''

''کونسی لوک کتھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''کہانی یوں ہے کہ ایک بار ایک چڑیا کو پکڑ کر پنجرے میں بند کر دیا گیا۔ چڑیا پنجرے میں رات دن چلایا کرتی: میرا وطن، وطن، وطن، وطن... بالکل اسی طرح ان تمام طویل برسوں کے دوران میں وطن، وطن کی رٹ لگائے رہا ہوں... ایک دن اس چڑیا کو پکڑنےوالے نے سوچا: 'آخر اس چڑیا کا وطن ہے کہاں اور کس قسم کا ہے؟ یقیناً وہ کوئی خوبصورت وادی اور

سرسبز و شاداب پہاڑ ہوگا، جہاں خوبصورت اور قدآور درخت ہونگے اور ایسی خوبصورت چڑیاں ہونگی جو فردوس میں ہی دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں چڑیا کو آزاد کردوں‌گا، اسکا پیچھا کرونگا اور یوں اس خوبصورت وادی تک پہنچ جاؤنگا۔ ، اس نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور اسے اڑ جانے دیا۔ چڑیا اڑکر دس قدم گئی اور پھر ایک اجاڑ جھاڑی پر جا بیٹھی جو تنگ بوچی پہاڑی پر اگی ہوئی تھی۔ اسی جھاڑی کی کسی شاخ پر اسکا گھونسلا تھا... میں بھی اپنے پنجرے کی تیلیوں سے اپنے وطن کو دیکھتا رہا ہوں۔ ،،

''تو پھر آپ وطن کیوں نہیں لوٹنا چاہتے؟،، میں نے پوچھا۔

''اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ جب میں نے وطن چھوڑا تھا تو میرے پہلو میں ایک جوان دل تھا جس میں ایک جوالا بھڑک رہی تھی۔ اور اب میں محض اپنی بوڑھی ہڈیاں لے کر اپنے وطن کس منہ سے جاؤں؟،،

پیرس سے واپسی پر میں نے مصور کے عزیزوں کو تلاش کیا۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اسکی ماں ابھی تک زندہ ہے۔ مصور کے عزیز افسردہ چہروں کے ساتھ گاؤں کے ایک مکان میں میرے اردگرد جمع ہوئے، اپنے اس سپوت کی کہانی سننے کےلئے جس نے ہمیشہ کےلئے اپنا وطن چھوڑ دیا تھا اور ایک دوسرے ملک میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے وطن چھوڑنے کا قصور معاف کر دیا تھا اور یہ جان کر ان میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی تھی کہ ان کا کھویا ہوا بیٹا ابھی زندہ ہے۔

اچانک اسکی ماں نے مجھ سے ایک سوال کر لیا: ''اس نے تم سے بات‌چیت تو آوار زبان میں ہی کی ہوگی نا؟،،

''نہیں۔ ہم نے ترجمان کے ذریعے بات‌چیت کی۔ میں روسی بول رہا تھا اور آپ کا بیٹا فرانسیسی۔ ،، میں نے جواب دیا۔

ماں نے چہرے پر سیاہ نقاب ڈال لیا جس طرح ہمارے پہاڑوں میں بیٹے کی موت کی خبر سن کر مائیں کیا کرتی ہیں۔ اوپر چھت پر بڑی بڑی بوندیں گر رہی تھیں، ہم آوارستان میں تھے، غالباً بہت دور دنیا کے اس سرے پر پیرس میں داغستان کا وہ

بیٹا بھی جو اپنے قصور پر نادم تھا، برستے ہوئے پانی کی آواز سن رہا ہوگا۔

''رسول! تم سے غلطی ہوئی۔''، ایک طویل خاموشی کے بعد ماں نے کہا۔ ''میرے بیٹے کو مرے ہوئے تو ایک مدت بیت گئی۔ جس سے تم ملے ہو وہ میرا بیٹا نہ رہا ہوگا، کیونکہ میرا بیٹا اس زبان کو کبھی بھلا نہیں سکتا جو میں نے، ایک آوار ماں نے اسے سکھائی تھی۔''

یادوں کی ایک جھلک۔ ایک زمانے میں میں ایک آوار تھیٹر سے وابستہ تھا۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب اسٹیج سے متعلق ضروری سامان، ڈرامے میں پہنے جانےوالے کپڑے اور دوسری چیزیں کندھوں پر لادے ہم لوگ گاؤں گاؤں پھرا کرتے (تھیٹر کا سارا سامان اور اسباب گدھوں پر لدا ہوتا، پھر بھی کچھ بچ رہتا جسے ہم لوگوں کو ڈھونا پڑتا) اور یوں ڈرامے کا فن پہاڑی باشندوں تک پہنچاتے۔ مجھے اکثر وہ زمانہ یاد آتا ہے جو میں نے اس طرح گذارا ہے۔

میں بعض ڈراموں میں چھوٹے چھوٹے کردار بھی ادا کرتا لیکن عام طور پر مجھے پرومپٹر (آہستہ آہستہ اداکاروں کو ان کے جملے یاد کرانےوالا جو اسٹیج کے پس منظر میں رہتا ہے) کے فرائض ادا کرنے ہوتے۔ اس زمانے میں ایک جوان شاعر کی حیثیت سے مجھے یہ کام دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پسند تھا۔ اداکاری، چہرے کی حرکات، اشارے کنائے اور اسٹیج پر موجودگی کو میں ثانوی حیثیت دیتا تھا۔ مجھے لباس، میک اپ اور آرائش غیراہم لگتے تھے۔ سب سے پہلی اور اہم چیز ڈرامے کا متن ہے اور اسی لئے میں بڑی چوکسی کے ساتھ اس بات پر نظر رکھتا کہ اداکار ایک ایک جملہ یاد رکھیں اور جس طرح جملہ ادا کرنا چاہئے بالکل اسی انداز اور اسی لب و لہجے کے ساتھ وہ جملہ ادا کریں۔ جہاں کوئی اداکار کوئی جملہ بھول جاتا یا غلط طور پر بول جاتا میں اپنی جگہ سے سر نکال کر صحیح جملہ اتنی بلند آواز سے دہراتا کہ پورا ہال میری آواز سن لیتا۔

جی ہاں! میں متن اور الفاظ کو دوسری تمام چیزوں پر فوقیت دیتا تھا کیونکہ الفاظ نہ لباس کے محتاج ہوتے ہیں اور نہ میک اپ کے، وہ ان سب چیزوں کے بغیر بھی اپنے معنی اور مفہوم کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ہم لوگ ایک ڈرامہ پیش کر رہے تھے جسکا نام تھا ''پہاڑی لوگ،، اور موضوع تھا آوار قوم کا ماضی۔ ہر بار کی طرح میں پرومپٹر کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ کہانی کچھ اس طرح کی تھی کہ ہیرو آنیکازی اپنے دشمنوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ گزیں ہے اور رات کے اندھیرے میں اپنی محبوبہ سے ملنے گاؤں آتا ہے۔ محبوبہ اسے سمجھاتی ہے کہ وہ چلا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خون کے پیاسے دشمن اسے دیکھ لیں اور موت کے گھاٹ اتار دیں۔ لیکن آنیکازی ایسا نہیں کرتا، وہ بارش سے بچانے کے لئے بکری کی کھال کا کوٹ اتارکر محبوبہ کو پہنا دیتا ہے اور پھر اپنی محبت اور ہجر کی اذیتوں کا بیان شد و مد سے کرنے لگتا ہے۔

اس دن یہ کردار ماکائیف نامی اداکار انجام دے رہا تھا۔ محبت کا سین پورے شباب پر تھا کہ اداکار کی بیوی اسٹیج پر آگئی اور اپنے شوہر پر ٹوٹ پڑی جو اسکی آنکھوں کے سامنے ایک دوسری عورت سے اظہار عشق کر رہا تھا۔ ماکائیف نے اسکے بازو پکڑے اور تقریباً اسکو کھینچتا ہوا اسٹیج کے پیچھے لے گیا تاکہ صورت حال کی وضاحت کر سکے۔ اس نے سمجھا تھا کہ وہ بیوی کو سمجھابجھا کر اسٹیج پر واپس آجائے گا۔ لیکن بیوی نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا۔ ہیروئن تھوڑی دیر تک اسٹیج پر کھڑی انتظار کرتی رہی، شش و پنج کا عالم تھا اور ڈرامہ جہاں رک گیا تھا رکا ہوا تھا۔

میں اپنے سیدھے سادے لباس میں اپنی جگہ بیٹھا تھا، پینٹ اور سفید قمیص پہنے جس کے کالر کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ پیروں میں سلیپر تھے۔ مجھے اس وقت ادا کئے جانے والے مکالمے پوری طرح یاد تھے، مگر اس لباس میں میں اداکار کی کمی تو پوری نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک اہم ترین چیز تو مکالمے تھے لباس اور میک اپ نہیں، اس لئے میں اسٹیج پر تقریباً

کود پڑا اور وہ سارے مکالمے هیروئن کو مخاطب کرکے ادا کر دئے جو اسے ماکائیف کی زبانی سنتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم کہ حاضرین کو خوشی ھوئی یا نہیں، غالباً ان کےلئے یہ سنجیدہ ڈرامہ، مزاحیہ ڈرامے میں تبدیل ھو گیا ھو، بہرحال میں پوری طرح مطمئن تھا۔ کیونکہ ڈرامے کا متن اور مفہوم حاضرین سمجھ گئے تھے، ایک لفظ کی بھی بھول چوک نہیں ھوئی تھی اور میرے نزدیک اھم بات یہی تھی۔

مجھے یاد ھے کہ ایک بار اسی منڈلی کے ساتھ اونچے پہاڑوں پر واقع گونیب گاؤں پہنچا جو بہت مشہور ھے۔ سبھی لوگ جانتے ھیں کہ شاعروں کی اپنی برادری ھوتی ھے۔ تمام شاعر کوناک * ھوتے ھیں۔ میں نے سنا تھا کہ گونیب میں ایک شاعر رھتا ھے لیکن اس سے کبھی ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں اس سے ملنے گیا۔ اس شاعر نے اصرار کیا کہ جب تک ھماری منڈلی وھاں رھے میں اسی کے گھر میں قیام کروں۔

میرے میزبانوں نے اتنی خاطر کی کہ مجھے کچھ شرمندگی سی محسوس ھونے لگی اور ان لوگوں کو اس قدر زحمت دینے پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ خاص طور پر اس شاعر کی ماں نے مجھے جس شفقت اور محبت سے نوازا وہ میرے دل پر نقش ھوکر رہ گئی ھے۔

رخصت ھوتے ھوئے میں نے ممنونیت کے اظہار کے لئے موزوں الفاظ ڈھونڈے۔ اتفاق یہ ھوا کہ جب میں رخصت ھو رھا تھا تو کمرے میں شاعر کی ماں کے علاوہ اور کوئی بھی نہ تھا۔ میں جانتا ھوں کہ ماں کےلئے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات نہیں ھوسکتی کہ لوگ اسکے بیٹے کی تعریف کریں۔ حالانکہ اس شاعر کی صلاحیت کے بارے میں میری رائے کچھ بہت زیادہ اچھی نہ تھی پھر بھی میں نے شرماتے ھوئے اسکی تعریف و توصیف کی کوشش کی۔ میں نے اسکی ماں سے کہنا شروع کیا کہ آپ کا بیٹا

---

* کوناک: قفقاز کے پہاڑیوں میں ان دوستوں یا ساتھیوں کو "کوناک" کہتے ھیں جنمیں گہرے باھمی تعلقات ھوتے ھیں۔ (ایڈیٹر)

انتہائی ترقی پسند شاعر ہے اور عصری موضوعات پر اچھی نظمیں لکھتا ہے۔

''ہو سکتا ہے وہ ترقی پسند شاعر ہو،، ماں نے غمگین لہجے میں میری بات کاٹی ''لیکن اس میں صلاحیت نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسکی نظموں میں عصری مسائل سے آگہی ملتی ہو لیکن جب میں انہیں پڑھنا شروع کرتی ہوں تو مجھے نیند آجاتی ہے۔ ذرا سوچو رسول! جب میرا بیٹا بولنا سیکھ رہا تھا اور یوں بولتا تھا کہ اسکی بات کسی کی سمجھ میں نہ آتی، اس وقت میرا دل کھل اٹھتا تھا۔ اور آج جب اس نے بولنا ہی نہیں بلکہ شعر کہنا بھی سیکھ لیا ہے تو مجھے ذرا بھی خوشی محسوس نہیں ہوتی۔ تم نے وہ کہاوت تو سنی ہوگی کہ عورت کی عقل اس کی قمیص کے دامن میں ہوتی ہے۔ جب تک وہ بیٹھی رہے عقل بھی محفوظ رہتی ہے مگر جہاں وہ کھڑی ہوئی عقل پھسل کر زمین پر آجاتی ہے۔ میرے بیٹے کا بھی یہی حال ہے۔ جب وہ کھانے کی میز پر ہوتا ہے تو انسانوں کی طرح بات کرتا ہے اور میں اسکی باتیں ذوق و شوق سے سنتی ہوں، مگر جہاں وہ کھڑا ہوا اور اپنے لکھنے کی میز کی طرف بڑھا سارے دل کش اور آسان الفاظ اسکے دامن سے پھسل جاتے ہیں اور یاد رہ جاتے ہیں صرف بھدے، کرخت، بےمزہ اور بے کیف الفاظ۔ ،،

ایک ماں کے ان جملوں کو یاد کرتے ہوئے میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ کبھی مجھے میری زبان سے محروم نہ کرے۔ میں اس طرح لکھنا چاہتا ہوں کہ میرے تمام اشعار، میری یہ کتاب یا جو کچھ بھی میں لکھوں میری ماں اور میری بہن سمجھ سکیں، اسے عزیز رکھ سکیں، اور یہی نہیں بلکہ میرے پہاڑی علاقے کا ایک ایک فرد اور ہر وہ آدمی جو انہیں پڑھے، ان کا مفہوم سمجھ سکے اور انہیں پسند کرسکے۔ میں لوگوں کو بور کرنا نہیں چاہتا، میں تو ان میں خوشی بانٹنا چاہتا ہوں۔ اگر میری زبان مسخ ہو جاتی ہے، اپنی حرارت کھو بیٹھتی ہے، لوگوں کے سمجھ میں نہیں آتی ہے، بے کیف ہوجاتی ہے یا مختصراً یوں کہوں کہ میں اپنی مادری زبان بگاڑ دیتا ہوں تو یہ میری زندگی کا المناک ترین حادثہ ہوگا۔

بچپن میں جب ہمارے گاؤں کے لوگ مسجد کے قریب برادری کے معاملات پر غور کرنے کےلئے جمع ہوتے تو میں انہیں ابا کی نظمیں سنایا کرتا۔ میں بچہ تھا، چھوٹا سا لڑکا، مگر میں یہ نظمیں پورے جوش و خروش کے ساتھ اور یہی نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ زور لگاکر بلند آواز میں سنایا کرتا اور جو لفظ اور جو لہجہ مجھے اچھا لگتا اس پر میں خاص طور سے زور دیا کرتا۔ مثلاً جب میں ابا کی ایک نئی نظم ''سدا میں بھیڑیئے کا شکار،، سنا رہا تھا تو ایک مخصوص صوت ''تس،، سے شروع ہونے والے تمام الفاظ دانت بھینچ کر اس طرح ادا کرتا کہ ایک لہرسی پیدا ہوجاتی اور وہ الفاظ سننےوالوں کے کان میں جھنجھناہٹ کی کیفیت پیدا کر دیتے۔ مجھے یوں لگتا جیسے یہ پرجوش اور زوردار طرز ادا میرے ترنم کو ایک خاص اظہاریت سے مالامال کر دیتی ہے۔

ابا ہر دفعہ مجھے ٹوکتے اور کہا کرتے:

''کیا لفظ کوئی اخروٹ ہے کہ اسے دانت سے توڑنا اور چبانا ضروری ہو؟ یا الفاظ بھی لہسن کی طرح ہیں جنہیں کھرل میں کوٹنے کی ضرورت پڑتی ہے؟ یا وہ کوئی بنجر اور سنگلاخ زمین ہے جسے جوتنے کے لئے بھاری ہل کا سہارا لینا پڑتا ہے اور پورا زور صرف کرنا پڑتا ہے؟ تمہیں الفاظ روانی کے ساتھ ادا کرنے چاہئیں، غیرضروری زور لگانے کی ضرورت نہیں کہ دانت بھینچنے پڑیں۔،،

اور جب پھر مجھے نظم پڑھنی پڑتی تو کوئی خاص فرق پیدا نہ کر پاتا۔ ایک دن ایسا ہی اتفاق ہوا تو ابا نے ماں کو آواز دی جو مکان کی چھت پر کسی کام میں مشغول تھیں۔ ابا نے کہا: ''شاید تم ہی اسے سمجھا سکو!،،

جو الفاظ مجھے مشکل محسوس ہو رہے تھے، اماں نے انہیں اسی طرح ادا کیا جیسا ابا چاہتے تھے۔

''سنا تم نے؟ اس طرح بولنا چاہئے۔ لو! اب پھر کوشش کرو۔،،

میں نے کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

''انہہ،، ابا کو غصہ آ گیا۔ ''جب جالتورا کے ایک آدمی نے الفاظ کی ایسی گت بنائی تھی تو میں نے جھاڑو سے اسکی خبر

لی تھی۔ اب میں اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کروں۔ ،، یہ کہتے ہوئے ابا غصے میں اٹھ کر چل دئے تھے۔

ابا نے کیسے جالتورا کے رہنے والے آدمی کی مرمت کی۔

یہ واقعہ موسم بہار میں ایک دن پیش آیا۔ سبھی جانتے ھیں کہ بہار کا موسم آتے آتے پچھلی فصل کا جمع شدہ اناج ختم ھو جاتا ھے، اور نئی فصل کا اناج بازار میں اتنی جلدی آ نہیں پاتا۔ اسی لئے بہار کے موسم میں خزاں کے مقابلے میں ساری چیزوں کے دام بڑھ جاتے ھیں۔ حد یہ ھے کہ مٹی کے برتن بھی مہنگے ھوجاتے ھیں حالانکہ ان کا کھیتوں اور فصلوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ھوتا۔

اس دن ابا نے جو جوانی کی منزل میں قدم رکھ چکے تھے بازار جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے ایک پڑوسی نے ان سے کہا کہ میرے لئے بازار سے ایک جھاڑو لیتے آنا اور اس غرض سے بیس کوپک انہیں دئے۔

جب وہ روانہ ھو رھے تھے تو انکے پڑوسی نے کہا: ''اگر جھاڑو سستی مل جائے تو باقی پیسے تم رکھ لینا واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ ،،

جلدی ھی انہیں ایک آدمی نظر آ گیا جو جھاڑو بیچ رہا تھا۔ مول بھاؤ کا سلسلہ شروع ھوا۔ آپ تو جانتے ھی ھیں کہ مشرق کے کسی بازار میں جو قیمت پہلی بار بتائی جاتی ھے وہ کوئی اھمیت نہیں رکھتی، آپ سے کسی ایسی چیز کےلئے ایک سو روبل بھی مانگے جاسکتے ھیں جس کا اصل دام پانچ کوپک سے زیادہ نہ ھوگا۔

ابا نے ایک موٹی سی جھاڑو چنی اور پوچھا:

''یہ بکاؤ مال ھے؟،،

''اگر ایسا نہ ھوتا تو میں یہاں کیوں کھڑا نظر آتا۔ ،،

''کیا دام ھوگا؟،،

''چالیس کوپک۔ ،،

''کیا جھاڑو بھی کوئی گھوڑا ھے کہ مول‌تول اتنی بلندی سے شروع کیا جائے؟ صحیح صحیح دام بتاؤ اور معاملہ ختم کرو۔ ،،

"چالیس کوپک۔"
"مذاق مت کرو؟"
"چالیس کوپک سے ایک دھیلا کم نہ لونگا۔"
"میں بیس کوپک دے سکتا ہوں۔"
"چالیس اور صرف چالیس کوپک۔"
"مگر میرے پاس تو صرف بیس کوپک ہیں۔"
"چالیس کوپک۔"
"لیکن واقعی میرے پاس بیس کوپک سے ایک دھیلا زیادہ نہیں۔"
"تو کیا ہوا جب تمہارے پاس پورے دام ہو جائیں تو لے جانا۔"

ابا کو یقین ہوگیا کہ جھاڑو تو اب خریدی نہیں جاسکتی۔ وہ بازار میں گھومنے پھرنے لگے۔ دوکانوں کی ایک قطار کے پاس ایک چبوترے پر انہیں بھیڑ سی دکھائی دی۔ وہ بھی اس بھیڑ میں گھسے اور لوگوں کو ہٹاتے ڈھکیلتے اگلی صف میں جا پہنچے۔ وہاں انہیں عوامی شاعر محمود نظر آئے جو لوگوں کو اپنے گیت سنا رہے تھے۔

وہ بیٹھے ہوئے تھے، ہاتھ میں اپنا پاندور لئے کبھی اس کے تار ٹھیک کرتے اور کبھی انہیں چھیڑکر گانا شروع کر دیتے۔ پورا مجمع دم سادھے ان کا گانا سن رہا تھا۔ خاموشی کا یہ عالم تھا کہ بازار میں اڑتی ہوئی مکھی کی بھنبھناھٹ بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ گانے کے دوران میں جب ایک نوجوان نے کھانس دیا تو بغل میں بیٹھے ایک معمر پہاڑی نے جو غالباً اس کا باپ تھا اسے باھر نکال دیا۔

خاموشی کے اسی عالم میں جب سوائے محمود کے گیت کے پتہ بھی نہیں کھڑک رہا تھا، جالتورا کے ایک آدمی نے اپنے پڑوسی سے باتیں شروع کردیں۔ دراصل اسکی نیت بری نہ تھی، اسکے پاس جو آدمی بیٹھا ہوا تھا وہ آوار زبان کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتا تھا اس لئے اس بیچارے نے یہ کوشش کی کہ محمود کے گیت کا ترجمہ کرتا چلے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اس کی یہ نیک کوشش بھی زیادہ تر لوگوں کےلئے درد سر بنتی جا رہی

تھی کیونکہ آس پاس کے لوگ اسکی وجہ سے محمود کا گیت سننے میں دقت محسوس کرنے لگے تھے، اور پوری طرح لطف نہیں حاصل کر پا رہے تھے۔

نوجوان حمزہ کو (جو آگے چل کر میرے باپ بنے) اسکی اس حرکت پر سخت غصہ آرہا تھا، پہلے انہوں نے کہنی ماری، مگر کوئی اثر نہ ہوا، پھر انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ ایسا مت کرو، چپ ہوجاؤ، مگر وہ آدمی خاموش نہ ہوا۔ ابا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے خاموش کیسے کیا جائے، انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اب یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ وہ جھاڑو بیچنےوالا بھی محمود کے گیت سننے آ کھڑا ہوا تھا۔ ابا نے لپک کر سب سے موٹی جھاڑو اسکے ھاتھ سے لی اور اس بیچارے جالتوری پر ٹوٹ پڑے۔ وہ آدمی بڑبڑاتا اور دھمکیاں دیتا وھاں سے چلا گیا، مگر ابا اتنے غصے میں تھے کہ جب تک انہوں نے اس آدمی کو دور تک بھگا نہ دیا اس وقت تک انہوں نے دم نہ لیا۔

اسے بھگانے کے بعد ابا جھاڑو بیچنےوالے کے پاس پہنچے تاکہ اسکی جھاڑو واپس لوٹا دیں جس سے انہوں نے ھتھیار کا کام لیا تھا۔

''نہیں۔ تم اسے لے سکتے ھو۔،، اس آدمی نے کہا۔

''مگر میرے پاس تو صرف ۲۰ کوپک ھیں اور تم ۴۰ کوپک مانگ رہے تھے نا؟،، ابا نے پوچھا۔

''تم اسے مفت لے جاؤ، کیونکہ تم نے جو کارنامہ انجام دیا ھے اس کے سامنے میرا سارا مال بےحقیقت ھے۔،،

آج دنیا میں اس جالتوری جیسے لوگوں کی تعداد کئی گنی بڑھ چکی ھے جو دوسروں کو گیتوں سے لطف لینے نہیں دیتے۔ مگر افسوس یہ ھے کہ ایسی جھاڑوئیں نہیں رھی ھیں جن سے ان کا صفایا کیا جا سکے اور نہ ھی ایسے لوگ باقی رہ گئے ھیں جو ان جھاڑوؤں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

پہاڑوں میں کسی چلتے، تیکھے اور چست فقرے کو ''زین کسے گھوڑے کا ھم‌پلہ،، سمجھا جاتا ھے۔

اپنی نوٹ بک سے۔ مخاچ قلعہ میں جس گھر میں میں رہتا ہوں اسی گھر میں علی علیئیف نامی گرامی پہلوان بھی رہتے ہیں جو چار بار عالمی چمپین کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ایک بار استنبول میں انہیں ایک بہت ممتاز ترک پہلوان سے کشتی لڑنی پڑی۔ یہ پہلوان بڑا تجربہ کار اور کشتی کے داؤں پیچ کا ماہر تھا، لیکن علی نے جو بڑے اطمینان اور ہوشیاری کے ساتھ کشتی لڑتے ہیں منٹوں میں اس پہلوان کو چت کر دیا۔ ترک پہلوان نے اٹھتے ہوئے ایک کوسنا دیا جو داغستان کے پہاڑی علاقوں میں بہت رائج ہے۔ استنبول میں کسی کو آوار زبان بولتے سن کر علی کو بےحد حیرت ہوئی لیکن اس سے زیادہ حیرت اس ترک پہلوان کو ہوئی جب اس نے علی سے آوار زبان میں یہ جملہ سنا: ''میرے ہم وطن دوست کوسنے کیوں دیتے ہو یہ تو کھیل ہے۔''

لیکن ان دونوں سے بھی زیادہ حیرت کشتی لڑانے والے، فیصلہ کرنے والوں اور حاضرین کو اس وقت ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ دونوں پہلوان ایک دوسرے کی طرف لپکے اور اس طرح بغلگیر ہو گئے جیسے دو بچھڑے ہوئے بھائی مدتوں بعد ایک دوسرے سے مل رہے ہوں۔

بعد میں پتہ چلا کہ وہ ترک پہلوان اس آوار خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس نے شامیل کی گرفتاری کے بعد وطن سے بھاگ کر ترکی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ آج بھی ان دونوں پہلوانوں کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہیں۔

ابا کی ایک یاد۔ ۱۹۳۹ء میں ابا کو ماسکو جانا پڑا جہاں انہیں ایک تمغہ دیا جانا تھا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ ابا جب کوٹ پر تمغہ لگائے گاؤں لوٹے تو گاؤں کے لوگوں کا ایک جلسہ بلایا گیا جسے ہماری زبان میں جماعت کہا جاتا ہے۔ یہاں لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے ماسکو کے سفر کا حال سنائیں، کریملن اور صدر میخائیل کالینن کے بارے میں جنہوں نے تمغات عطا کئے تھے اپنے تاثرات

کا اظہار کریں۔ ان سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ جس چیز سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہوں اسکا بھی ذکر کریں۔

ابا نے لوگوں کی فرمائش پوری کی۔ اور پھر فرمایا: ''سب سے زیادہ ناقابل فراموش بات یہ ہے کہ صدر کالینن نے میرا نام روسی قاعدے کے مطابق نہیں پکارا بلکہ آوار قاعدے کی پیروی کی۔ انہوں نے سداسا حمزہ کہا، گمزہ سداسا نہیں۔''

بزرگوں کو بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے سر ہلا ہلا کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

ابا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''آپ لوگوں کو میری زبانی یہ واقعہ سن کر خوشی ہورہی ہے تو سوچئے کہ جب کریملن میں کالینن کے یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑے ہونگے تو مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہوگی۔ میں ایمانداری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ان الفاظ سے اس قدر مسرت ملی کہ میں تھوڑی دیر کےلئے انعام پانے کی خوشی بھول گیا۔''

میں ابا کے احساسات پوری طرح سمجھ سکتا ہوں۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میں سوویت ادیبوں کے ایک وفد کے ساتھ پولینڈ گیا تھا۔ ہم لوگ وہاں شہر کراکوف کے ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ ایک صبح میرے کمرے کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ اس نے شستہ آوار زبان میں سوال کیا:

''کیا حمزۃ الرسول یہیں ٹھہرے ہیں؟''

مجھے بیک وقت تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔

''خدا آپ کے آبائی گھر کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آپ ایک آوار یہاں کراکوف میں کیسے؟''

مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ میں نے ان صاحب کو تقریباً کمرے کے اندر گھسیٹ لیا۔ اور پھر جو باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو سارا دن بیت گیا اور شام بھی ڈھل چلی مگر ہماری گفتگو جاری رہی۔

لیکن معزز مہمان آوار نہ تھے وہ پولستانی تھے، ایک عالم جنہوں نے داغستانی زبانوں اور ان کے ادب کا خاصا مطالعہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے ہٹلر کے ایک تعزیری کیمپ میں اپنے ساتھی

دو قیدیوں سے جو آوارستان کے باشندے تھے پہلی بار آوار زبان سنی تھی۔ انہیں یہ دونوں آوار قیدی بھی پسند آئے اور انکی زبان بھی، چنانچہ انہوں نے اسکا مطالعہ شروع کیا۔ آوار قیدیوں میں سے ایک کا تو اسی زمانے میں انتقال ہو گیا، دوسرا آدمی زندہ رہا سوویت فوج کے ہاتھوں اسے نجات ملی اور آج بھی زندہ ہے۔

ہم آوار زبان میں ہی گفتگو کرتے رہے جو مجھے انتہائی غیرمعمولی اور عجیب سی بات محسوس ہوتی تھی۔ میں نے اپنے اس نئے دوست اور ممتاز عالم کو داغستان آنے کی دعوت دی۔

باتیں تو دن بھر آوار زبان میں ہی ہوتی رہیں لیکن ہم دونوں کی زبان میں زبردست فرق تھا۔ انکی زبان میں ایک عالمانہ وقار تھا، وہ شستہ اور پاکیزہ زبان بول رہے تھے، بہت صحیح بلکہ یوں کہا جائے کہ ضرورت سے زیادہ صحیح زبان، جو بے کیفی کی حد تک صحیح تھی۔ انہیں زبان کی روانی اور برجستگی سے زیادہ گرامر کا خیال تھا، ترکیب صرفی اور جملوں کی ساخت کا، اور اس احتیاط میں وہ بھول گئے تھے کہ لفظوں کا بھی اپنا ایک وجود ہوتا ہے جیتا جاگتا وجود۔

میں ایک ایسی کتاب لکھنی چاہتا ہوں جس میں گرامر زبان کی پابند ہوگی، زبان گرامر کی نہیں۔

کیونکہ میں گرامر کو ایک ایسا مسافر سمجھتا ہوں جو کسی راستے پر پیدل چل رہا ہو اور ادب کو وہ مسافر جو گھوڑے پر سوار اسی راستے سے گذر رہا ہو۔ پاپیادہ مسافر گھوڑسوار سے درخواست کرے کہ وہ کچھ دیر کےلئے اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا لے اور گھوڑسوار اسے زین پر اپنے پیچھے بٹھالے۔ پیدل چلنےوالا رفتہ رفتہ ڈھیٹ بن جائے اور پھر گھوڑسوار کو زین سے نیچے ڈھکیل کر اسے ایڑ لگا دے۔ "یہ گھوڑا میرا ہے اور زین سے لٹکے تھیلوں میں جو سامان ہے وہ بھی میرا ہے۔"

میری مادری آوار زبان! تو میری دولت ہے، تو میرا وہ خزانہ ہے جسے میں برے دن کےلئے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، وہ تریاق ہے جو میری تمام بیماریوں سے مجھے نجات دلاتا ہے۔ گلوکار کا دل لے کر پیدا ہونےوالے کسی ایسے انسان کا جو گونگا ہو،

نہ پیدا ہوناہی زیادہ بہتر ہے۔ میرا دل نغموں سے لبریز ہے اور میرے پاس آواز بھی ہے۔ اور یہ آواز تو ہے، میری مادری زبان آوار! تونے مجھے چھوٹے سے بچے کی طرح انگلیاں پکڑا کر میرے گاؤں سے باہر نکالا ہے، اور قوموں کی وسیع و عریض دنیا میں پہنچایا ہے جنہیں میں نے اپنے وطن عزیز کی داستانیں سنائی ہیں۔ تو نے مجھے اس دیوقامت ہستی تک پہنچایا ہے جس کا نام ہے عظیم روسی زبان۔ وہ بھی میرے لئے مادری زبان کی حیثیت اختیار کر گئی ہے، اب اس نے میرا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا ہے اور مجھے دنیا کے تمام ملکوں کی سیر کرائی ہے۔ میں اسکا بھی احسان مند ہوں بالکل اسی طرح جس طرح اپنی رضاعی ماں ارادیریخ گاؤں کی اس عورت کا۔ پھر بھی مجھے اس بات کا پورا احساس ہے کہ میری ایک اپنی ماں بھی ہے جس نے اپنی کوکھ سے مجھے جنم دیا۔

کیونکہ گھر میں چولھا جلانے کےلئے تو کسی پڑوسی سے دیاسلائی مانگی جاسکتی ہے لیکن اگر آپ کو اپنے دل میں جوالا بھڑکانی ہو، حرارت پیدا کرنی ہو تو اسکے لئے کسی بھی دوست سے مانگی ہوئی دیاسلائی کام نہیں آسکتی۔

لوگ مختلف زبانیں بول سکتے ہیں ان کے دل ایک ہونے چاہئیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے بہت سارے دوست گاؤں چھوڑ کر شہروں میں آباد ہوگئے ہیں، اس میں کوئی ہرج نہیں ہے، چڑیوں کے بچے بھی اس وقت اپنے گھونسلے چھوڑ دیتے ہیں جب ان کے پر مضبوط ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں ان دوستوں کے بارے میں کیا کہوں جو بڑے شہروں میں رہتے ہیں اور اپنی مادری زبان میں نہیں کسی دوسری زبان میں اپنے تاثرات و تخیلات کا اظہار کرتے ہیں؟ یقیناً یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے ان پر لعنت ملامت کا کوئی حق حاصل نہیں، پھر بھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ ایسے لوگ ہیں جو ایک ہی ہاتھ میں دو تربوز اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں نے ان بیچاروں سے باتیں کی ہیں اور یہ دیکھا ہے کہ اب وہ لوگ جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ آوار تو یقیناً نہیں ہے لیکن روسی بھی نہیں۔ ایسے لوگوں سے مل کر مجھے وہ جنگل یاد

آجاتا ہے جو اپنے نگہبانوں کی غفلت اور عدم توجہی کا شکار ہو گیا ہو۔

بیشک میں نے کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جنہوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان کی مادری زبان کا سرمایہ بہت قلیل اور قطعی غیر اہم ہے، کسی ایسی زبان کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے جسکے پاس الفاظ کا سرمایہ زیادہ ہو اور جسکی اپنی اہمیت بھی ہو۔ لیکن اس طرح کے لوگوں کا بھی وہی حشر ہوا ہے جو آوار کی ایک لوک کتھا میں ایک بکری کا۔ وہ جنگل اس لئے گئی تھی کہ بھیڑیئے جیسی دم لے کر لوٹے اور واپس آئی تو اپنی سینگیں بھی کھو چکی تھی۔

یا پھر یہ لوگ پالتو بطخوں جیسے ہیں، جو تیرنا بھی جانتی ہیں اور غوطے لگانا بھی، لیکن مچھلی کی طرح نہیں۔ وہ تھوڑا بہت اڑ بھی لیتی ہیں لیکن اتنا نہیں جتنا آزاد پرندے، وہ گا بھی لیتی ہیں، لیکن بلبل کی طرح نہیں۔ وہ کر تو سب کچھ لیتی ہیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح کرنا چاہئے۔

''کہئے! کیا حال چال ہے؟،، میں نے ایک بار ابوطالب سے پوچھا۔

''بس یوں ہی، نہ تو بھیڑیئے کی طرح اور نہ ہی خرگوش کی مانند، بس بین بین۔،، یہ کہہ کر انہوں نے ایک لمحہ توقف کیا اور پھر بولے: ''یہ بین بین کی کیفیت ادیب کے لئے سب سے خراب ہے۔ اسے یا تو اس بھیڑیئے کی طرح محسوس کرنا چاہئے جو کسی خرگوش کو ھضم کر چکا ہو یا اس خرگوش کی طرح جس نے پیچھا کرتے بھیڑیئے کے خونی پنجوں سے اپنی جان بچالی ہو!،،

اپنی نوٹ بک سے۔ ایک بار پڑوسی گاؤں سے کچھ نوجوان ابا کے پاس آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک گلوکار کی مرمت کرکے آرہے ہیں۔

''آپ لوگوں نے اسکی مرمت کیوں کی؟،، ابا نے سوال کیا۔

''وہ گانے میں بڑے نخرے دکھا رہا تھا - کبھی جان بوجھ کر کھانسنے لگتا، کبھی الفاظ بگاڑ دیتا، کبھی پاگلوں کی طرح چیخنے لگتا اور کبھی کتے کی طرح بھونکنے لگتا - غرض اسنے گیت کا ستیاناس کر دیا تھا، اس لئے ہم لوگوں نے اسکی مرمت کر دی - ''

''آپ لوگوں نے اسکی مرمت کس چیز سے کی؟''

''ہم میں سے کچھ لوگوں نے پیٹیاں استعمال کیں، باقی لوگوں نے گھونسے - ''

''آپ لوگوں کو کوڑے بھی مارنے چاھئے تھے، خیر یہ بتائیے کہ آپ نے اسکے جسم کے کس حصے کو نشانہ بنایا؟''

''زیادہ‌تر اسکا نچلا دھڑ ھمارا نشانہ بنا، لیکن کچھ لوگوں نے اسکی گردن پر بھی وار کئے - ''

''لیکن ساری غلطیوں کی جڑ تو گلوکار کا سر ھی تھا - ''

یاد کی ایک اور جھلک - اب اسی طرح کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا ھے، تو وہ بھی کیوں نہ سنا دوں؟ مخاچ‌قلعہ میں ایک آوار گلوکار رھتے ھیں - میں ان کا نام نہیں لونگا کیونکہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہ بہرحال کہانی پڑھ کر سمجھ ھی جائینگے - موصوف اکثر ھمارے یہاں آیا کرتے تھے، اپنی بنائی ھوئی دھنوں پر ابا سے گانے لکھواتے - ابا ان کی بات مان لیتے اور یوں گیت الفاظ کا روپ اختیار کر لیتے -

ایک دن ھم سب چائے پی رھے تھے تبھی ریڈیو پر اعلان ھوا کہ فلاں مشہور مغنی گانا گائینگے جس کے بول سدا باسی حمزہ نے لکھے ھیں - ھم سب سننے لگے، ابا بھی متوجہ ھو گئے - لیکن جیسے جیسے ھم سنتے گئے ھماری حیرت بڑھتی گئی - گلوکار صاحب گیت کے بول کچھ اس طرح ادا کررھے تھے کہ ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رھا تھا - صرف کچھ چیخیں سنائی دے رھی تھیں - گیت کے الفاظ وہ اس طرح گھونٹ لیتے جیسے مرغی پہلے دانہ بکھیرتی ھے اور پھر چن‌چن کر ایک ایک دانہ کھاتی ھے -

بعد میں جب ابا سے ان کی ملاقات ھوئی تو ابا نے پوچھا کہ انہوں نے الفاظ کی یہ گت کیوں بنائی -

''میں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا تھا۔ میں نہیں چاھتا کہ کوئی دوسرا آدمی گیت کے بول سمجھ سکے اور اسے یاد رکھ سکے،، موصوف نے جواب دیا۔ ''اگر ھمارے علاقے کے دوسرے گلوکاروں نے گیت کے الفاظ یاد کر لئے تو وہ بھی میرا کایا ھوا گیت گانے لگینگے، میں یہ چاھتا ھوں کہ اس گیت پر میری اجارہ‌داری برقرار رہے۔،،

کچھ دنوں بعد ابا نے دوستوں کی دعوت کی۔ اس دعوت میں گلوکار صاحب بھی مدعو تھے۔ دعوت ختم ھونے پر آئی تو ابا نے دیوار سے کمز اتارا، جس کا صرف ایک ھی تار سلامت تھا اور وہ بھی کسا ھوا نہ تھا۔ اور اس ٹوٹے پھوٹے ساز پر انہوں نے گانا شروع کیا جسکی دھن گلوکار موصوف نے تیار کی تھی۔ الفاظ تو بہت واضح تھے لیکن ایک تو ٹوٹے ھوئے ساز نے دھن کی مٹی پلید کر دی تھی اور پھر ابا کچھ بگاڑ کر گا بھی رہے تھے۔ گلوکار صاحب چراغ پا ھو اٹھے، انہوں نے احتجاج کرتے ھوئے کہا کہ ان کی دھن ایک ٹوٹے اور ڈھیلے ڈھالے ساز پر نہیں بجائی جا سکتی کیونکہ اس طرح موسیقی کا حسن اور اسکی دلکشی مجروح ھوتی ہے۔

''میں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے،، ابا نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا۔ ''تاکہ دوسرے لوگ تمہاری دھن نہ سمجھ سکیں۔ اگر کوئی ایسا گانا کامیاب سمجھا جا سکتا ہے جس میں ایک لفظ بھی پلے نہ پڑے تو وہ گانا بھی کامیاب ھی سمجھا جائے گا جسکی دھن اور جسکی موسیقی سمجھ میں نہ آتی ھو۔،،

داغستانی ادیب دس زبانوں میں کتابیں لکھتے ھیں لیکن یہ کتابیں صرف نو زبانوں میں شایع ھوتی ھیں۔ اس صورت میں وہ لوگ کیا کرتے جو دسویں زبان میں کتابیں لکھتے ھیں؟ اور یہ بھی سوال ہے کہ یہ کس قسم کی زبان ہے؟

یہ دسویں زبان وہ ہے جسکا استعمال وہ لوگ کرتے ھیں جو اپنی مادری زبان چاھے وہ آوار ھو، تات ھو یا لاک بھول چکے ھیں لیکن ساتھ ھی ساتھ کوئی دوسری زبان بھی اب تک اچھی طرح

سیکھ نہیں پائے ہیں، یہ لوگ بیک وقت دو اسٹولوں کے درمیان بیٹھے ہوئے ہیں۔

اگر آپ کو کسی دوسری زبان پر اپنی مادری زبان سے زیادہ قدرت حاصل ہے تو آپ شوق سے اس زبان میں تخلیقی کام کیجئے یا پھر اگر آپ کسی دوسری زبان سے اچھی طرح واقف نہیں تو اپنی مادری زبان میں لکھئے۔ مگر خدا کےلئے دسویں زبان میں لکھنے کی کوشش نہ کیجئے۔

بیشک میں دسویں زبان کا مخالف ہوں۔ زبان کو ایک قدیم ورثے کا مالک ہونا چاھئے، اسکی عمر ھزارھا سال کی ہونی چاھئے کیونکہ اسی وقت یہ زبان تخلیقی کاوشوں کی متحمل ہو سکتی ہے۔

یقیناً زبان بدلتی رہتی ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ تبدیلی بالکل اسی طرح ہوتی ہے جیسے درخت ہر سال اپنی پتیاں بدل دیتے ہیں، بعض پتیاں سوکھ جاتی ہیں، اور گر جاتی ہیں، دوسری پتیاں انکی جگہ لینے کےلئے ابھر آتی ہیں۔ لیکن پیڑ اپنی جگہ قائم رہتا ہے، سال گذرتے جاتے ہیں اور ہر گذرتے ہوئے سال کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ توانا، زیادہ تنومند اور زیادہ خوبصورت بنتا جاتا ہے اور پھل دیتا جاتا ہے۔

میں آپکی خدمت میں اپنی نظمیں اور اپنی کتابیں پیش کررھا ہوں، یہ وہ پھل ہیں جو آوار زبان کے چھوٹے لیکن قدیم پیڑ پر پھلے ہیں۔

میری مادری زبان

خواب اکثر عجیب ہوتے ہیں
رات میں نے بھی خواب دیکھا ہے
موت کا خواب، اپنی موت کا خواب
دوپہر، دھوپ، جلجلاتے پہاڑ
میں ہوں، سینے میں زخم گولی کا
سانس لینا بھی اک قیامت ہے

پاس ہی بہہ رہی ہے ایک ندی
میری حالت سے بےخبر اور میں

اپنے ہی دیس کی زمیں پہ پڑا
اس کی مٹی میں ملنے والا ہوں

مرنے والا ہوں، پر کسے ہے خبر
کون آئے گا دفن کرنے کو
سر پہ منڈلا رہے ہیں چند عقاب
پاس گھاٹی میں شور برپا ہے

کوئی ایسا نہیں جو غم میں مرے
میری ناوقت موت پر رو دے
نہ تو ماں ہے، نہ دوست ہیں، نہ حبیب
نوحہ خوانان پیشہ‌ور بھی نہیں

اور یوں اس اجاڑ وادی میں
جھلملاتا ہے زندگی کا چراغ
یک بیک پاس ہی سے آتی ہے
رہنوردوں کی ڈوبتی آواز
میرے کانوں میں گونج اٹھتے ہیں
میری اپنی زبان کے الفاظ

تپتی دھرتی پہ، مر رہا ہوں میں
ہاں مگر یہ کہ اپنے دیس میں ہوں
اور وہ مجھ سے بےخبر راہی
باتیں کرتے گذرتے جاتے ہیں
لب پہ قصہ کسی حسین کا ہے
جس نے احمق بنایا تھا سب کو

موت اور زیست کے دوراہے پر
میری آواز کے حسیں الفاظ
یوں ہیں جیسے کہ جام آب حیات
اور بس یہ دوا ہی کافی ہے

دوسروں کی زبان بھی یوں ہی
ان کے حق میں ہے جام آب حیات
مٹنے والی ہو کل جو میری زبان
آج ہی مجھ کو موت آجائے

مجھ کو اپنی زبان پیاری ہے
لاکھ کوئی اسے حقیر کہے
عالمی محفلوں میں جا نہ ملے
میرا دل تو مقام ہے اس کا

مجھ کو اکثر یہ وہم ہوتا ہے
کیا مرے بعد قوم کے بیٹے
اپنے محمود کا حسین کلام
کوئی معمولی ترجمہ لے کر
اپنے اخلاف کو سنائینگے؟

کیا یہی ہے مرے مقدر میں
اپنی آوار، اپنی پیاری زباں
آخری بار ادب کی صورت میں
پیش کردوں، خموش ہو جاؤں؟
زندگی بھی مجھے بہت ہے عزیز
اور یہ بے کنار دنیا بھی
ابن آدم! ترا یہ قصر عظیم
اس کا ہر گوشہ مجھ کو پیارا ہے

ھاں مگر سب سے زیادہ الفت ہے
سوویت سرزمین سے مجھ کو
جسکا مطرب ہوں، جسکا شاعر ہوں
جسکے میں گیت گنگناتا ہوں
اپنی آوار میں، جو ماں سے ملی
سارا زور قلم لگاتا ہوں

ہے چکوتکا سے بالٹک تٹ تک
پھیلی، بکھری زمیں عزیز مجھے
اور میں اس زمیں کے قدموں پر
زندگی بھی نثار کر دوں گا
بس فقط اتنی التجا ہے مری
موت کے بعد دفن کی خاطر
مجھ کو دوگز زمیں جو ملنی ہے
وہ یہاں میرے گاؤں میں مل جائے

تا کہ جب میرے گاؤں کے بیٹے
قبر پر آئیں، تو یہ کہہ پائیں
اس میں سوتا ہے، وہ رسول اپنا
اپنے حمزہ کا جانشیں تھا جو
باعث فخر و آفریں تھا جو

اپنی نوٹ‌بک سے۔ پہاڑی علاقوں میں ایک نوجوان تھا جو ایک روسی لڑکی سے شادی کرنا چاھتا تھا، مگر اس کے والدین اس شادی کے سخت مخالف تھے۔ معلوم ایسا ھوتا ہے کہ اس لڑکی کو اس آوار نوجوان سے بےحد محبت تھی کیونکہ ایک دن اسے اپنی محبوبہ کا خط ملا جو آوار زبان میں تھا۔ اس نے فوراً یہ خط اپنے والدین کو دکھا دیا، پہلے تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ھی نہیں آیا، بعد میں وہ اس قدر متاثر ھوئے کہ اسی وقت انہوں نے اپنے بیٹے کو اس شادی کی اجازت دیدی۔

اپنی نوٹ‌بک سے۔ ایک ادیب کےلئے زبان کی حیثیت وھی ہے جو کسان کےلئے فصل کی ھوتی ہے۔ ھر بالی میں لاتعداد دانے ھوتے ھیں اور بالیاں اتنی ھوتی ھیں کہ ان کا شمار کرنا بھی مشکل ھوتا ہے۔ لیکن اگر کسان کاھلوں کی طرح اپنی جگہ بیٹھا محض اپنی فصل کو ٹک‌ٹک دیکھتا رہے تو اسے ایک دانہ بھی نہیں مل سکتا۔ رئی کی فصل تیار ھوجائے تو اسے کاٹنا چاھئے، پھر گاھنا چاھئے، لیکن کام یہاں بھی ختم نہیں ھو جاتا، اسکے بعد بھوسا اڑا کر دانہ الگ کرنے کی منزل آتی ہے، پھر

دانہ پیسا جاتا ہے جس سے آٹا ملتا ہے، اب آٹا گوندھا جاتا ہے اور تب کہیں جا کر روٹی پکنے کی نوبت آتی ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں غالباً اہم‌ترین بات جو یاد رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ روٹی کی ضرورت کتنی ہی کیوں نہ ہو، سارے دانے ختم نہ کرنا چاہئے ۔ کسان ہمیشہ سب سے اچھے دانے بیج کےلئے محفوظ رکھتا ہے ۔

الفاظ سے کام لینے‌والا ادیب بھی کسان ہی کی طرح ہوتا ہے ۔

لوگ کہتے ہیں: کچھ بچوں نے ایک پیڑ کاٹ کر گرا دیا، اور اس پر مینے کا جو گھونسلا تھا اسے اجاڑ دیا ۔

''پیڑ ! پیڑ ! مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیوں کاٹا گیا؟،،

''کیوں‌کہ میں ان سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا ۔ ،،

''مینا! مینا! تیرا گھونسلا کیوں اجاڑا گیا؟،،

''اس لئے کہ میں شور بہت مچاتی تھی ۔ ،،

لوگ یہ بھی کہتے ہیں: لفظ بارش کی طرح ہیں ۔ پہلی بار کی بارش رحمت ہوتی ہے، دوسری بار کی مفید، تیسری بار کی غنیمت اور چوتھی دفعہ یہی بارش جو کبھی رحمت تھی، لعنت بن‌جاتی ہے ۔



موضوع

دروازہ توڑنے کی ضرورت نہیں، کنجی کے ذریعے
بڑی آسانی سے کھل جاتا ہے۔
(ایک کتبۂ در)

یہ مت کہو کہ "مجھے موضوع بتائیے"۔
یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ "مجھے آنکھیں
عطا کیجئے"۔
(ایک نوجوان ادیب کو نصیحت)

"عزیز ساتھیو! میرے دل میں کچھ لکھنے کی تڑپ ہے، میں لکھنا چاہتا ہوں، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کس موضوع پر لکھوں۔ آپ مجھے کوئی اچھاسا موضوع بتا دیجئے، میں اس پر ایک شاندار کتاب لکھ دونگا۔"

وہ ادیبوں کی یونین ہو، یا اخبار و رسائل کی مجلس ادارت کے دفاتر، یا انفرادی طور پر ممتاز ادیب، نوجوانوں کی طرف سے اس طرح کے خطوط کا موصول ہونا ایک معمول بن گیا ہے۔ اس طرح کے خطوط مجھے بھی ملتے رہتے ہیں اور ابا کے پاس بھی

آیا کرتے تھے۔ ابا کو جب کوئی ایسا خط ملتا تو وہ سر ہلا کر کہا کرتے:

''یہ نوجوان شادی کرنا چاہتا ہے۔ البتہ مصیبت یہ ہے کہ شادی کس کے ساتھ کرے۔ کوئی خاص لڑکی اس کے پیش نظر بھی نہیں، اب سوال یہ ہے کہ پیغام بھیجا جائے تو کہاں؟''

یاد کی ایک جھلک۔ ایک بار داغستانی ادیبوں کی یونین کو ابوطالب کا ایک خط ملا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ دوردراز کے ایک پہاڑی گاؤں میں کچھ مواد جمع کرنے کی غرض سے جانا چاہتے ہیں، ان کےلئے ایک ماہ کے قیام کا انتظام کردیا جائے۔ بورڈ کے سامنے شاعر کی یہ درخواست پیش ہوئی، تو ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ کن موضوعات پر لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یہ سنتے ہی معمر شاعر کو غصہ آ گیا:

''کیا کسی شکاری کو پہلے سے یہ علم ہوسکتا ہے کہ وہ کس چیز کا شکار کرےگا، خرگوش کا، ھنس کا، بھیڑیئے کا یا لومڑی کا؟ کیا کسی سورما کو پہلے ہی سے اس بات کی خبر ہوسکتی ہے کہ جنگ میں وہ کس قسم کا کارنامہ انجام دےگا؟''

اس جلسے میں میں بھی موجود تھا اور ابوطالب کے یہ الفاظ میرے ذہن پر امٹ نقوش چھوڑ گئے۔

جب لوگ کسی ادیب پر اس طرح کے سوالوں کی بوچھار کرنے لگتے ہیں کہ آئندہ چند برسوں کے لئے لکھنے لکھانے کا اس نے کیا پروگرام بنایا ہے تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادیب کے ذہن میں ایک عام خاکہ ہوتا ہے، اس کام کا جسے وہ انجام دینا چاہتا ہے۔ غالباً یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے ذہن میں یہ فیصلہ کر چکا ہو کہ اسے ایک ناول لکھنا ہے یا ایک سلسلے کے تین ناول، مگر جہاں تک اشعار کا سوال ہے... تو اشعار ذہن میں بغیر کسی اطلاع اور ارادے کے آتے ہیں جیسے اچانک کوئی تحفہ آجائے۔ شاعر کی دنیا بندھے ٹکے قواعد سے آزاد ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص پہلے سے یہ پروگرام نہیں بنا سکتا کہ آج صبح دس بجے میں اس لڑکی کی

محبت میں مبتلا ہو جاؤنگا جو مجھے کسی سڑک پر نظر آئے گی یا کل شام کو پانچ بجے میں فلاں بدمعاش سے نفرت کرنے لگونگا۔

شاعری ان پھولوں کی طرح نہیں ہے جو کسی گلاب باڑی میں کھلے ہوں یا سدابہار پھولوں کے کسی چمن کی زینت ہوں جہاں ہر چیز آپ کے سامنے ہوتی ہے اور آپکو کوئی چیز تلاش نہیں کرنی پڑتی۔ شاعری تو ان خودرو پھولوں کی طرح ہے جو کسی میدان میں یا پہاڑ کی کسی وادی میں کھلتے ہیں، جہاں ہر قدم پر آپ کو نت‌نئے اور پہلے سے زیادہ خوبصورت پھول نظر آسکتے ہیں۔

جذبات سے موسیقی جنم لیتی ہے اور موسیقی سے جذبات۔ اس میں اولیت کسے حاصل ہے؟ آج تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا ہے کہ پہلے انڈا پیدا ہوا یا مرغی؟ ٹھیک اسی طرح یہ سوال بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ ادیب موضوع کو جنم دیتا ہے یا موضوع ادیب کو ؟ موضوعات ادیب کی دنیا ہوتے ہیں، وہ ادیب کی مکمل شخصیت کے آئینہ‌دار ہوتے ہیں۔ موضوع نہ ہو تو ادیب بھی نہ ہوگا۔ ہر ادیب کے پاس اسکا اپنا موضوع ہوتا ہے۔

خیالات و احساسات چڑیوں کی طرح ہیں اور موضوع ان کا آسمان ہے۔ خیالات و احساسات ہرنوں کی طرح ہیں اور موضوع ان کا جنگل ہے۔ خیالات و احساسات سانبھر ہیں اور موضوع پہاڑ۔ خیالات و احساسات راستے ہیں اور موضوع وہ شہر جہاں یہ راستے پہنچاتے ہیں اور آپس میں ملتے ہیں۔

میرا وطن میرا موضوع ہے۔ اور مجھے ضرورت نہیں کہ میں اس موضوع کو تلاش کروں یا پسند کروں۔ ہم اپنا وطن پسند کرنے نہیں نکلتے بلکہ ہے یوں کہ وطن ابتدا سے ہی ہمارا انتخاب کر لیتا ہے۔ کوئی عقاب ایسا نہیں ہوتا جسکا آسمان نہ ہو، ہر پہاڑی بکرے کی ایک اپنی چٹان ہوتی ہے، ٹراؤٹ مچھلی اگر ہوگی تو صاف پانی کا ایک تیزرو دھارا بھی ہوگا۔ ہر ہوائی جہاز کا ایک اڈہ بھی ہوتا ہے، بالکل اسی طرح کوئی ادیب ایسا نہیں ہوتا جس کا وطن نہ ہو۔

مرغی‌خانے کے صحن میں مرغیوں کے ساتھ ٹہلنے‌والا عقاب، عقاب نہیں رہ جاتا۔ اگر ارنابھینسا پالتو بھیڑوں کے ساتھ

گھاس چر رہا ہو تو اسے ارنابھینسا نہیں کہا جا سکتا۔ حوض میں تیرنےوالی پالتو ٹراوٹ مچھلیاں ٹراوٹ نہیں رہ جاتیں، عجائب گھر میں رکھا ہوا ہوائی جہاز بھی کوئی ہوائی جہاز!
ٹھیک اسی طرح کوئی بلبل ایسی نہیں ہوتی جو ہزار داستان نہ ہو۔

موضوع سے متعلق کچھ اور باتیں۔ مجھے بچپن سے ہی ایک خاص منظر بہت پسند رہا ہے۔ جب بھی میں ابا کے گھر کی ایک چھوٹی سی کھڑکی کھولتا، میری آنکھوں کے سامنے لمباچوڑا سرسبز میدان آجاتا جیسے کاؤں کے قدموں میں دسترخوان سا بچھا ہو۔ میدان کے چاروں طرف کھڑی چٹانیں یوں لگتیں جیسے اس دسترخوان پر جھک پڑ رہی ہوں۔ پہاڑوں کے درمیان، لہراتی، بل کھاتی پگڈنڈیاں دیکھ کر مجھے سانپوں کا خیال آتا جبکہ غاروں کے دھانے یوں لگتے جیسے کوئی درندہ منہ پھاڑے کھڑا ہے۔ پہاڑ کی پہلی صف کے پیچھے ایک اور صف تھی، ان کی ہموار گول چوٹیاں دیکھ کر مجھے اونٹ کے کوہان کا خیال آجاتا۔
اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ سوئٹزرلینڈ یا نیپلس کے اردگرد اس سے کہیں زیادہ خوبصورت مقامات بھی موجود ہیں۔ لیکن میں چاہے جہاں بھی رہا ہوں اور چاہے کتنے ہی ہوش ربا مناظر سے میری آنکھیں دوچار ہوئی ہوں، میں نے ہر حال میں ان کا مقابلہ اس منظر سے کیا ہے جو میرے بچپن کی یادگار ہے، اس تصویر سے کیا ہے جو میرے مکان کی چھوٹی سی کھڑکی کے فریم میں جڑی ہوئی ہے اور اس موازنے کا نتیجہ ہر حال میں یہ ہوا ہے کہ مجھے دنیا کے سارے عجائبات اس منظر کے سامنے ہیچ نظر آئے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے میرا آبائی وطن اور اس کے اردگرد کا منظر باقی نہ رہ جائے، اگر اس کے نقوش میری یاد سے مٹ جائیں تو مجھے یہ پوری دنیا یوں لگے گی جیسے سینہ تو ہے لیکن اسکے اندر دھڑکتا ہوا دل نہیں، منہ تو ہے لیکن زبان سے محروم، آنکھیں تو ہیں لیکن پتلیاں نہیں اور گھونسلا تو اپنی جگہ ہے لیکن اس گھونسلے میں کوئی چڑیا نہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی قطعی نہیں ھیں کہ میرا موضوع میرے اپنے گاؤں اور اپنے گھر کے محدود چوکھٹے سے باھر نہیں نکلتا۔ اور نہ ھی اس سے یہ مطلب نکلتا ھے کہ میں نے اپنے بیش قیمت اور محبوب موضوع کے اردگرد اونچی اونچی فصلیں کھڑی کر رکھی ھیں۔

بعض کھیت ایسے ھوتے ھیں کہ جب ھل کی نوک مٹی کی بھاری پرت اتارتی ھے تو اسکے نیچے چکنی اور زرخیز مٹی ابھر آتی ھے۔ بعض میدان ایسے ھوتے ھیں کہ انکی اوپری پرت ذرا سی ھٹا دی جائے تو نیچے پتھریلی زمین نکل آتی ھے اور بعض میدان ایسے بھی ھوتے ھیں جن میں مٹی ھٹانے کی ضرورت ھی نہیں پڑتی کیونکہ اوپر ھی سے پتھر اور چٹانیں نظر آتی ھیں۔ اس طرح کی زمین پر ھل چلانے اور کاشت کرنے کا میرا قطعی ارادہ نہیں، کیونکہ میں جانتا ھوں کہ اس سے اگر پیداوار حاصل بھی ھوئی تو وہ اتنی کم ھوگی کہ شدید محنت کا بدل نہیں بن سکتی۔

میں اپنے وطن سے اپنی محبت کو اس طرح باندھ کر نہیں رکھنا چاھتا جیسے کسی ایسے گھوڑے کو جو دن بھر اپنا کام انجام دے چکا ھو پیر میں بندھن باندھ کر اور گلے میں ایک لمبی رسی ڈال کر چھوڑ دیا جاتا ھے تاکہ وہ ایک محدود دائرے میں گھوم پھر کر گھاس چر سکے۔ میں اپنے گھوڑے کی لگام اتار لیتا ھوں، پسینے میں بھیگی اسکی گردن تھپتھپاتا ھوں اور یہ کہہ کر چھوڑ دیتا ھوں: ''تھوڑی گھاس چرلے تاکہ تجھ میں دوبارہ تازگی پیدا ھوسکے۔ ،، میرے پاس وطن کا جو احساس ھے اس میں اتنا ھی سکون اور اتنی ھی وسعت ھے جتنی اس گھوڑے میں جسے گھاس چرنے کےلئے پوری طرح آزاد چھوڑ دیا گیا ھو۔

میں دنیا کے تمام مظاھر کو اپنے مکان، اپنے پہاڑی گاؤں، اپنے داغستان یا اپنے احساس وطنیت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاھتا۔ بلکہ مجھے دنیا کے تمام مظاھر میں اور اسکے کونے کونے میں اپنے ملک اور اپنے وطن کا احساس ھوتا ھے، اسکی جھلکیاں نظر آتی ھیں اور یوں میرا موضوع پوری دنیا کا احاطہ کر لیتا ھے۔

مجھے یاد ھے کہ ایک بار دوردراز اور خوبصورت شہر سانتیاگو میں مرغوں کی ککڑوں کوں کی آواز پر میری آنکھ کھلی۔

بیدار ہوا تو چند لمحوں کے لئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں سانتیا گو میں نہیں اپنے گاؤں اور اپنے گھر میں ہوں اور یوں سانتیا گو کے مرغے بھی میرے لئے ایک موضوع بن گئے۔

ایک بار مجھے جاپان میں حسن کا ایک مقابلہ دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ مقابلہ جاپان کے ایک انوکھے شہر کاما کورا میں ہوا تھا۔ جب مقابلے میں حصہ لینےوالی وہ خوبصورت دوشیزائیں ہمارے سامنے سے گذریں جن میں کسی ایک کو ملکۂ حسن منتخب ہونا تھا تو بےساختہ مجھے اپنی محبوبہ یاد آگئی جسے بہت دور آوارستان میں چھوڑ آیا تھا، اور ذہن ہی ذہن میں ان دوشیزاؤں کا موازنہ میں اپنی اس محبوبہ سے کرنے لگا۔ ان میں سے کسی ایک میں بھی وہ بات نظر نہ آئی جس نے مجھے اپنی محبوبہ کا گرویدہ بنادیا ہے لیکن اس طرح جاپان کی یہ حسینائیں اور خود منتخب ہونےوالی ملکۂ حسن بھی میرا موضوع بن گئی۔

نیپال میں اپنے سفر کے دوران بودھ مندروں اور شاہی محلوں سے نشاط دیدہ و دل حاصل کرنے اور ان ۲۲ چشموں کو دیکھنے کے بعد جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کی ساری بیماریوں، سارے دکھ درد اور ساری برائیوں کا علاج ان میں موجود ہے میں کٹھمنڈو کے ڈھلوان پہاڑوں پر چڑھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اپنا داغستان یاد آ گیا اور مجھے اتنی خوشی حاصل ہوئی اور سکون ملا کہ پرعیش محلوں اور مندروں کی شان و شوکت ہیچ نظر آنے لگی۔ مجھے فن‌تعمیر کے ان نادر اور پرکار نمونوں کے مقابلے میں یہ معمولی پہاڑ کہیں زیادہ دلکش اور پرسکون محسوس ہوئے اور مجھے یہ لگا کہ وہ شفابخش چشمے تو نہیں البتہ یہ پہاڑ ہیں جو تمام بیماریاں اور دل کی ساری برائیاں دور کر سکتے ہیں۔ یوں نیپال کے بودھ‌مندر اور پہاڑ بھی میرے لئے ایک موضوع بن گئے۔

ہندوستان کے بھرےپرے اور پرشور شہروں کی سیر کے بعد مجھے ایک چھوٹے سے گاؤں لے جایا گیا جو کلکتہ کے پاس واقع ہے۔ وہاں ایک وسیع کھلیان میں گاھنے کا کام پورے شباب پر تھا، گیہوں کی سنہری بالیاں زمین میں بچھی تھیں جن پر بڑی خاموشی اور اطمینان کے ساتھ بیل چکر لگا رہے تھے۔ میں نے دنیا

میں بہت سارے عجائب گھر اور تھیٹر دیکھے ہیں لیکن مجھے کبھی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی سنہری بالیوں کو پیروں سے روندنے والے ان آہستہ خرام بیلوں کو دیکھ کر۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے گاؤں میں ہوں اور زمانہ پیچھے لوٹتے ہوئے اس منزل پر جا پہنچا ہے جہاں آج کا میں، یعنی رسول محض ایک بچہ تھا۔ اور یوں کلکتہ کے قریب کا یہ گاؤں بھی میرا موضوع بن گیا۔

میں نے دیکھا ہے کہ انڈونیشیا کے پہاڑی علاقوں میں ڈھول اسی طرح بجتے ہیں جیسے میرے داغستان میں۔ نیویارک کی سڑکوں پر میری ملاقات ایسے قفقازیوں سے ہوئی ہے جو ہمارا قومی لباس ایک مخصوص طرح کا لمبا کوٹ پہنے تھے۔ مجھے استنبول اور پیرس میں ان داغستانیوں کے پژمردہ چہرے نظر آئے جنہوں نے خود جلاوطنی کی زندگی اختیار کر رکھی ہے، مجھے یہ لوگ دنیا میں سب سے زیادہ تباہ حال محسوس ہوئے۔ میں نے لندن کی ایک نمائش میں مٹی کے وہ برتن دیکھے جو ہمارے بلخاری دستکاروں کی کاریگری کے نمونے تھے۔ وینس میں لاک گاؤں تسونکرا کے مشہور نٹوں کو اپنے شاندار کرتب دکھاتے اور حاضرین کو ان کے کرتبوں پر عش‌عش کرتے دیکھا ہے۔ اور پیٹسبرگ کے شہر میں پرانی کتابوں کی ایک دکان پر مجھے شامیل کے بارے میں ایک کتاب نظر آئی۔

غرضیکہ میں جہاں جہاں گیا مجھے ایسے رشتے ضرور ملے جنکا ایک سرا میرے داغستان سے جا ملتا تھا۔

کسی سورما پر اگر بہت سارے دشمن ایک ساتھ حملہ کر دیں تو اس کے لئے جان بچانا مشکل ہو جائے گا کیونکہ وہ بیک وقت سامنے سے اور عقب سے ہونے والے حملوں سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر اسے کوئی ایسی چٹان مل جائے جسکا وہ سہارا لے کر عقب سے ہونے والے حملے سے محفوظ رہ سکے تو معاملہ کافی آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں ایک پھرتیلا اور ماہر شمشیرزن بیک وقت دو، بلکہ تین دشمنوں کا بھی مقابلہ کرسکتا ہے۔ داغستان میرے لئے ایک ایسی ہی چٹان ہے، میں اسکا سہارا

لے کر ساری دشواریوں کا مقابلہ کرسکتا ہوں اور مشکل‌ترین آزمائشیں جھیل سکتا ہوں۔

سیاح جب ملکوں کی سیاحت کے بعد وطن لوٹتے ہیں تو نت‌نئے گیت ساتھ لاتے ہیں۔ مگر میری مصیبت یہ ہے کہ میں چاہے جہاں بھی جاتا ہوں، جب واپس ہوتا ہوں تو میرے ساتھ داغستان ہی کے گیت ہوتے ہیں، جب میں کوئی نئی نظم کہتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں نے اپنے وطن کو نئے سرے سے جانا ہے، ایک نئے لحاظ سے سمجھا ہے اور اب میں پہلے کے مقابلے میں اس سے زیادہ محبت کرنے لگا ہوں۔ میرے لئے میرا وطن داغستان لامحدود اور بے کنار ہے۔

اپنی نوٹ‌بک سے۔

''عقاب! عقاب! تیرا پسندیدہ گیت کون‌سا ہے؟''

''فلک بوس پہاڑیاں۔''

''سمندری مرغابی! تو کس چیز کے بارے میں گیت گاتی ہے؟''

''نیلے گہرے سمندر کے بارے میں۔''

''پہاڑی گدھ! تیرا من‌پسند گیت کس چیز سے متعلق ہے؟''

''میدان جنگ میں پڑی لاشوں سے متعلق جو مجھے بےحد مرغوب ہیں۔''

ادب کی دنیا میں بھی پرندے ہوتے ہیں: وہاں بھی عقاب اور سمندری مرغابیاں پائی جاتی ہیں جو اپنی اپنی پسند کے مطابق پہاڑوں کے بھی گیت گاتے ہیں اور سمندروں کے بھی۔ ہر پرندہ اپنے وطن اور اپنے موضوع کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن اس دنیا میں پہاڑی گدھ بھی ہوتے ہیں، انہیں سب سے زیادہ اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے۔ پہاڑی گدھ جب میدان جنگ میں پڑی کسی لاش کی آنکھیں نکال رہا ہو تو اسے اسکی پرواہ نہیں ہوتی کہ یہ آنکھیں کسی سورما کی ہیں یا کسی بزدل کی۔ میں ایسے ادیبوں سے واقف ہوں جن کے سامنے صرف ایک چیز ہوتی ہے، وقتی فائدہ۔ آج وہ وہی کام انجام دینگے جو انہیں آج فائدہ‌مند لگ رہا ہو، اور کل وہ جسے وہ کل کےلئے مفید سمجھیں۔

موضوع سے متعلق کچھ اور باتیں۔ موضوع ایک ایسی الماری کی طرح ہے جس میں طرح طرح کا سامان بھرا ہو، الفاظ اس الماری کی کنجی ہیں، لیکن خیال رہے کہ یہ اسی وقت کارگر ہوسکتے ہیں جب الماری میں بھرا سامان آپ کی ملکیت ہو کسی اور کی نہیں۔

بعض ادیب ہر موضوع پر ہاتھ مارتے چلتے ہیں، کسی موضوع کی گہرائی میں جانے کی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ وہ صندوق کا ڈھکنا اٹھاتے ہیں، سب سے اوپر رکھی ہوئی چیزوں پر ہاتھ مارتے ہیں اور بھاگ لیتے ہیں۔ لیکن جو صندوق کا اصل مالک ہے اسے یہ خبر ہوتی ہے کہ اگر صندوق کا سارا سامان احتیاط کے ساتھ ایک ایک کرکے ہٹایا جائے تو بیش قیمت جواہرات کی وہ پٹاری ہاتھ آسکتی ہے جو سب سے نیچے رکھی ہوئی ہے۔

جو لوگ سوچے سمجھے بغیر ہر موضوع پر ہاتھ مارتے چلتے ہیں وہ اس دلا گولوف کی طرح ہیں جو پہاڑی علاقوں میں مشہور ہے۔ اسکی شہرت کی وجہ یہ ہے کہ اسے شادیاں کرنے کا بڑا شوق تھا، زندگی میں اس نے ۲۸ بیویاں کیں۔ لیکن آخرکار اس کی ایک بھی بیوی نہ رہی۔

لیکن اس بنا پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ موضوع کی حیثیت آپکی واحد قانونی بیوی یا اکلوتے بچے جیسی چیز ہے یا اس ماں جیسی جو ایک ہی ہوتی ہے۔ اور اسی لئے کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ ''یہ میرا اپنا موضوع ہے، صرف میرا موضوع، کوئی دوسرا اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہ کرے۔''

موضوع میرا ضرور ہے لیکن اس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔ میں نے ایک ادیب کو دوسرے ادیب سے محض اس لئے لڑتے دیکھا ہے کہ اس نے اسکا موضوع ''چرا لیا'' تھا۔ ''تمہیں ارجی کزاک (گذشتہ صدی کے کومیک شاعر جنہیں کومیک ادب کا بانی کہا جاتا ہے) کے بارے میں لکھنے کی اجازت کس نے دی؟'' اس ادیب نے دوسرے ادیب کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ میرا موضوع ہے۔ ارجی کزاک پر لکھنے کا اگر کسی کو حق ہے تو صرف مجھے۔

یہ تو کھلی ہوئی ڈکیتی ہوئی!،، ادیب صاحب اتنے غصے میں تھے جیسے کوئی انکی محبوبہ کو لے بھاگا ہو۔

موصوف کو جو جواب ملا وہ پہاڑی علاقے کا ہی کوئی آدمی دے سکتا تھا:

''سالار وہی بن سکتا ہے جسکی تلوار تیز بھی ہو اور آبدار بھی۔ ہر پیغام دینےوالا دولہن کا مالک نہیں بن جاتا، شوہر تو وہی ہوتا ہے جو اس کے ساتھ شادی کرے۔ ہر موضوع کی طرح ارچی کزاک بھی موضوع کے لحاظ سے اسکی ملکیت ہوگا جو اس کے بارے میں سب سے اچھی کتاب لکھ سکے۔،،

یقیناً کسی ایک ہی موضوع پر ایک دوسرے سے قطعی آزادانہ طور پر بیک‌وقت کئی ادیب قلم اٹھا سکتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں پنچائتی فارم نہیں ہوسکتے۔ یہاں تو ہر ادیب کا اپنا کھیت ہوتا ہے اور اپنا قطعہ، وہ چاہے کتنا ہی تنگ کیوں نہ ہو۔ لیکن میں کسی دوسرے کو اپنے کھیت میں اترنے سے محض اس لئے نہیں روکونگا کہ میں نے ایک عرصے سے اسے چھوڑ رکھا ہے۔ آپ کو میرے کھیت کی سرحدوں پر نہ چوکیداری کے لئے کتے نظر آئینگے اور نہ کوئی ایسا چوکیدار جس کے ہاتھوں میں بندوق ہو۔ اور بات تو یہ ہے کہ میرے کھیت کی سرحدیں ہیں بھی کہاں اور ان کا تعین کیا جائے تو کیسے؟ میرا موضوع نہ تو کوئی ایسی وادی ہے جس پر کسی کی نجی ملکیت ہو اور نہ مسجد کا وہ متبرک مقام جہاں کسی غیر کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

ایک بار داغستانی ادیبوں کی ایک کانگرس میں ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی۔

''داغستانی ادیب دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں کے بارے میں کیوں لکھیں؟،، ایک مقرر نے سوال اٹھایا۔ ''اسپین کے رھنےوالے اسپین کے بارے میں لکھیں، جاپانی جاپان کے بارے میں اور جو لوگ اورال کے علاقے میں رھتے ہیں وہ اس علاقے کی صنعتوں پر قلم اٹھائیں۔ مان لیجئے کہ ایک باغ میں کسی چڑیا نے اپنا گھونسلا بنا رکھا ہے تو کیا وہ گانے کےلئے کسی دوسرے باغ جائےگی؟ کیا کسی ایسی وادی میں جہاں زرخیز زمین کافی

سے زیادہ موجود ہو پتھریلی پہاڑیوں سے مٹی لے جانا مناسب ہوگا؟ کیا کسی چربیدار دنبے کی دم پر تلنے سے پہلے مکھن لگانا ضروری ہے؟،،

ان باتوں کا جواب جن ادیب نے دیا وہ ایک دوسری جمہوریہ سے آئے تھے، انہوں نے کہا:

''جس طرح چڑیا کے پاس گھونسلا ہوتا ہے، اسی طرح جنگلی جانور کے پاس اسکی ماند ہوتی ہے۔ لیکن سورج چمکتا ہے تو سارے جانور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور پانی برستا ہے تو سبھی پیڑ اس میں بھیگتے ہیں۔ دھنک نکلتی ہے تو اسے سبھی دیکھتے ہیں۔ بجلیاں اونچے پہاڑوں پر بھی چمکتی ہیں اور گہری گھاٹیوں میں بھی۔ کسی دوردراز ملک کے بازار میں خریدے گئے چاول سے بھی مزیدار پلاؤ پکایا جا سکتا ہے۔ میں بہت دور سے آپکی کانگرس میں شرکت کے لئے آیا ہوں۔ میں محض آپکو مبارکباد دینے آیا تھا۔ لیکن آپکے پہاڑوں اور آپ کے سمندر سے پیار کرنے لگا ہوں، آپ کے یہاں کے نیک دل لوگوں اور آپ کی خوبصورت اور باوقار عورتوں کی قدر میرے دل میں پیدا ہو گئی ہے۔ اگر میں آپ لوگوں کے بارے میں کچھ لکھوں تو میرے وطن کے لوگ میرا شکریہ ادا کرینگے اور اگر آپ ہمارے علاقے کے بارے میں لکھیں تو اس سے بھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ محبت کی طرح ادیب کا انتخاب بھی آزاد ہوتا ہے۔ کیا محبت دل میں داخل ہونے کےلئے کسی اجازت کی طلب گار ہوتی ہے؟،،

کانگرس میں اس مہمان کا تالیوں کی گونج کے ساتھ خیرمقدم کیا گیا جسکے الفاظ تیر کی طرح سیدھے اور تیز تھے لیکن ایک طرف تو میں تالیاں بجا رہا تھا اور مقرر کے الفاظ سے قریب قریب متفق ہوتا جا رہا تھا، دوسری طرف بعض خیالات تھے جو میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔

دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں کے بارے میں لکھنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ آپ کو اپنے موضوع پر پوری گرفت حاصل ہو۔

میرا چھوٹا سا داغستان اور میری وسیع و عریض دنیا۔ دو پہاڑی چشمے ہیں جو وادی تک پہنچتے پہنچتے آپس میں مل کر

ایک دھارے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ آنسو کے دو قطرے جو دو آنکھوں سے ٹپکتے ہیں، دو رخساروں پر مچلتے ہیں لیکن غم یا مسرت کے ایک ہی جذبے کی پیداوار ہیں۔

دو آنکھوں سے
آنسو کے دو قطرے
شاعر کے رخسار پہ ڈھلکے
اک قطرے میں غصے کی بو
اک قطرے میں پیار کی خوشبو
اک قطرہ غم کا مظہر
اک میں خوشی کا پیکر

آنسو کے دو قطرے
چھوٹے قطرے،
جیسے دو بلور کے منکے
دو قطرے، معمولی قطرے
تنہا تنہا، بہتے جائیں
بے کس، بے بس، قطرے کہلائیں
لیکن جب یہ مل جائیں
چمکیں جیسے بجلی چمکے
برسیں جیسے پانی برسے

میرا چھوٹا سا داغستان اور میری وسیع و عریض دنیا۔ یہ دونوں میری زندگی ہیں، میرا نغمہ ہیں، میری کتاب ہیں۔ ہاں، یہ دونوں میرا موضوع ہیں۔

جو عقاب اپنی اونچی چٹانوں سے اڑ کر نیچے حدنظر تک پھیلے ہوئے میدانوں میں نہیں اترتا وہ عقاب کمزور ہے۔

اسی طرح جو عقاب حدنظر تک پھیلے ہوئے میدانوں سے اڑ کر اپنی اونچی چٹانوں کو واپس نہیں آتا اسے بھی کمزور ہی کہا جاتا ہے۔

عقاب کے لئے یہ کوئی دشوار کام نہیں کیونکہ وہ پیدا ھی عقاب ھوا ھے اور اگر وہ چاھے بھی تو نہ سمندری مرغابی بن سکتا ھے، نہ پہاڑی گدھ۔ لیکن ادیب کےلئے عقاب بننا بہت مشکل ھے، اگر وہ اس دلیر اور شریف پرندے کی خصوصیات کے ساتھ پیدا نہ ھوا ھو۔

ھمارے علاقے میں کسی ایسے آدمی کے بارے میں جسے کمز بجانا نہ آتا ھو، کہا جاتا ھے کہ ''فکر نہ کرو! دوسری دنیا میں سیکھ لیگا۔،،

آپکو ایسے لاتعداد ادیب ملینگے جو قلم اٹھاتے ھیں اور لکھنا شروع کر دیتے ھیں، محبت یا نفرت کے کسی جذبے کے تحت نہیں بلکہ محض اپنی قوت شامہ کے بل پر۔

یہ تو آپ جانتے ھی ھیں کہ جب کوئی اجنبی کسی گاؤں میں پہنچتا ھے تو اسکا فیصلہ وہ اپنی قوت شامہ پر چھوڑ دیتا ھے کہ کس مکان میں ٹھہرے اور کس مکان میں نہیں۔ وہ چولھے کا دھواں باھر نکالنےوالی چمنی سے آتی ھوئی مہک کے مطابق فیصلہ کرتا ھے۔ بعض چمنیوں سے مکئی کی روٹی کی مہک نکلتی رھتی ھے اور بعض چمنیوں سے ابلتے ھوئے گوشت کی۔

اکثر ایسا بھی ھوتا ھے کہ شادی کے قابل دو لڑکیوں میں سے جن میں ایک بیوقوف ھے اور دوسری ھوشیار، بیوقوف لڑکی محض اس لئے چن لی جاتی ھے کیونکہ اسکے ساتھ بھاری جہیز بھی ملنےوالا ھوتا ھے۔

پھر کچھ ایسے قلمکار بھی ملتے ھیں جنھیں اس سے غرض نہیں ھوتی کہ وہ کس موضوع یا کس ملک کے بارے میں لکھیں۔ ایسے لوگ ان منافع‌خوروں کی طرح ھیں جو یہ سمجھتے ھیں کہ وہ کھیت سے جتنی ھی دور جائینگے ان کے مال کے دام اتنے ھی بڑھتے جائینگے۔

ان قلمکاروں کو دیکھ کر مجھے ایک عورت پرخالشہ یاد آجاتی ھے، جس نے یہ سوچ کر کہ گاؤں میں کوئی بھی مرد اس قابل نہیں جسے وہ اپنا شوھر چن سکے، کسی دوسرے گاؤں کے جوان کی منتظر رھی لیکن جیسا کہ آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ھے اسے زندگی کے آخری لمحات تک کنواری رھنا پڑا۔

جنگل جانے والے دو پہاڑیوں کی کہانی۔ دو آدمی گاؤں سے جنگل کی طرف چلے تا کہ اپنے بیلوں کے لئے نئے جوئے تیار کرنے کی غرض سے لکڑی کاٹ لائیں کیونکہ جوئے پرانے ہو چکے تھے۔

ان میں سے ایک آدمی کو فوراً ہی ایک مناسب درخت مل گیا اور اس نے خشک لکڑی کے دو عمدہ ٹکڑے کاٹ لئے اور گھر روانہ ہوگیا۔ لیکن اسکا دوست اسی چکر میں پڑا رہا کہ آگے اس سے بھی اچھے اور مناسب پیڑ مل سکتے ہیں۔ غرض وہ دن بھر جنگل میں چکر لگاتا رہا اور یہ طے نہ کر پایا کہ جس لکڑی کی ضرورت ہے وہ کس پیڑ سے کاٹے۔ آخر اس نے دو شاخیں کاٹیں جو پہلے دیکھی گئی شاخوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خراب تھیں۔ وہ کافی رات گئے گھر پہنچا جب اسکا دوست نئے جوئے کی مدد سے اپنا کھیت جوتنے کے بعد گھر لوٹ رہا تھا۔

میں نے یہ کہانی ابوطالب سے سنی تھی، ایک خاص موقع پر، موقع یہ تھا کہ ایک داغستانی شاعر طویل مسافت کے بعد گھر واپس آیا تھا اور دو معمولی نظمیں بھی ساتھ لایا تھا۔

''جو گیت آپ گھر میں رہ کر یاد نہ کر سکے ہوں، وہ اس گھر سے بہت دور بھی یاد نہ رکھا جا سکے گا۔ ''، معمر شاعر نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا تھا اور پھر اس میں اضافہ کیا:
''کبھی کبھی شاعر اس پہاڑی جیسی حرکت کرتے ہیں جو تمام دن اپنی پاپاخ ٹوپی ڈھونڈتا رہا حالانکہ پاپاخ اس بیوقوف کے اپنے سر پر ہی تھی۔ ''

موضوع کے بارے میں کچھ اور باتیں۔ ایک دن وہ بھی تھا جب میں نے پہلی بار سیر و سیاحت کی غرض سے گاؤں سے قدم باہر نکالے۔ اس دن ماں نے گھر کی کھڑکی پر ایک جلتا ہوا چراغ لا کر رکھ دیا تھا۔ میں آگے بڑھتا جا رہا تھا مگر جب بھی پیچھے مڑکر دیکھتا تو مجھے دھند اور اندھیرے میں گھر کی کھڑکی پر جلتے ہوئے اس چراغ کی روشنی نظر آتی۔

میں کئی برس تک کرۂارض کی سیر کرتا رہا اور میرے پورے سفر کے دوران گھر کی چھوٹی سی کھڑکی پر رکھے ہوئے چراغ کی روشنی میرا ساتھ دیتی رہی۔ پھر جب میں گھر لوٹا اور

میں نے گھر کی اسی کھڑکی سے باھر نظر ڈالی تو مجھے وہ پوری دنیا نظر آئی جسکی میں نے زندگی میں سیاحت کی تھی۔

ادیب کو اسکا موضوع کون فراھم کرے گا؟ موضوع کی فراھمی کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسان یہ ھے کہ اسے دماغ، آنکھیں، کان اور دل فراھم کر دیا جائے۔ وہ قلمکار جو محبت یا نفرت کے احساس کے ساتھ موضوع تلاش نہیں کرتے بلکہ اسکے لئے قوت شامہ کا سہارا لیتے ھیں کبھی اپنے عہد کے نمائندے نہیں بن سکتے۔ وہ ایک دن کے نمائندے ھوسکتے ھیں پورے عہد کے نہیں یا پھر ان کی مثال اس بہری دولہن کی طرح ھے جسکی کہانی اب میں بیان کرنے جا رھا ھوں۔

بہری دولہن کی کہانی۔ کہتے ھیں کسی زمانے میں کسی گاؤں میں ایک لڑکی تھی جو سن نہیں سکتی تھی۔ کسی دوسرے گاؤں سے اسکے رشتے کے لئے پیغام آیا۔ پیغام دینےوالا یہ نہیں جانتا تھا کہ لڑکی سماعت سے محروم ھے۔ رشتہ طے ھو گیا اور شادی کی تقریبات شروع ھوئیں۔ بہت سارے مہمان موجود تھے۔ دولہن نہیں چاھتی تھی کہ مہمانوں پر اسکے بہرے ھونے کا راز کھل جائے، اس نے اپنی ایک سہیلی سے مدد مانگی۔ طے یہ ھوا کہ یہ سہیلی دولہن کے پہلو میں بیٹھےگی اور اشاروں کے ذریعے بتاتی رھےگی کہ کیا ھورھا ھے۔ اگر ھنسی کی بات ھورھی ھو اور ھنسنے کا موقع ھو تو وہ دولہن کے بائیں شانے میں چٹکی کاٹےگی اور اگر کسی افسوسناک واقعہ کا ذکر ھو رھا ھوگا تو وہ دایاں شانہ دبائےگی۔

شادی کے موقع پر دولہن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ بات کرے بلکہ اسکا خاموش رھنا ھی بہتر سمجھا جاتا ھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر تک تو معاملہ اچھی طرح چلتا رھا، دولہن ھنسی کے موقع پر ھنس دیتی اور اداسی کے موقع پر اداس ھوجاتی۔

لیکن کچھ دیر بعد سہیلی یہ بھول گئی کہ کس موقع پر کونسا شانہ دبانا ھے۔ بایاں شانہ دبانے کا موقع ھوتا تو وہ دایاں شانہ دبا دیتی اور دایاں شانہ دبانے کا وقت آتا تو وہ بایاں دبا دیتی۔ نتیجہ ظاھر ھے جب ساتھ میں بیٹھے لوگ سنجیدہ نظر

آتے تو دولہن ہنسنے لگتی اور جب لوگ ہنس رہے ہوتے تو وہ اداس نظر آنے لگتی اور سسکیاں بھرنے لگتی۔

دولہا نے یہ دیکھ کر دولہن کا بغور جائزہ لینا شروع کردیا اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچ ہی گیا کہ الفاظ اسکی سمجھ میں نہیں آتے چنانچہ ڈولا جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے واپس لوٹا دیا گیا۔

حقیقی ادیب وہ ہے جسے دائیں یا بائیں سے اس طرح کے اشاروں کی ضرورت نہ ہو جیسے اس بہری دولہن کو تھی۔ اسے قلم اٹھانے پر اگر کوئی چیز مجبور کرے تو وہ اس کے اپنے دل کا درد ہو، اسکے اپنے دل کی تڑپ ہو، یا پھر خوشی اور مسرت کا داخلی احساس ہو۔ سچا ادیب اس لئے نہیں ہنستا کہ اردگرد کے لوگ ہنس رہے ہیں اور اسے ان کی مرضی کے مطابق ہنسنا چاہئے۔ اسکے دل میں غم کی لہریں اٹھتی ہیں اس لئے نہیں کہ وہ خود کو دوسروں کے رنج و غم کا شریک بنانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ جی نہیں! شادی کا ماحول پیدا کرنا اسکا کام ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ جب شاعر ہنسے تو دوسرے بھی ہنسنے پر مجبور ہوجائیں اور جب وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں کروٹیں لینے والے درد کا اظہار کرے تو دوسرے بھی یوں محسوس کریں جیسے خود ان کے دل میں بھی یہ درد کروٹیں لے رہا ہے۔

جو لوگ اب بھی میری بات سے متفق نہ ہو پائے ہوں اور دوسروں کے بتائے ہوئے موضوع پر قلم اٹھانا آسان ترین راستہ سمجھنے پر اب بھی مصر ہوں، انکی خدمت میں ایک اور سبق آموز واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یاد کی ایک جھلک۔ میں حنزہ گڑھی کے ابتدائی مدرسہ میں دوسری جماعت میں تھا۔ میرے برابر نیلی آنکھوں والی ایک لڑکی بیٹھا کرتی تھی، اسکا نام نینا تھا اور وہ ایک روسی استانی کی بیٹی تھی۔ نینا مجھے اچھی لگتی تھی لیکن میں اس سے اس کے بارے میں کہنے میں جھجک سی محسوس کرتا تھا۔ آخر میں نے طے

کیا کہ اسے ایک خط لکھوں۔ مگر یہ بھی میرے لئے کچھ آسان نہ تھا کیونکہ میں اس وقت تک روسی میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کرے۔ اس نے مجھے کچھ روسی لفظ لکھوا دئے جنکے میں معنی تک نہیں جانتا تھا۔ میں نے روسی حروف میں وہ الفاظ جوں کے توں نقل کر دئے۔ میں نے سمجھا کہ میں اظہار محبت کےلئے ویسے ہی خوبصورت الفاظ لکھ رہا ہوں جو میں نینا سے کہنا چاہتا تھا۔ جب میں نے اسے وہ رقعہ دیا تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے، رقعہ کھولتے ہوئے خود نینا کی انگلیاں بھی تھرتھرا رہی تھیں۔ اچانک اسکے چہرے پر ایک سرخی سی پھیل گئی اور وہ ایک ہی جست میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس نے میرے برابر بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میرے خط میں تو گندے اور بیہودہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ جب میں ادارۂادب میں زیر تعلیم تھا اور نینا لینن نامی ٹیچرس کالج میں پڑھ رہی تھی تو ایک بار دسمبر میں اس نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی، اس دن اسکی سالگرہ تھی۔ میں خاصی دیر تک سوچتا رہا کہ اس موقع پر تحفہ کیا دوں، آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ سب سے اچھا تحفہ یہ ہوگا کہ میں ایک نظم لکھوں، اس موقع پر سناؤں اور پھر نینا کی نذر کر دوں۔

پھر میں نے سالگرہ کی مبارکباد دیتے ہوئے ایک نظم لکھی۔ اور اپنے ایک ساتھی طالب علم کو جو خود بھی ایک جواں سال شاعر تھا اس پر راضی کر لیا کہ وہ روسی میں اسکا ترجمہ کر دے۔ وہ بچارا ساری رات ترجمہ کرنے میں مشغول رہا، لیکن جب اس نے اپنا ترجمہ مجھے سنایا تو میں اپنی نظم کو پہچان ہی نہ سکا۔ اس میں جذبات کا لاوا پھوٹ پڑا تھا، ہیجان‌خیز انداز میں سب کچھ کہہ دیا گیا تھا، لیکن وہ بات نہیں تھی جو میں نینا سے کہنا چاہتا تھا۔

لیکن اب میں بیوقوف بننے کو تیار نہ تھا، کیونکہ بہرحال ایک تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے میں‌نے اپنے دوست سے کہا:
''تم یہ نظم اپنی محبوبہ کو اسکی سالگرہ پر سنانے کےلئے

رکھ لو کیونکہ جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ تمہاری اپنی نظم ہے، میری نظم نہیں۔ ''

موضوع ہی سے متعلق کچھ اور باتیں۔ موضوع خوابیدہ مچھلی کی طرح ندی کی بالائی سطح پر بہتا نہیں، اسے تو گہرائیوں میں تلاش کرنا چاہئے وہاں جہاں بہاؤ بھی تیز ہوتا ہے اور پانی بھی صاف ہوتا ہے۔ اگر غرض ہے تو آپ اسے تلاش کیجئے اور جہاں آبشار کے گرنے سے بھنور کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، وہاں سے اسے باہر نکالئے۔ ایک آدمی خون پسینہ ایک کرکے پیسہ حاصل کرتا ہے، دوسرے کو اپنے گھر کی چوکھٹ پر ہی ایک سکہ پڑا مل جاتا ہے کیا دونوں کی قدر و قیمت کے لحاظ سے مساوی قرار دیا جا سکتا ہے؟

پہاڑی علاقوں کے رہنےوالے کہتے ہیں کہ اگر آپ پکڑنا چاہیں تو بڑی آسانی کے ساتھ بہت سارے جنگلی جانور پکڑ سکتے ہیں، لیکن ان جانوروں میں یا تو سیار ہونگے یا خرگوش۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ایک ہی جانور پکڑا جائے لیکن وہ لومڑی ہو۔ اور یہ بات کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس قسم کا جانور کہاں ملے گا، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ بہترین شکار اسی گھاٹی میں ملے جو آپ کے گاؤں سے سب سے زیادہ دور ہو۔

کسی زمانے میں ایک شکاری تھا جس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس لومڑی کو پکڑے جس کی کھال چاندی کی طرح چمکتی ہے۔ بیچارہ شکاری ساری زندگی اس لومڑی کی تلاش میں پہاڑوں کی خاک چھانتا پھرا۔ جیسے جیسے وہ بوڑھا ہوتا گیا، اسکے لئے زیادہ دور جانا ناممکن بنتا گیا، اب اس نے قریب کی ایک گھاٹی میں تلاش شروع کی جو اس کے مکان سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ اور اسے اسی گھاٹی میں خوبصورت روپہلی لومڑی مل گئی۔

''اب تک تو کہاں چھپی ہوئی تھی؟'' شکاری نے لومڑی سے پوچھا۔ ''میں ساری زندگی تیری تلاش میں بھٹکتا رہا۔ ''

''میں ہمیشہ اسی جگہ رہی'' لومڑی نے جواب دیا۔ ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تم تلاش میں پوری عمر گنوا سکتے ہو،

لیکن صرف ایک دن، بلکہ صرف ایک لمحہ ھی تمہیں کامیابی سے ھم کنار کر سکتا ھے؟،،

اسی طرح ادیب کی زندگی میں کوئی ایک دن ایسا آسکتا ھے جب وہ اپنی ذات کا عرفان حاصل کرتا ھے اور اسے اسکا موضوع مل جاتا ھے۔ وہ موضوع جسے پھر کبھی ھاتھ سے جانے نہیں دینا چاھئے۔ اگر وہ یہ غلطی کرتا ھے تو پھر اسکا حشر بھی میرے ایک شناسا جیسا ھوگا۔

اور اب اس ڈرامے کے بارے میں جو میرے ایک جاننےوالے نے لکھا تھا۔

داغستان کے ایک ادیب نے ایک بار پنچائتی فارم کی زندگی سے متعلق ایک ڈرامہ لکھا۔ موضوع کی اھمیت کے باوجود جس تھیٹر کو یہ ڈرامہ بھیجا گیا تھا اس نے اسے رد کر دیا۔ رد کرنے کی جو وجہ بتائی گئی وہ انتہائی کمزور تھی۔ کہا یہ گیا کہ ڈرامہ غیردلچسپ ھے۔

کوئی دوسرا ادیب ھوتا تو وہ صبر کرکے بیٹھ رھتا لیکن میرے یہ دوست کہاں ماننےوالے تھے۔ انھوں نے بہت برا مانا اور متعلقہ حلقوں سے سلسلہ قائم کیا۔ نتیجے میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا اور اسے یہ کام سونپا گیا کہ وہ اس سوال پر غور کرنے کے بعد مناسب اقدامات اپنائے۔ اس سلسلے میں تحقیقات کے بعد جو شکل سامنے آئی وہ اس طرح تھی: ڈرامہ پنچائتی فارم سے وابستہ دو گروھوں کی سوشلسٹ مسابقت پر مبنی تھا، جو گیہوں کی فصل ایک دوسرے سے زیادہ بہتر حاصل کرنا چاھتے تھے، ڈرامہ‌نگار نے یہ سب کچھ خوش‌آئند گیتوں کے ساتھ پیش کیا تھا۔

کمیشن کو ڈرامے کا پلاٹ یقیناً پسند آیا ھوتا اور ڈرامے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ھوتی بشرطیکہ صورت‌حال میں ایک خاص تبدیلی نہ آتی۔ ھوا یہ کہ جس وقت ڈرامہ زیر غور تھا اسی وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ کومیک کا استیپ گیہوں کے بجائے کپاس کی کاشت کےلئے زیادہ موزوں ھے، اس لئے وھاں کپاس بوئی جانی چاھئے۔ چونکہ ڈرامے میں دونوں گروھوں کو ''گیہوں،،

کی فصل کاٹتے ہوئے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے دکھایا گیا تھا اس لئے ''گیہوں کا موضوع،، اس صورت حال سے قطعی مناسبت نہیں رکھتا تھا جس میں اب ''کپاس کی کاشت،، کی جارہی تھی۔ ڈرامہ‌نگار نے ڈرامے میں تبدیلی کا کام شروع کردیا، اور کپاس کے پودوں میں پھول آنے سے پہلے ہی یہ نیا ڈرامہ بھی تیار ہوگیا۔ لیکن ابھی ڈرامے کی یہ نئی شکل زیر غور ہی تھی کہ صورت‌حال میں ایک اور تبدیلی ہوئی۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ کپاس کی کاشت کومیک استیپ کےلئے گیہوں سے بھی زیادہ نامناسب ہے، یہاں کےلئے مکئی کی فصل ہی سب سے بہتر رہے گی۔

محنتی ڈرامہ‌نگار نے اب نئے سرے سے ڈرامے میں تبدیلی کا ارادہ کیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ معاملے کا حشر کیا ہوتا لیکن اتفاق یہ ہوا کہ تھیٹر میں آگ لگ گئی اور اسکا سارا سامان جل کر رہ گیا۔ یکے بعد دیگرے پیش آنےوالے ان حادثوں سے اکتا کر میرا یہ شناسا ایک دریا کے ڈھلوان کناروں پر پہنچا اور ڈرامے کے مسودے کو تیز لہروں کے سپرد کردیا اپنے اس عمل پر کسی بھی پچھتاوے کے بغیر۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اسی طرح کا ایک اور واقعہ سناؤں۔ یہ بھی ایک ڈرامے سے متعلق ہے جو ایک روسی ادیب نے لکھا تھا اور جسکا عنوان تھا ''ولولہ‌پرور لوگ،،۔ یہ ڈرامہ موضوع کے اعتبار سے نہ کپاس کی کاشت سے متعلق تھا نہ گیہوں کی کاشت سے، اسکا موضوع ماہی گیر تھے۔ مختصراً موضوع یہ تھا۔

ایک زمانے میں پہاڑی لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کی مہم چلائی گئی تھی کہ وہ اپنے قدیم پہاڑی گاؤں کو چھوڑ کر میدانوں کے ساحلی علاقوں میں آباد ہوجائیں۔ یہ مسئلہ کافی پیچیدہ ہے اس لئے میں تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا البتہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح ازسرنو بسائے گئے پہاڑی باشندے جو صدیوں سے بھیڑیں پالتے رہے ہیں، نئے حالات میں کبھی کبھی ماہی گیر بن بھی گئے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ معمولی درجے کے ماہی گیروں کو بھیڑ کا پالن پوسن کرنےوالے بہترین

چرواھوں پر فوقیت کیوں دی جائے؟ لیکن یہ معاملہ چونکہ مجھ سے متعلق نہیں اسلئے میں کچھ کہنا نہیں چاھتا۔ بہرحال ڈرامے کا پلاٹ کچھ اس طرح تھا کہ ایک دوردراز پہاڑی گاؤں کے سابق باشندے کس طرح بحیرۂ کیسپین کے ماھی گیر بن گئے۔

چونکہ ڈرامے میں جو کردار پیش کئے گئے تھے وہ آوار تھے اس لئے ڈرامہ‌نگار نے اپنا ڈرامہ ایک آوار تھیٹر کو بھیجا، جہاں سے ڈرامہ فوراً ھی واپس کردیا گیا۔

اب ڈرامہ‌نگار کیا کرتا؟ کوئی اور ھوتا تو اسکا دل ٹوٹ جاتا اور حالت خراب جاتی لیکن جیسا کہ اکثر ھم نے شطرنج کی بساط پر دیکھا ھے، مہروں کی کسی ایک چال کے ذریعے پورا نقشہ بدل جاتا ھے، مثلاً اگر سیاہ مہروں کو مات کا سامنا ھو تو گھوڑے کی ایک چال مات کا رخ سفید مہروں کی طرف موڑ دیتی ھے اور اب سفید مہروں کےلئے لینے کے دینے پڑ جاتے ھیں۔

''ولولہ‌پرور لوگ،، کے خالق نے بھی اسی طرح کی چال اپنائی۔ اس نے فوراً ھی آوار کرداروں کی جگہ کومیک کردار رکھ دئے اور ڈرامہ کومیک تھیٹر کو بھیج دیا۔ لیکن اس سے بھی بات نہیں بنی کیونکہ کومیک تھیٹر نے بھی کسی ایسے ڈرامے کو اسٹیج کرنے سے انکار کر دیا جس میں پہاڑی علاقے کے چرواھوں کو ماھی گیر بنا دیا گیا ھو۔

چونکہ داغستان میں بہت ساری قومیتیں آباد ھیں اسلئے ڈرامہ نگار موصوف مہروں کی طرح کرداروں کے نام بدلتے رھے کبھی دارغین نام ان کرداروں نے اپنائے اور کبھی لیزغین، لیکن کوئی بھی اچھا ماھی گیر بننے کے لئے تیار نہ ھوا۔ ڈرامے کی صورت حال کچھ اس بھوکے کتے جیسی تھی جس کو دروازے پر سے اس لئے بھگا دیا گیا کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا اور اس نے کئی دروازوں پر حاضری دی مگر کہیں بھی اسے ایک ھڈی نہ مل سکی۔

کئی سال بعد ڈرامہ‌نگار صاحب ادب کی اعلی تعلیم کے لئے ماسکو تشریف لے گئے۔ وھاں سے مخاچ‌قلعہ تک جو افواھیں پہنچیں ان سے معلوم ھوا کہ ماھی گیر پراسرار طور پر خانہ‌بدوشوں میں

بدل گئے ھیں۔ جب ماسکو کے ''رومین،، تھیٹر نے ڈرامے سے کچھ دلچسپی کا مظاھرہ کیا تو اس لنگڑی دولھن کو بھی آخرکار ایک شوھر مل ھی گیا۔ مگر یہ شادی بھی چندروزہ ثابت ھوئی۔

ابھی ابھی میں نے اپنے دو جانےوالوں کے ڈراموں کے بخیے ادھیڑے ھیں۔ اگر میں نے یہ باتیں ادیبوں کی کسی کانفرنس میں کہی ھوتیں تو مجھے کب کا یہ مطالبہ ھو چکا ھوتا کہ ذرا خود احتسابی پر توجہ دوں۔

میں اپنے بارے میں کیا کہہ سکتا ھوں؟ بس اتناھی کہہ دوں کہ اگر میں ادبی میدان میں ایسا کوئی انحراف کرتا تو اسکا اعتراف کرنے میں مجھے خوشی ھوتی۔ لیکن میرے ضمیر پر بھی ایک بوجھ ھے، جسکے مقابلے میں یہ سارے ''مکئی،،' ''کپاس،، اور ''مچھلی،، سے متعلق موضوعات قطعی بےحقیقت اور معمولی بن کر رہ جاتے ھیں۔ اپنے ابتدائی دور میں مجھ سے ایک ایسی غلطی سرزد ھوچکی ھے جس پر آج تک میں شرمندگی محسوس کرتا ھوں۔

میرے دوستوں نے باربار اور بڑی بیباکی کے ساتھ اس غلطی پر میری سرزنش کی ھے اور یوں مجھے سزا ملتی رھی ھے۔ لیکن میرا ضمیر جس طرح مجھے سزا دیتا رھا ھے اس سے زیادہ سخت سزا کوئی دے ھی نہیں سکتا۔

<u>ابا کہا کرتے تھے:</u> ''اگر تم نے کوئی شرمناک حرکت ایسی کی ھے جو تمھارے شایان شان نہ تھی تو چاھے تم لاکھ دعائیں کرو وہ داغ تمھاری پیشانی سے مٹ نہیں سکتا۔،،

<u>ابا یہ بھی کہا کرتے تھے:</u> ''اگر کسی آدمی نے شرمناک رویہ اختیار کیا ھو اور کئی سال بعد اس رویہ پر شرمندہ ھو تو اسکی مثال ایسی ھی ھے جیسے کوئی پرانا قرض ان سکوں کے ذریعے ادا کرنا جو رائج نہ رھے ھوں۔،،

<u>اور ابا ھی کا یہ بھی کہنا تھا:</u> ''اگر تم برے آدمی کو کھلی چھوٹ دے دیتے ھو اور اسے مکان سے باھر نکل جانے دیتے

ھو تو پھر اس جگہ کو پیٹنے سے کیا فائدہ جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا؟،،

''بیل چوری جا چکے ھوں تو دروازے پر بھاری تالا لگانے کی کیا ضرورت ھے؟،،

یہ ساری باتیں صحیح ھیں اور میں جانتا ھوں کہ جب تیر کمان سے نکل چکا ھو تو افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مگر میرے قارئین کبھی کبھی مجھے ایسے خطوط لکھتے ھیں، جن سے مجھے کچھ ایسی باتیں یاد آجاتی ھیں کہ پرانے زخم پھر ھرے ھوجاتے ھیں۔ یوں لگتا ھے جیسے یہ لوگ میری کھڑکی پر پتھر برسا رھے ھوں اور یہ کہہ رھے ھوں کہ ''رسول حمزاتوف باھر آؤ، ھمیں اپنا منہ دکھاؤ۔ ھم کو جو تمہاری تحریریں پڑھتے ھیں یہ بتاؤ کہ یہ سب کچھ کیسے ھوا؟،،

''میں تمہیں کیا بتاؤں؟،،

''تمہیں یاد نہیں؟ ۱۹۵۱ء میں تم نے ایک نظم لکھی تھی جس میں شامیل پر کیچڑ اچھالا تھا لیکن ۱۹۶۱ء میں تم نے انکی تعریف میں نظم لکھی۔ دونوں ھی نظموں پر رسول حمزاتوف کے دستخط تھے۔ ھم یہ جاننا چاھتے ھیں کہ دونوں رسول ایک ھی ذات کے نام تھے یا دونوں میں کوئی فرق تھا۔ اور ان دونوں میں سے کس کی بات کا یقین کیا جائے؟،،

یہ اصل سوال ھے۔ تیر اگر جسم کے کسی دوسرے حصے میں پیوست ھو گیا ھو تو اسے باھر نکالا جا سکتا ھے، لیکن دل میں اتر جانےوالے تیر کا کیا کیا جائے؟

عزیز قارئین! میں نہیں جانتا کہ آپ کی عمریں کیا ھیں ھوسکتا ھے ابھی آپ نے شباب کی منزلوں میں قدم ھی رکھا ھو۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ کبھی آپکو زندگی میں کچھ حدیں پار کرنی پڑی ھیں یا نہیں؟ میرے ساتھ ایسا ھوچکا ھے۔ میں نے محبت کی، اور میں خود کو بھی یہ بتانے سے قاصر تھا کہ میں کس چیز سے محبت کر رھا ھوں، اور بعد میں مجھے ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔

ایسا ہوتا ہے کہ دو پڑوسیوں کی کھڑکیوں کے درمیان ایک تنگ گلی سی ہے۔ دونوں ہی کھڑکیوں پر دو پڑوسی آمنے سامنے کھڑے ہیں اور لگاتار آپس میں لڑ رہے ہیں اور ایک دوسرے پر تہمت رکھ رہے ہیں۔ ان میں جو بڑا ہے وہ چھوٹے کو ڈانٹ رہا ہے اور جو چھوٹا ہے وہ بڑے کو مورد الزام قرار دے رہا ہے۔ میں بھی ان جھگڑالو پڑوسیوں کی طرح ہوں۔ دونوں کھڑکیوں پر جو چہرے ہیں وہ میرے اپنے ہی ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک میں وہ رسول ہے جو کبھی جوان تھا اور دوسرے میں وہ رسول جو آج میں ہوں۔

زمانے کی آب و تاب نے میری آنکھیں چکا چوند کردی تھیں بالکل اسی طرح جیسے ایک ناتجربہ‌کار نوجوان کسی خوش اندام دوشیزہ کی محبت میں اندھا ہوجاتا ہے۔ میں نے بھی واقعات کو ایک ایسے ہی نوجوان کی نظر سے دیکھا، اور جس طرح اسے اپنی پسندیدہ لڑکی میں معمولی سی کمی بھی نظر نہیں آتی اسی طرح میں بھی اس معاملے میں اندھا بن گیا تھا۔ جیسے کہ کہاوت ہے ''جیسی چھڑی ویسی اس کی پرچھائیں،،۔ تو سچ بات یہ ہے کہ میں بھی وقت کی پرچھائیں بن گیا تھا۔ سرکاری طور پر یہ اعلان ہوا تھا کہ شامیل برطانیہ اور ترک کے جاسوس تھے جن کا کام قوموں کے درمیان نفرت کو ہوا دینا تھا اور جس گھر میں یہ بات کہی جا رہی تھی میں نے اس پر اور گھر کے مالک پر اعتبار کیا اور یہ اسی اعتبار کا نتیجہ تھا کہ میں نے وہ نظم لکھی جس میں ہمارے شامیل کا ''پردہ فاش،، کیا گیا تھا۔

آج کچھ لوگ میری تسلی کے لئے کہتے ہیں:

''ہم نے سنا ہے کہ تم نے وہ اشعار خصوصی ہدایت پر لکھے تھے اور تمہیں ان اشعار کی تخلیق پر مجبور کیا گیا تھا۔،،

لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کسی نے مجھ پر دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ یہ میں خود تھا، جس نے اپنی آزادانہ خواہش پر شامیل کے بارے میں وہ اشعار لکھے تھے اور انہیں لے کر اخبار کے دفتر گیا تھا۔ میری حیثیت پہاڑی علاقوں کے ان باشندوں جیسی تھی جو قرآن شریف کے اوراق الٹتے جاتے ہیں حالانکہ انہیں عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آتا، اسکے باوجود ایک لفظ سمجھے بغیر محض

قرآن پاک کے اوراق الٹنے میں ایک طرح کی مسرت اور طمانیت محسوس کرتے ھیں۔

جی ھاں میں وقت کی پرچھائیں بن گیا تھا حالانکہ شاعر کو کبھی پرچھائیں نہیں بننا چاھئے، اسے تو شعلہ ھونا چاھئے، روشنی کا سرچشمہ اب اس سے بحث نہیں کہ یہ روشنی کسی معمولی دئے کی ہے یا سورج کی۔ روشنی پرچھائیں نہیں ھو سکتی وہ تو صرف روشنی ھوتی ہے۔

میں غالباً ان ساری باتوں سے کچھ دیر میں واقف ھوا۔ سیب طرح طرح کے ھوتے ھیں۔ بعض سیب جلدی تیار ھوجاتے ھیں اور بعض خزاں میں ھی جا کر کہیں اس قابل ھوتے ھیں کہ انہیں کھایا جاسکے۔ غالباً میں بھی اسی طرح کا سیب ھوں جو خزاں میں تیار ھوتا ہے۔

یہ تھا سارا قصہ۔ اب رھی میرے زخم کی بات تو وہ آج بھی تازہ ہے اور آج بھی اسکی کسک دل میں محسوس ھوتی ہے۔

برسوں پہلے، دل پر میرے زخم لگا تھا
اب بھی اکثر نشتر بن کر جاگ اٹھتا ہے
وہ جو میرے دادا کے پاک ھونٹوں پر
گیت بنا تھا، قصہ بن کر گونج اٹھا تھا
اک قصہ، اور اسکا ھیرو، بچپن کا حصہ بن کر
میری یادوں کے آنگن میں
آنکھ مچولی کھیل رھا ہے
میرے گھر کے آگے
کھیتوں میں، میدانوں میں
شام کی دھندلی تاریکی میں
اسکی فوجوں جیسے بادل
ھر لمحہ امڈے آتے ھیں
وہ میرے کوھستان کا نغمہ، جس کو
میرا بچپن، ماں کے ھونٹوں سے سنتا آیا
میری ماں کے بوجھل آنسو

جن کو کبھی وہ روک نہ پائی
شبنم کے قطروں کی صورت
میرے کھیتوں، میدانوں میں بکھرے ہیں

بوڑھا، ویر، بہادر
قفقازی ٹوپی اوڑھے دیکھ رہا ہے
اک اونچی دیوار سے نیچے جھانک رہا ہے
بائیں ہاتھ سے پکڑے اپنی دو دھاری تلوار کا قبضہ
دائیں جانب ڈول رہا ہے میان کا سایہ

ہاں میری یادوں میں اب بھی
وہ تصویر مچل اٹھتی ہے
جس نے دیکھا
مجھ سے بڑے دو بھائی میرے
کیسے رن کی سمت سدھارے
کیسے میری اپنی بہن نے
سونے کے نیکلس اور ھار اتارے
دان میں بخشے
تاکہ ایسا ٹینک بنے
جس پر بوڑھے، ویر، بہادر
قفقازی ٹوپی والے
اس ھیرو کا نام کھدا ھو۔

اور ابا نے، اپنی موت سے کچھ دن پہلے
اس ھیرو کے گن گائے تھے
لیکن یہ بھی سچائی ہے
کڑوی، لیکن سچائی
اس ھیرو کو دشمن کا ایجنٹ بتا کر
اک دنیا نے اس کے سر الزام تراشے

میرا تو یہ بھی کہنا ہے
ابا پر یہ چوٹ نہ پڑتی

تو کچھ دن وہ اور بھی جیتے
لیکن!
ھائے! خود میرا بھی ھاتھ ھے اس میں
میں نے بھی باتوں میں آ کر
اوروں کے ھمراہ چلائیں
شعروں کی شمشیریں اس پر
وہ تلوار اجداد کی میرے
جو دشمن کے خوں میں نہائی
اس کو میں نے
لوگوں کی باتوں میں پڑ کر
غداروں کا حربہ سمجھا
دشمن کا ھتھیار بتایا

اب بھی رات کی خاموشی میں
اس کے بھاری قدموں کی آھٹ ملتی ھے
جب دیپک بجھ جاتے ھیں
کھڑکی میں سے اسکا سایہ —
وہ جس نے جم کر اخلگو کی آن بچائی
گونیب کا درویش سپاھی
— آجاتا ھے، خود میرے اپنے کمرے میں
آجاتا ھے، اور یہ کہتا ھے
"کتنی جنگیں لڑتا آیا
کتنا خون بہایا میں نے
کتنا درد اٹھایا میں نے
میرے بدن پر، میری قبا پر
انیس زخموں کے پیوند اب بھی دیکھے جا سکتے ھیں
پھر بھی میں نے صبر کیا تھا،
لیکن تم نے
شعروں کے یہ تیر چلا کر
زخم لگایا ھے ایسا
جیسا زخم کبھی نا کھایا۔

''خنجر کے، تلوار کے اور گولی کے زخم ایک طرف
اور یہ زخم اک جانب
یہ پہلا زخم ہے جو میں نے
اپنے کوھستان کے اک بیٹے کے ھاتھوں کھایا
تم نے وہ جو تیر چلایا
میرے دل میں جا اترا ہے

''ھوسکتا ہے غزوہ اور جہاد کے نعرے
اب فرسودہ سمجھے جائیں
لیکن میرے بچے!
ان نعروں نے
اک دن تیرے
کوھستان کی حرمت اور اسکا ناموس بچایا
ھو سکتا ہے، آج کی دنیا
ان حربوں کو کہنہ سمجھے
لیکن یہ وہ حربے ھیں
جو آزادی کے ضامن بن کر
رن کے میدانوں میں چمکے
دشمن پر طوفان سے ٹوٹے

''میں کوھستانی شاھین بن کر
ھر پل جنگ کے میدانوں میں لڑتا آیا
گانا سننے
جشن منانے کی فرصت کب پائی میں نے
یہ بھی سچ ہے، اک شاعر کو کوڑے بھی لگوائے تھے
یہ بھی سچ ہے، میرا وہ اقدام غلط تھا
غصے میں بےقابو ھونا، کوئی اچھی بات نہیں ہے

''لیکن مجھ کو
تم جیسے پھوھڑ شاعر جب ملتے ھیں
جن کے گیتوں، نظموں اور شعروں میں
کھو کھلاپن ھو

تو میرا یہ جی ہوتا ہے
میرے ہاتھ میں کوڑا ہوتا
تو وہ فسانہ پھر دہراتا،،

یوں ہی سحر تک وہ سایہ —
جو ہر شب اندھیارے میں
اپنی حناآلودہ داڑھی
چہرے کی تابانی لے کر
— میرے کمرے میں آتا ہے
— منڈلاتا ہے
طنز کے لاکھوں تیر چلا کر
مجھ کو اپنے زخم دکھا کر
شرم کا اک احساس دلا کر
جانے کہاں پھر چھپ جاتا ہے

میں نے جو حرکت کی تھی
اس حرکت پر میں نادم ہوں
اس سائے سے بھی نادم
جو ہر شب تاریکی میں منڈلاتا ہے
اور اپنے لوگوں سے بھی
بوڑھے، ویر، بہادر کا
اس غزوے میں اک ساتھی تھا
حاجی مراد
جس نے اپنے پیر سے رشتے توڑ لئے تھے
بعد میں اس کو غلطی کا احساس ہوا تھا
پیر سے وہ ملنے کو چلا تھا
لیکن اک دلدل میں پھنس کر
بیچارہ
اپنی جان گنوا بیٹھا تھا

میں بھی گر دوبارہ چاہوں
اسکی خدمت میں جانا

تو ناممکن ہے
کیونکہ، میرے اور اسکے بیچ میں حائل
اک دریا ہے، وقت کا دریا
اسکا رستہ، اس کا رستہ تھا
میرا رستہ، میرا رستہ ہے

اب تو مجھ کو اپنے ان اشعار کی قیمت
شب بیداری
شرم و ندامت سے ھی پوری کرنی ہوگی
یہ بھی سچ ہے
معافی کی کچھ آس اگر ہو
سب کچھ کر سکتا ہوں
لیکن ڈرتا ہوں
کوئی دلدل
میری بھی اس راہ گذر میں
آدھمکی
تو کیا ہوگا؟

لیکن اک سچائی
اس سے بھی کچھ زیادہ برتر سچائی
یہ ہے
اک شاعر کی غداری کو معافی دینا وہ کیا جانے
جو تلوار سے لکھتا ہو
آنےوالے دور کے قصے
آنےوالے دور کے نغمے
اور اب اس سے معافی کی درخواست بھی کرنا
اک سعی لاحاصل ہوگا
اب تو مجھ کو جیتے جی
اپنی جبیں کا یہ دھبہ
اپنا یہ آلودہ دامن
غلطی کے احساس کا بوجھا
ان کاندھوں پر ڈھونا ہوگا

لیکن! میری قوم کے لوگو!
یہ بوجھا اتنا ہی رکھو
جتنا میں ڈھو پاؤں یا سہ پاؤں
میں نادم ہوں، لیکن اے محبوب وطن
مجھ پر
ایسی تیکھی نظروں کے تیر نہ برسا
جیسے کوئی ماں، بچے کی بے جا حرکت پر
خود شرمندہ ہوجاتی ہے
یاس و الم میں کھو جاتی ہے

مجھے نہیں معلوم کہ داغستان کے لوگوں نے یا شامیل کی روح نے مجھے میرے پرانے اشعار کےلئے معاف کر دیا ہے یا نہیں - میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

''شامیل سے مت الجھو!،، ابا کہا کرتے تھے۔ ''اگر تم نے ایسا کیا تو زندگی بھر سکون نہ پا سکوگے۔ ،،

ابا نے کتنی صحیح بات کہی تھی۔

کوھستانوں کا بیٹا ھوں
نازو نعم میں کیا جانوں
بچپن سے پٹتا آیا
جھڑکا جاتا
جب بھی کوئی غلطی کرتا
ایسے کان امیٹھے جاتے
لال، گلابوں سے ھوجاتے
یہ سب کچھ ابا کرتے

اب ابا تو دور سدھارے
اب تو اکثر وقت کے ھاتھوں
ایسے کان امیٹھے جاتے ھیں
جیسے کوئی ساز اٹھائے

اسکا کوئی تار ذرا سا ڈھیلا پائے
پھر پوری قوت سے، تار کو دوبارہ کس دے

وقت! وہ وقت جس کے سال دنوں سے بنتے ھیں اور صدیاں برسوں پر مشتمل ھوتی ھیں۔ اب سوال یہ ھوتا ھے کہ دور کسے کہا جائے؟ ایک دور صدیوں پر مشتمل ھوتا ھے یا محض برسوں پر؟ یا پھر کوئی واحد دن بھی دور میں تبدیل ھو سکتا ھے؟ کوئی پیڑ پانچ مہینوں تک سرسبز و شاداب پتیوں کا لباس اوڑھے کھڑا رھتا ھے لیکن ایک واحد دن یا ایک اکیلی رات میں اسکی سبز پتیاں زرد ھو جاتی ھیں اور اس کے برعکس بھی ھوتا ھے کہ پانچ مہینوں تک کوئی پیڑ ننگابوچا کھڑا رھے، پھر ایک دھوپ سے بھرے روشن دن اس میں نئی کونپلیں پھوٹ اٹھیں۔ اور پھر ایک ھی خوشگوار صبح اس کا دامن پھولوں سے بھرنے کیلئے کافی ھو۔

بعض پیڑ ایسے ھوتے ھیں جو ھر مہینے رنگ بدلتے رھتے ھیں اور بعض ایسے جنکا رنگ کبھی تبدیل نہیں ھوتا۔

کچھ چڑیاں ایسی ھوتی ھیں جو موسم کے لحاظ سے اپنے آشیانے بدلتی رھتی ھیں۔ لیکن عقاب ایک ایسا پرندہ ھے جو ھمیشہ اپنے کوھستانی وطن کا وفادار رھتا ھے اور اسے کبھی نہیں چھوڑتا۔

چڑیوں کو ھوا کے خلاف اڑنا پسند ھے۔ ایک اچھی مچھلی ھمیشہ رو کے مخالف تیرتی ھے۔ سچا شاعر وہ ھے جو دل اور ضمیر کی آواز پر چلتا ھے اور اگر ضرورت پڑے تو عالمی رائے عامہ سے ٹکرانے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔

اپنی نوٹ بک سے۔ گذشتہ سال میرے دوست ایک آوار شاعر کا مجموعہ کلام شایع ھوا۔ ساری نظموں کو بڑی احتیاط کے ساتھ مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا جیسے وہ نظمیں کسی شہر کے کسی ایک مکان کا حصہ ھوں۔ مثلاً سیاسی یا شہری حقوق سے تعلق رکھنے والی نظمیں یوں لگتیں جیسے مطالعہ کا کمرہ ھو۔ داخلی جذبات اور محبت کی ترجمانی کرنےوالی نظموں کو خوابگاہ سمجھا جا سکتا تھا۔ عام نوعیت کی بہت ساری نظمیں ڈرائنگ روم

کی کمی پوری کرتی تھیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ زراعت، اناج اور چرواھوں سے متعلق نظموں کو کس خانے میں رکھوں... غالباً باورچی‌خانہ ان کے لئے موزوں‌ترین جگہ ھوگا۔

ایک مغنی داغستانی مغنیوں کے کسی مقابلے میں حصہ لینے کی غرض سے مخاچ‌قلعہ آیا۔ ھمارے شاعر نے جس نے اسقدر احتیاط کے ساتھ اپنی نظموں کو مختلف خانوں میں بانٹ رکھا تھا، اس مغنی سے فرمائش کی کہ وہ ھر خانے سے ایک ایک نظم گادے۔ مغنی نے کمز کے تار چھیڑے، کئی منٹ تک خاموش بیٹھا رھا جیسے شاعر کے خیالات پر گرفت حاصل کر رھا ھو اور پھر اس نے گانا شروع کر دیا۔ گانا خاصی دیر تک جاری رھا اور لوگ پریشان ھونے لگے کہ اگر ایک باب سے لیا ھوا گانا اتنا طویل ھوگا تو پھر یہ مغنی رکےگا کہاں جاکر؟ کیونکہ مجموعہ تو چار ابواب میں تقسیم ہے۔ بالآخر مغنی نے گانا موقوف کیا اور ساز پر ھاتھ رکھ کر تاروں کی لرزش روکی۔ پتہ یہ چلا کہ اس مغنی نے وہ سارے خصوصی افکار اور جذبات ایک گانے میں سمو لئے تھے جو پوری کتاب میں بکھرے ھوئے تھے۔

شاعر نے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ مغنی نے جواب دیا: ”سنو دوست! یہ رھا میرا کمز، اس میں تین تار ھیں۔ میں یہ نہیں کر سکتا کہ پہلے ایک تار بجاؤں، پھر دوسرا اور پھر تیسرا۔“ کیا مغنی نے جو بات کہی وہ صحیح نہیں تھی؟

موضوع ھی سے متعلق کچھ اور باتیں۔ غالباً بہت سارے لوگ یہ بات نہیں جانتے کہ ھم پہاڑیوں میں کبھی ایک ایسا آدمی بھی تھا جسے اپنے نئے جوتوں پر بڑا ناز تھا، وہ اس پر گرد کا ایک ذرہ بھی بیٹھنے نہ دیتا۔ جوتوں کو مٹی سے بچانے کےلئے وہ ھمیشہ پنجوں کے بل چلتا۔ ایک دن وہ ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں گھٹنوں تک کیچڑ تھا۔ اب کیا ھوا۔ اس بےچارے نے پیروں کے بجائے ھاتھوں کے بل چل کر زمین کا یہ حصہ پار کیا۔

ایسا بھی ھوتا ہے۔ جیسے شعرا ادب کی تخلیق میں مصروف نہ ھوں بلکہ اتوار کی کسی گھڑدوڑ میں حصے لے رہے ھوں۔ اپنے

گھوڑے کو مقابلے میں کامیاب کرانے اور انعام دلانے کی غرض سے وہ بے تحاشا چابک برساتے ہیں یہاں تک کہ ان کے گھوڑے خون میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ فتح کا نشہ تو کچھ دیر بعد اتر جاتا ہے لیکن چابک سے لگنے والے زخم ٹھیک ہونے میں خاصی دیر لگتی ہے۔ تلیتل کے علی بولات کی طرح یہ شعرا بھی ہمہ وقت تیار رہتے ہیں... لیکن ٹھہریئے میں نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ یہ علی بولات تھا کون؟

حنزہ کے نائب نے ایک بار اپنے نوکر علی بولات سے کہا:

''کل صبح تلیتل گاؤں جانے کے لئے تیاری کر لو!،،

''میں بالکل تیار ہوں،، وفادار نوکر نے جواب دیا۔

دوسرے دن صبح اتنے سویرے کہ سورج کی کرنیں پہاڑ کی چوٹیوں تک بھی نہ پہنچ پائی تھیں، علی بولات نے اپنے گھوڑے پر زین کسی اور چل پڑا۔ رات ہوتے ہوتے وہ حنزہ واپس آگیا۔ حنزہ کے قریب ہی اسے اس کے کئی پہاڑی دوست مل گئے۔

''سلام علیکم، علی بولات۔ کیا بہت دور سے آرہے ہو؟،،

''ہاں تلیتل تک گیا تھا اور وہیں سے واپس آرہا ہوں۔،،

''کس کام سے تلیتل گئے تھے،، دوستوں نے پوچھا۔

''اب میں کیا جانوں، یہ سب تو نائب صاحب جانیں، کل رات انہوں نے مجھے تلیتل جانے کا حکم دیا تھا، سو میں ہو آیا۔،،

آپ جانیں اس طرح کے علی بولات ہم ادیبوں کے قبیلے میں بھی پائے جاتے ہیں۔

موضوع ہی سے متعلق کچھ اور باتیں: میں نے ایسے بہت سے نوجوانوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ شادی کرنا چاہتے ہیں تو اپنے جذبات و احساسات کا خیال نہیں کرتے بلکہ اپنے عزیزوں سے، اپنے چچا اور اپنی پھوپھیوں سے مشورہ لیتے ہیں۔ لیکن ادیب کو قوت تخلیق کے ساتھ اگر دائمی رشتہ جوڑنا ہو تو اسکی اساس محبت اور صرف محبت پر ہونی چاہئے۔ پھوپھی کے مشورے سے ہونے والی شادی کے نتیجے میں جیتا جاگتا بچہ جنم لے سکتا ہے، لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان محبت کے بندھن جتنے مضبوط ہونگے، ان کا بچہ بھی اتنا ہی خوبصورت

ہوگا۔ لیکن اگر کوئی ادیب محبت کے بغیر اپنے موضوع کے ساتھ تخلیق کا رشتہ قائم کرتا ہے تو جو کتاب جنم لیتی ہے اسکی حیثیت اسقاط حمل کی سی ہوتی ہے۔ اسی لئے موضوع سے رشتہ جوڑنے سے پہلے ادیب کو اپنے دل کی دھڑکنوں کی طرف دھیان دینا چاہئے اور دل کی پکار سننی چاہئے۔

اپنے ایک دوست کی کتاب کے بارے میں۔ مجھے اچھی طرح وہ سال تو یاد نہیں جب یہ واقعہ رونما ہوا تھا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ اچانک یہ اعلان ہوا کہ ملک کو گوگول اور سالتیکوف۔شچیدرین جیسے ادیبوں کی ضرورت ہے۔ سوویت ادب میں طنز و مزاح کا حصہ فوری طور پر بلند ہونا چاہئے۔

میرے ایک دوست ہیں، جو شاعر بھی ہیں، نثرنگار بھی اور مدیر بھی۔ مختصر یہ کہ ان کا شمار اہل قلم میں ہوتا ہے۔ اس اپیل پر لبیک کہتے ہوئے انہوں نے طنزیہ تخلیقات کا ایک مجموعہ شایع کیا جن میں اتہام تراشی کرنےوالوں، چاپلوسوں، کئی کئی شادیاں کرنےوالوں نیز اس قسم کے دوسرے منفی کرداروں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا تھا جو صاف ستھرے سماج کی حامل ہماری سوویت زندگی کے دامن پر دھبہ ہیں۔

ابھی کتاب کو بازار میں آئے کچھ ہی دن گذرے تھے کہ ایک نقاد نے اس کتاب کے خلاف بےانتہا سخت مضمون لکھا۔

اس نے لکھا کہ ''مصنف نے گوگول اور سالتیکوف۔شچیدرین جیسی ایک نئی نسل پیدا کرنے کے نعرے کی گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کی ہے اور اس اپیل پر بڑی رواروی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ آج ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے بیچ کتنا پست ذہن اور بدطینت انسان موجود ہے۔ اب ہم یہ سمجھ پائے ہیں کہ اسکا سیاہ دل کسقدر گراوٹ کا شکار ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نے جن لوگوں کے خاکے اس کتاب میں پیش کئے ہیں وہ اسے کہاں دکھائی دئے؟ کیا ہماری سوویت سرزمین پر اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں؟ جی نہیں، سوویت یونین میں اس طرح کے لوگوں کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض اس قنوطی ادیب کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اور اسکی دشنام طرازیوں سے بھری ہوئی

یہ کتاب ہمارے دشمنوں کو ایک حربہ فراہم کرتی ہے۔"

ایک اعلیٰ عہدے دار مختاریکوف نے انتہائی غصے میں اپنی میز تھپتھپاتے ہوئے مصنف سے جواب طلب کیا۔

"ہمارے سماج میں تمہیں کہاں ایسا کاہل اور بیکار ٹیم لیڈر نظر آیا جو شراب میں دھت رہتا ہو؟"

"خود اپنے گاؤں میں" مصنف نے بڑی انکساری کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ سراسر بہتان ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گاؤں کا پنچائتی فارم خاصی ترقی کر رہا ہے۔ ایک ترقی کرتے ہوئے پنچائتی فارم میں کسی ٹیم کا ایسا سربراہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

الغرض بچارا مصنف اپنے ہی طنزیہ فن پاروں کا شکار ہو کر رہ گیا۔ یہاں مجھے ایک کارٹون یاد آگیا جو پولینڈ کے ایک رسالے میں شایع ہوا تھا۔ اس میں دو برآمدے دکھائے گئے تھے، ایک سب سے نچلی منزل پر اور دوسرا چوتھی منزل پر اور دونوں پر ایک ایک آدمی کھڑا تھا۔ نچلے برآمدے پر کھڑا آدمی چوتھی منزل والے آدمی کی طرف اینٹیں پھینک رہا تھا۔ اینٹیں اوپر تو کیا خاک پہنچتیں۔ البتہ پلٹ کر خود پھینکنے والے پر گر رہی تھیں اور اوپر والا آدمی اطمینان سے اپنی اینٹیں پھینک رہا تھا جو بیچارے نیچے والے آدمی کے سر پر آ رہی تھیں۔ اس کارٹون کے نیچے لکھا تھا: "تنقید اوپر سے اور نیچے سے"۔ اس مصنف کا بھی یہی حال ہوا۔

کسی نے بیچارے مصنف کو مشورہ دیا کہ اپنی غلطی مان لینے ہی میں خیریت ہے اور اس غرض سے ہر موقع سے فائدہ اٹھایا جائے، اخبارات کے ذریعے، رسائل کے ذریعے اور ہر اس جلسے میں جس میں وہ شریک ہو یہ اعلان کرے کہ اس سے ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ بدقسمت ادیب نے اس مشورے پر پوری طرح عمل کیا اور جہاں بھی موقع ملا اپنی اس غلطی پر ندامت کا اظہار کرتا رہا، مگر اتنا کافی نہ تھا۔

"تمہاری ان نظموں کے بعد جن میں کھلی ہوئی بہتان طرازی کی گئی ہے ہم تم پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ تمہیں عملی طور پر اپنے قلم سے کام لیتے ہوئے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ تم نے

اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے۔،، اعلیٰ ترین عہدےدار مختاریکوف نے حکم دیا۔

میرے دوست کے لئے اس میں کوئی فرق نہ تھا، تنقید کی ضرورت ہو تو وہ تیار اور اگر اس سے یہ کہا جائے کہ خود اپنی غلطیوں کا سدباب کرے تو اسکے لئے بھی راضی بہ رضا۔ اس نے فوراً قلم سنبھالا اور ایک نئی نظم لکھی جسکا عنوان تھا ''محنتی مرجانات،،۔ مرجانات نام کی اس لڑکی کو جو نظم کا بنیادی کردار تھی ایک سرگرم اور صف اول کی کارکن کے طور پر پیش کیا گیا تھا جس نے اپنی زبردست محنت کی بدولت مختصرسی مدت کے دوران اپنے پنچائتی فارم کو صف اول کا پنچائتی فارم بنا دیا۔ اس نے منصوبے سے زیادہ پیداوار کی اور یہی نہیں بلکہ شوقیہ فنکاروں کے ایک مقابلے میں خود اپنا لکھا ہوا ایک گیت گا کر اعلیٰ ترین انعام جیت لیا۔ نظم فوری طور پر ایک رسالے میں شایع ہوئی اور پھر کتابی صورت میں بھی سامنے آگئی۔

لیکن اب وقت بدل چکا تھا۔ کل جن اخباروں نے اس پر کیچڑ اچھالنے اور سوویت زندگی کو بدنام کرنے کے الزامات لگائے تھے، اب یہ لکھنا شروع کردیا کہ وہ ہر طرح کی خامیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔

اب پھر اعلیٰ عہدےدار مختاریکوف نے غصے میں میز پر مکہ جماتے ہوئے سوال کیا:

''تم نے کہاں کوئی ایسا پنچائتی فارم دیکھا جو کمزوریوں اور خامیوں سے پاک ہو؟ ایسا مثالی فارم کہاں اور کس جگہ ہے؟،،

بیچارہ ادیب جواب کیا دیتا۔ بعض گرہیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آدمی ہاتھوں سے نہیں کھول سکتا کیونکہ وہ بہت سختی سے لگی ہوتی ہیں۔ دانتوں کا استعمال اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ اس گرہ میں نجاست لگی ہوتی ہے۔ میرے دوست نے سمجھ لیا کہ یہ گرہ بھی اسی قسم کی ہے اور وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔

اسکی خاموشی کا یہ وقفہ خاصا طویل تھا، لگ بھگ دس سال اور اس بیچ اس نے ادیبوں کی یونین کے دفتر میں قدم بھی نہیں

رکھا۔ صرف ایک بار اس وقت آیا جب مکان ملنے کی باری آئی اور اسے دفتر بلایا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس بار تو مُکو جانا ہی تھا۔

اسی درمیان مختاربیکوف کو غلط رپورٹیں بھیجنے کے جرم پر اس اعلی عہدے سے برطرف کر دیا گیا۔ اسکے اس حشر پر کسی نے افسوس تک کا اظہار نہ کیا۔

برسبیل تذکرہ، مختاربیکوف کو بحیرۂ کیسپین کے ٹھنڈے اور کھاری پانی میں نہانے کا بےحد شوق تھا۔ اس نے ساحل کا ایک حصہ اپنے لئے وقف کر رکھا تھا اور صبح و شام شاہی اہتمام کے ساتھ وہ ایک بڑی سی سرکاری کار میں وھاں جاتا تھا۔ اس کا مکان بھی ساحل کے قریب ھی واقع تھا۔ لیکن برطرفی کے بعد مختاربیکوف کی صورت ھی نظر نہ آئی۔ عام لوگوں کے ساتھ سمندر میں تیرنا اسکے وقار کے خلاف تھا۔ غالباً اس میں وقت کے مطابق خود کو تبدیل کرنے اور غرور پر قابو حاصل کرنے کی صلاحیت ھی نہ تھی۔

موضوع کے بارے میں کچھ اور باتیں۔ جب بھی آپ گھر سے باھر قدم نکالیں آپ کو لاتعداد چڑیاں نظر آئینگی، کچھ آس‌پاس اڑتی ھوئی، کچھ پیڑوں اور جھاڑیوں پر بیٹھی ھوئی اور کچھ زمین پر پھدکتی ھوئی۔ وہ آسمان کی بلندیوں میں بھی پرواز کرتی ھیں، کچھ بہت اوپر، کچھ نسبتاً نیچے۔ ان میں ابابیلیں بھی ھونگی، مختلف طرح کے کوے اور گوریاں بھی۔ اور ان ساری چڑیوں کے ھجوم میں صرف ایک عقاب آسمان میں نظر آئےگا۔ عقاب دوسرے تمام پرندوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلندی پر اڑتا ھے، نگاھوں سے دور بہت دور۔ لیکن اگر آسمان میں ایک بھی عقاب محو پرواز ھے تو نظر سب سے پہلے اسی پر پڑےگی۔ اور یہ اس لئے کہ یہ پرندہ دوسری تمام چڑیوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ بلندی پر اڑتا ھے، دور بہت دور، اور اسی لئے ھماری نظر سب سے پہلے اسی پر پڑتی ھے۔ اس گوریئے کا نمبر بعد میں آتا ھے جو دروازے سے چند قدم کی دوری پر کسی جھاڑی میں بیٹھی ھو۔

لیکن عقاب کی ایک جھلک دیکھ لینے سے کوئی عقاب نہیں بن جاتا۔ کوئی ادیب جب کسی ہیرو پر کوئی نظم لکھتا ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ وہ خود بھی ہیرو بن جاتا ہے۔ میں ایسے بہت سارے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں اپنی پرجوش اور ولولہ انگیز نظموں کی بدولت شہرت ملی ہے، لیکن خود بزدل ہیں۔ اگر کوہستانی سرزمین کے بہادر سپوت مخاچ دخادائیف کو نئی زندگی مل جائے اور وہ قبر سے اٹھ کر ہماری اپنی دنیا میں آجائے تو وہ اس ''عالم،، سے جس نے اسکے بارے میں مقالہ لکھا ہے کیا کہےگا؟

وہ کہےگا کہ ''جب تم اپنے لکھے ہوئے کسی ایک جملے کو کسی مدیر کی دست‌برد سے بچا نہیں سکتے تو پھر تم میری جرأت‌آمیز زندگی کے بارے میں کیا لکھ سکوگے۔ تمہاری حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے میرے بارے میں جو رائے قائم کی ہے اسے ایک معمولی مدیر اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرا سکتا ہے اور تم یہ جرأت نہیں کر سکتے کہ اس کی اس حرکت پر احتجاج کی آواز بھی بلند کرسکو۔ نہیں، تم اس لائق نہیں کہ مخاچ دخادائیف جیسے انسان کے بارے میں کوئی مقالہ لکھ سکو!،، اگر واقعی کوہستان کا وہ بہادر سپوت دوبارہ جی اٹھے تو یہی کہےگا۔

یوں لگتا ہے جیسے کچھ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر انہوں نے کسی عظیم موضوع پر کچھ لکھ لیا تو بس وہ خود بھی عظیم بن جائینگے۔ لیکن عظمت کے حصول کےلئے زبردست‌ترین سادگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پانی کے ایک چھوٹے سے قطرے میں بھی طوفان انگڑائی لیتے رہتے ہیں۔ ایک عظیم انسان اور ایک حقیر آدمی میں اصل فرق یہ ہے کہ جہاں معمولی آدمی صرف بڑی بڑی چیزوں اور بڑے مظاہر ہی کو دیکھنے اور محسوس کرنے کا عادی ہوتا ہے اور اپنے آگے بکھری ہوئی چیزوں کو نہیں دیکھ پاتا، وہاں عظیم انسان بیک‌وقت بڑی چیزوں کو بھی دیکھتا ہے اور چھوٹی چیزوں کو بھی۔ اور اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ خود بھی قطرے میں دریا کا مشاہدہ کرے اور دوسروں کو بھی اس حقیقت سے واقف کرا سکے۔

یاد کی ایک جھلک۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ باصلاحیت ادیب گمنامی میں زندگی گذارتے ہیں اور ایسے لوگ جن کے پاس کوئی خاص صلاحیت نہیں ہوتی بڑی آن بان کے ساتھ سر اٹھا کر چلتے ہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب مصنف کی صرف نیت اور ارادے کو اہمیت دی جاتی ہے، اور اسکی فکر نہیں کی جاتی کہ کتاب لکھی کیسی گئی ہے اور اسکے ذریعے ادیب نے جس لیاقت اور فنکاری کا مظاہرہ کیا ہے وہ کس پائے کی ہے۔ ایسی صورت میں استادوں کی تعداد طالب‌علموں سے زیادہ ہوتی ہے، قدردان زیادہ اور مال کم ہوتا ہے اور بکواس کرنے والوں کی تعداد سچے ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

ایسا ہی زمانہ تھا جب ابا نے شامیل پر ایک طویل نظم لکھنے کا فیصلہ کیا۔ نظم اشاعت کےلئے تیار ہی تھی کہ ایک فرمان کے ذریعے یہ اعلان کیا گیا کہ شامیل کو آج سے ہمیشہ ایک برطانوی اور ترک جاسوس سمجھا جائے۔ ہمیں یہ بتایا گیا کہ شامیل ۲۵ برسوں تک جس چیز کے لئے لڑتے رہے وہ داغستان کے عوام کی آزادی نہیں تھی بلکہ ان کے گلے میں غلامی کا پٹا ڈالنے کی کوشش تھی۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ ابا اس نظم کا کیا کریں؟ اشارے کنائے میں ان سے یہ بات کہی گئی کہ آج کے خوش‌آئند دور میں کسی فرسودہ تاریخی موضوع پر اپنا وقت ضایع کرنا ان کے لئے شایان شان نہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ وہ کسی ایسے موضوع پر کوئی نظم لکھیں جو ہمارے دور اور آج کے قارئین سے زیادہ قریب ہو۔

ان دنوں ہمارے یہاں زندہ‌دل شاعر ابوطالب اکثر و بیشتر آیا کرتے تھے۔ اور وہ جب بھی آتے تو ان کا زورنا یا بانسری ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی۔

وہ آتے اور بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھ کر اپنا ساز چھیڑتے ہوئے ابا سے کہتے: ''حمزہ ان باتوں کا اتنا اثر نہ لو! میں جب لڑکا تھا اور شاعری شروع نہیں کی تھی، ان دنوں میں اسی زورنا کو بجا کر اپنے اور اپنے خاندان کےلئے روزی کمایا کرتا تھا۔ جس طرح کی بھی موسیقی درکار ہو اس سے پیدا کی جا سکتی ہے۔

آؤ ہم دونوں اپنے اس دور کو یاد کریں، کچھ دنوں کے لئے شاعری چھوڑ دیں اور موسیقی سے دل بہلائیں۔ میں اپنا زورنا بجاؤں اور حمزہ تم ڈھول بجاؤ جو نسبتاً زیادہ آسان کام ہے۔ ،،

''ابوطالب ایسی بات نہ کرو۔ اگر ہم لوگ زورنا بجانا اور ڈھول پیٹنا شروع کر دیں تو یہ اتنی بری بات نہیں ہوگی۔ کیونکہ زورنا بجانے والے کی دھن پر ہی رقاص ناچتے ہیں اور نٹ کرتب دکھاتے ہیں۔ سازندہ زمین پر ہوتا ہے جب کہ نٹ اوپر بلندی پر۔ ابوطالب اب تم ہی بتاؤ کہ کٹھن کام کون سا ہے؟ میں اور تم قلابازوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب لوگ چاہتے ہیں کہ ہمیں قلاباز اور رقاص دونوں ہی بنا دیں۔ ،،

یہ سن کر زندہ‌دل ابوطالب افسردہ سے ہوگئے۔ ان کے زورنا کی لے بھی درد میں ڈوب گئی۔ تھوڑی دیر تک وہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے پھر انہوں نے سر اٹھایا اور کہا:

''شعر گوئی کوئی آسان کام نہیں۔ ،،

پربت کی اونچی چوٹی، یوں لگتا ہے دور نہیں ہے
پربت کے دامن سے دیکھو بالکل پاس نظر آتی ہے
لیکن جب پتھریلے رستے، برف کی راہیں طے کرنی ہوں
چڑھتے جاؤ، بڑھتے جاؤ، دور کھسکتی ہی جاتی ہے

یونہی لگتا شعر کا لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے
لیکن جب خود سر لفظوں سے پہروں لڑنا پڑتا ہے
پھربھی مصرع بن نہیں پاتا، تب کھلتا ہے بھید کہ اس سے
پربت کی چوٹی چڑھ لینا کتنا سستا پڑتا ہے

ایک چڑیا کی کہانی جس نے عقاب کا ہمسر بننا چاہا۔ ایک بار کیا ہوا کہ بھیڑوں کا ایک گلہ پہاڑوں پر گھاس چرنے کے بعد نیچے وادی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ اچانک ایک عقاب بجلی جیسی تیزی کے ساتھ پر جوڑ کر نیچے اترا بھیڑ کے ایک بچے کو اپنے پنجوں سے پکڑا اور چشم زدن میں پھر نظروں سے غائب ہوگیا۔ ایک چھوٹی سی چڑیا بھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ جانے اس کے دماغ میں کیا سمائی کہ اس نے من ہی

من یہ فیصلہ کر لیا کہ عقاب کی طرح وہ بھی شکار کر سکتی ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ یہ اور زیادہ بہتر ہوگا کہ بچے کو نہیں بلکہ کسی پورے بھیڑے کا شکار کیا جائے۔ چنانچہ وہ پہلے تو آسمان کی بلندیوں پر پہنچی، وہاں سے نشانہ لگایا اور بازو سمیٹ کر پتھر کی طرح نیچے آئی۔ یہاں نیچے وہ ایک بھیڑے کی سینگ سے ٹکرائی اور اس ٹکر کی ضرب نہ سہ کر اس نے تھوڑی دیر میں دم توڑ دیا۔

"ایک بار ایک مکھی نے بھی پتھر کو ٹھیلنے کی کوشش کی تھی،، چرواہے نے مردہ چڑیا ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

اور یوں جس چڑیا نے عقاب کی ہمسری کی تمنا کی تھی، مکھی کی ہم پلہ قرار پائی۔

موضوع پھر مرکز توجہ ہے۔ موضوع عشق بھی ہے اور ایک عہد بھی۔ موضوع منت و سماجت بھی ہے اور دعا بھی، اور جیسا کہ مشرق میں ایک عام کہاوت ہے، دعا جتنی بار کی جائے اسکی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔

البتہ یہ بات موضوعات کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی۔ اگر کوئی ادیب کسی موضوع کو بار بار دھراتا رہے تو وہ فرسودہ ہو جاتا ہے اور اسکی قدر و قیمت جاتی رہتی ہے۔ ہیرا جتنا بڑا ہوگا اتنا ہی بیش‌قیمت ہوگا، ہیرے کے چورے کی ضرورت کسی کو نہیں ہوتی۔

ایک بار میں نے اپنی روسی استانی ویرا واسیلیونا پر ایک نظم لکھی۔ نظم پڑھنےوالوں کو بھی پسند آئی اور نقادوں نے بھی اسکی تعریف کی۔ اب کیا تھا، خوشی کے نشے میں میں نے اسی موضوع پر بہت ساری نظمیں لکھ ڈالیں۔

میری یہ نظمیں اس شراب جیسی نہ رہ گئیں جو خم میں پختہ ہوتی ہے بلکہ اس شراب جیسی جو خم کے دھوون پر مشتمل ہو۔

اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچی شراب کو بڑی اچھی شراب کہہ کر پیش کی جاتی ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ ہم لوگ جب اپنے ماسکو کے دوستوں کی خاطر داغستانی شراب سے کرتے تو کیا طریقہ اختیار کرتے تھے۔

میرے قفقازی دوست یا خود میں جب بھی اپنے وطن سے ماسکو واپس آتا تو ہمارے ساتھ کچھ شراب بھی ہوا کرتی۔ ہمارے دوست جمع ہوتے، ان کے سامنے پیپے کا منھ کھولا جاتا اور جشن شروع ہو جاتا۔ شراب پرانی، سال‌خوردہ اور بہترین قسم کی ہوتی۔ ہمارے دوست شراب کی تعریف تو کرتے ہی ساتھ ساتھ یہ خبر اپنے دوستوں کے حلقوں تک پہنچا دیتے، نتیجہ یہ ہوتا کہ ہماری شراب کی مقبولیت بڑھتی جاتی۔ آپ جانیں کتنا ہی بڑا پیپہ کیوں نہ ہو سمندر کی طرح اتھاہ تو ہوتا نہیں۔ لیکن آنےوالوں کی خاطر بھی ضروری تھی۔ ہم لوگوں نے اس کا ایک راستہ نکالا اور میں اس جرم کا اقبال کرتا ہوں کہ ہم معمولی شراب کی بوتلیں خرید لاتے، بوتلوں کی شراب پیپے میں الٹ دیتے اور یہ کہتے کہ یہ ہمارے اپنے کلال‌خانوں میں بننےوالی بہترین شراب ہے۔ ہمارے دوستوں کو فرق محسوس ہی نہ ہوتا بس ایک مہمان صاحب ذوق نکلا جس نے جام سے چسکی لی، میری طرف دیکھا اور سر ہلا کر چپ ہوگیا۔ باقی لوگ تو جتنی پیتے جاتے تھے اتنا ہی دھت ہوتے جاتے تھے اور جتنا دھت ہوتے جاتے تھے اتنا ہی شراب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے۔

ایسا ہی کچھ میری ان نظموں کے ساتھ بھی ہوا۔ بس کچھ دقیقہ‌رس، صاحب‌ذوق اور سخن‌شناس ایسے تھے جو سر ہلاتے اور کہتے:

"میرے بھائی، دلاگولوف بھی تو یہاں اسی غرض سے آیا تھا۔" یا کبھی یہ کہتے کہ:

"ایک گاؤں کےلئے ایک ہی بدھو کافی ہے۔"

اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ میں بھی وہی کر رہا ہوں جو چھڑیاں بنانے والے ایک ماہر دستکار نے اپنی چھڑیوں کے ساتھ کیا تھا۔

میں آپ کو یہ تینوں کہانیاں اسی ترتیب سے سناتا ہوں۔

میرا لڑکپن تھا جب قربان علی ڈاکیہ جو ابیوت نامی گاؤں کا ایک چٹکلےباز تھا خطوں کا پلندہ لئے ہمارے گاؤں آتا تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتا ابا سے ضرور ملتا، حقہ پیتا اور ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتا۔ مجھے نہیں معلوم اپنی صحبت سے نوازنے کا

شرف اس نے صرف ابا تک محدود کیوں کر رکھا تھا؟ موضوع ھمیشہ ایک ھی ھوتا، شادی اور عام شادی‌بیاہ نہیں بلکہ خود اسکی اپنی نئی شادی۔ کیونکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ھر ھفتے شادی کرتے ھیں اور ھر مہینے طلاق دیتے ھیں۔

وہ بھی کچھ ایسا ھی زمانہ تھا۔ اس نے بیوی کو حال ھی میں طلاق دی تھی اور اب کسی نوجوان بیوہ کی تلاش تھی جس سے وہ دوبارہ شادی کر سکے۔ شاید اس کو کوئی موزوں بیوہ مل بھی گئی تھی کیونکہ اپنی گفتگو کے دوران وہ بار بار اسکی خوبصورتی، اسکے شباب اور اسکی نیک دلی کا ذکر کیا کرتا تھا۔

پھر اچانک اس بیوہ کا تذکرہ بند ھو گیا۔ قربان‌علی حسب‌معمول اب بھی آتا، باتیں بھی کرتا، لیکن ان باتوں میں پنچائتی فارم کے معاملات، موسم اور اس طرح کے بہت سارے موضوعات آتے لیکن شادی کا ذکر نہ کرتا۔

ایک دن ابا نے پوچھ ھی لیا: ''کہو بھئی! اس بیوہ سے شادی کر لی؟،،

''ارے کہاں، حمزہ! میں تو پوری طرح تیار تھا لیکن وہ راضی نہ تھی۔ اب مجھے داغستان کے طول و عرض میں گھوم پھر کر اپنے لئے کوئی نوجوان بیوہ ڈھونڈنی پڑےگی۔،،

کافی عرصے تک قربان‌علی غائب رھے، میرے خیال میں وہ سچ‌مچ کسی موزوں عورت کی تلاش میں دیہاتوں کا چکر لگاتا پھر رھا تھا۔ اسکی غیرموجودگی میں اس کا لڑکا ڈاک تقسیم کرتا پھرتا۔ پھر ایک دن وہ بدنصیب نوشہ صاحب ھمارے مکان میں داخل ھوئے تو ھم سب نے بڑی بےصبری سے پوچھا:

''کہئے آپ کا راستہ زیادہ لمبا تو نہ تھا اور زیادہ زحمت تو نہیں اٹھانی پڑی؟،،

''ھوتا تو چھوٹا ھی اور سیدھا بھی، لیکن دلاگولوف نے اسے لمبا اور ٹیڑھا میڑھا بنا دیا۔،،

''وہ کیسے؟،، دوسرا سوال ھوا۔

''ایسے کہ میں جہاں کہیں بھی پہنچتا لوگ کہتے، تم نے دیر کردی۔ دلاگولوف یہاں پہلے ھی ھو گیا ھے وہ بھی اسی غرض سے آیا تھا۔،،

دریش دلاگولوف آپ جانیں، آوارستان کا سب سے بڑا عیاش تھا۔ ۱۹۳۸ء میں اس نے ۱۸ ویں بار شادی کی تھی۔

اس طرح ڈاکیہ قربان علی نے داغستان میں ایک نئی کہاوت رائج کر دی وہ یہ کہ ''دلاگولوف یہاں پہلے ہی ہوگیا ہے وہ بھی اسی غرض سے آیا تھا۔''

اب میں جو کہانی آپ کو سنانے جا رہا ہوں وہ ایک بدھو کے بارے میں ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر گاؤں میں ایک بدھو ضرور ہوتا ہے، اور یہ بات اچھی بھی ہے۔ بری تب ہوتی ہے جب کسی ایک گاؤں میں بہت سارے بدھو جمع ہو جائیں، یوں کسی گاؤں میں کوئی بھی بدھو نہ ہو تو بھی ایک طرح کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ سارے بدھو ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور ایک دوسرے سے ملتے بھی رہتے ہیں۔ رسم کا پاس کرتے ہوئے گورتہ کولی گاؤں کا بدھو حنزہ کے بدھو سے ملنے آیا۔

''بدھو میاں! السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام بدھو صاحب!''

دونوں اچھے دوستوں کی طرح ملے۔ آتشدان کے پاس محفل جمی، دونوں نے جی بھر کر کھانا کھایا اور شراب پی۔

تیسرے دن گورتہ کولی گاؤں کے بدھو نے گھر جانا چاہا۔ میزبان نے مہمان بدھو کو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ رخصت کیا، تحفے دئے اور گاؤں کی حد تک اسے رخصت کرنے اسکے ساتھ گیا۔

یوں مہمان‌نوازی کے سارے تقاضے پورے کئے گئے۔ لیکن دستور یہ ہے کہ گاؤں سے رخصت ہونے کے بعد مہمان اگر اپنے گھر کی طرف ایک قدم بھی آگے بڑھ جائے تو سابق میزبان جو بھی چاہے اسکے ساتھ کرسکتا ہے کیونکہ اب وہ مہمان نہیں رہجاتا۔ چنانچہ گورتہ کولی گاؤں کے بدھو نے جیسے ہی گاؤں کی حد سے قدم باہر نکالا حنزہ والا بدھو اس پر ٹوٹ پڑا۔

''کیوں بھئی آخر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

''اب کبھی مجھ سے ملنے مت آنا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایک گاؤں کےلئے ایک بدھو کافی ہوتا ہے؟''

جب کبھی میں اس حکایت پر غور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ ایک گاؤں کے لئے عقلمند آدمی بھی ایک ہی کافی ہوتا ہے۔

اپنی نوٹ بک سے۔ ایک خان نے جو خاصا امیر تھا ایک بار ایک غریب آدمی سے پوچھا:

"مرغابی کا کون سا حصہ سب سے زیادہ مزیدار ہوتا ہے؟ اگر تمہارا جواب صحیح ہوا تو تمہیں انعام دیا جائے گا۔"

غریب آدمی نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جواب دیا:

"پیچھے کا حصہ۔"

مرغابی پک گئی تو خان نے پچھلا حصہ چکھا جو اسے مزیدار لگا۔ اب اس نے ایک اور غریب آدمی سے سوال کیا:

"تمہارے خیال میں بھینس کا کونسا حصہ مزیدار ہوتا ہے؟"

اس غریب کو بھی انعام حاصل کرنے کی خواہش تھی اس نے بھی پہلے والے آدمی کا جواب دہرا دیا: "پچھلا حصہ۔"

خان نے بھینس کا پچھلا حصہ پکوا کر چکھا اور حکم دیا کہ اس آدمی کو کوڑے لگائے جائیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ ان ادیبوں کو کوڑے نہیں لگائے جاتے جو مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کی باتیں دہراتے رہتے ہیں۔

اور اب اونتسوکول کی چھڑی پر تحریر کے بارے میں۔ ماسکو میں ایک ادیب ہیں ولادلین باخنوف جو پیر میں لنگ کی وجہ سے چھڑی لے کر چلتے ہیں۔ ایک بار جب میں چھٹیوں میں گھر جارہا تھا تو میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ لوٹتے ہوئے میں ان کے لئے اونتسوکول کے مشہور دستکاروں کی بنائی ہوئی چھڑی لاؤنگا۔ گھر پہنچتے ہی میں نے اونتسوکول کے ایک دستکار کو لکھا کہ میرے لئے ایک چھڑی بنا دیں۔ میں ان سے واقف تھا، وہ استاد کاریگر اور ابا کے دوستوں میں تھے، اس لئے مجھے یقین تھا کہ وہ میرے لئے جو چھڑی بنائیں گے وہ بہترین ہوگی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس چھڑی پر کیا عبارت نقش کراؤں جو مناسب ہو۔

میں اس فکر ہی میں تھا کہ ایک بڑے اخبار میں ادبی مسائل پر ایک مضمون نظر سے گذرا، اسکا عنوان تھا: ''تنقید کی جگہ سونٹا،،۔

میں اچھل پڑا۔ اپنے ادیب دوست کو پیش کی جانے والی چھڑی کےلئے اس سے زیادہ موزوں عبارت اور کیا ہو سکتی ہے۔

پندرہ دن کے اندر اندر چھڑی تیار ہو گئی جو اونتسوکول کی دستکاری کا بہترین نمونہ تھی۔ عبارت کےلئے مناسب ترین جگہ پر یہ الفاظ کندہ تھے: ''ولادلین باخنوف کے لئے، تنقید کی جگہ سونٹا، رسول حمزاتوف کی جانب سے۔،،

یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ اونتسوکول کی بنی چھڑیاں مخاچ قلعہ، کسلاوودسک اور پیاتیگورسک کی تحفے تحائف کی دکانوں پر اور پہاڑی گاؤں کے بازاروں میں بکتی ہیں۔

چند مہینوں بعد اونتسوکول کی جو چھڑیاں ان جگہوں پر بکنے کےلئے آئیں ان میں سے ہر ایک پر یہی جملہ نقش تھا۔ ''ولادلین باخنوف کےلئے، تنقید کی جگہ سونٹا، رسول حمزاتوف کی جانب سے۔،،

چھٹیوں میں جو لوگ سیر و سیاحت کی غرض سے پہاڑوں پر آتے اور چھڑیاں خریدتے، شاید وہ اس پر لکھی عبارت پڑھ کر حیرانی میں پڑ جاتے ہونگے۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب تو خود مجھے تھا۔

اب میں نے چھان بین شروع کی۔ پتہ یہ چلا کہ جس بڈھے کاریگر نے میرے لئے چھڑی بنائی تھی اسے روسی زبان کا ایک حرف بھی نہیں آتا تھا۔ اس نے محض اتنا کیا کہ جس جملے کو میں نے کاغذ پر لکھ دیا تھا اسے بے کم و کاست چھڑی پر اتار دیا۔ اس نے سوچا یہ کوئی بڑے پتے کی بات ہوگی تبھی تو ایک شاعر نے اس کے نقش پر اصرار کیا ہے۔ تو پھر اس بصیرت افروز جملے سے دوسری چھڑیوں کو کیوں محروم رکھا جائے؟

اس میں بڈھے کاریگر کا کوئی قصور نہیں، اس سے غلطی صرف اتنی ہوئی کہ اس نے ایک شاعر کی دانشمندی پر ضرورت

سے زیادہ اعتبار کر لیا۔ اور اسکا یہ اعتبار نیک نیتی اور صدق دلی پر مبنی تھا۔ لیکن ہم تجربہ کار ادیب بھی تو کبھی کبھی اس بڈھے کاریگر جیسی حرکت کرتے ہیں۔

موضوع کے بارے میں آخری گفتگو۔ ایک موضوع البتہ ایسا ہے جو دعا کی طرح جتنی بار دھرایا جائے اس کی قدرو قیمت اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے اور شان و شوکت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہ ہے مادروطن۔

پہاڑوں میں یہ دستور ہے کہ بچے کو سزا دینی ہو تو اسکے جسم کے کسی بھی حصہ پر وار کیا جا سکتا ہے، لیکن منہ پر ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ انسانی چہرہ بڑی حرمت رکھتا ہے۔ اور ہر پہاڑی کے لئے یہ حرمت قانون کا درجہ رکھتی ہے۔

داغستان میرا چہرہ ہے۔ خبردار اس پر ہاتھ نہ لگانا۔

ہمارے پہاڑی باشندے ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے بھی زبردست صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں۔ آپس میں وہ ایک دوسرے کے لئے سخت سے سخت الفاظ اور گندی سے گندی گالیاں بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ لڑائی کتنے ہی دیر تک چلتی رہے لیکن گالیاں صرف ایک دوسرے کو دی جائینگی، ایک دوسرے کی ماں بہن کی عزت کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔ لیکن اگر اتفاقاً یا بداحتیاطی کی بدولت زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل' جائے جس سے ماں بہن کی آبرو پر حرف آتا ہو تو پھر تلواریں نکل آتی ہیں۔

داغستان میری ماں ہے۔ جو لوگ مجھ سے الجھنا چاہیں میں انہیں خبردار کرتا ہوں۔ مجھے جو بھی جی چاہے کہہ لو میں برداشت کر لونگا لیکن میرے داغستان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو پھر ٹھیک نہ ہوگا۔

داغستان میری محبت ہے، میرا عہد ہے، میری منت و سماجت ہے اور میری دعا ہے۔ داغستان تو اور صرف تو ہی وہ موضوع ہے جو میری تمام کتابوں کا خاص تصور اور میری ساری زندگی کا سرمایہ ہے۔

کبھی مجھ سے یہ کہا جاتا ہے کہ میں تیرے ماضی کی بات کروں۔ اپنی قدیم روایات و رسوم کی بات، اپنی مقبول لوک کتھاؤں اور اپنے گیتوں کی بات، شادی بیاہ کے ہنگاموں اور شمشیر کی جھنکاروں کی بات، لڑائیوں اور دوستیوں کی بات، مستقل مزاج اور دلیر مریدوں اور وفادار دوشیزاؤں کی بات، نیک‌دلی اور جرأتمندی کی بات، نوجوانوں کے بہتے ہوئے خون اور ماؤں کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں کی بات۔

کبھی مجھے حکم دیا جاتا ہے کہ میں اپنے موضوع کو صرف تیرے حال تک محدود رکھوں۔ ریاستی اور پنچائتی فارموں تک، گروہوں، جتھوں اور جتھوں کے لیڈروں تک، اپنے کتب‌خانوں، تھیٹروں اور محنت کے ذریعے انجام دئے جانےوالے کارناموں تک۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ میں خود کو نہ صرف ماضی تک محدود رکھ سکتا ہوں نہ محض حال تک۔ میرے سامنے تو صرف ایک داغستان ہے جسکی زندگی ہزارہا برسوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ میرے لئے اسکا ماضی، اسکا حال اور اسکا مستقبل ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں، اور اس حد تک کہ میں انہیں ادوار کی شکل میں الگ الگ نہیں کرسکتا۔

دوسرے ملکوں اور دوسری ریاستوں کی تاریخیں برسہابرس سے لکھی جاتی رہی ہیں، محض خون سے نہیں بلکہ کاغذ پر قلم اور روشنائی سے۔ فوجی سپاہیوں اور سالاروں ہی نے یہ تاریخ نہیں لکھی ہے بلکہ ادیب اور مورخ بھی اس کام میں مصروف رہے ہیں۔

داغستان کی تاریخ صرف تلواروں سے لکھی جاتی رہی ہے۔ داغستان کے ہاتھوں میں بھی قلم آیا لیکن ۲۰ ویں صدی میں داخل ہونے کے بعد۔

داغستان! میں ان راستوں پر گھوما ہوں جہاں ماضی میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جاچکی ہیں اور میں نے ان میدانوں کو دیکھا ہے جن میں تیرے بیٹوں کی ہڈیاں بوئی ہوئی ہیں۔ ہمارے پنچائتی فارموں کو جن کی زمین پر گیہوں اور مکئی کی کاشت ہوتی ہے اس پر برا نہیں ماننا چاہئے۔ کیونکہ جب میں اپنی

نظموں میں آج کے داغستان کا ذکر کرتا ہوں تو ماضی اسکا برا نہیں مانتا۔

جب میں دوردراز ملکوں کی سیر کرکے واپس آتا ہوں تو میرے ہم‌وطن پہاڑی لوگ مجھے گھیر لیتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے کہاں کہاں کیا کیا دیکھا۔ وہ لوگ مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں اور بڑے غور سے میری باتیں سنتے ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ تین گھنٹوں تک لگاتار بات‌چیت کرسکتا ہوں، اور اس دوران میں انہیں فرانس اور ہندوستان کی، جاپان یا ترکی کی باتیں بتاتا ہوں۔ تین گھنٹے اسی میں گزر جاتے ہیں اور پھر نہ جانے کیسے داغستان کا ذکر چھڑ جاتا ہے۔ اب میں اپنے داغستان کی بات شروع کر دیتا ہوں اور میرے دوست اس توجہ کے ساتھ سنتے رہتے ہیں جیسے میں انہیں کسی نئے دیس کی بات بتا رہا ہوں۔ حالانکہ یہ اسی داغستان کی بات ہوتی ہے جہاں وہ خود رہتے ہیں۔

محمود ایک عظیم شاعر تھے جن کا واحد موضوع تھا مریم کے ساتھ ان کا عشق۔ ایک بار ان کے ایک بہت قریبی دوست نے ان سے فرمائش کی کہ اسکے بچے کے لئے ایک لوری لکھ دیں۔ محمود نے فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انہوں نے لوری اس لئے لکھی تھی کہ بچہ آرام سے سو سکے، لیکن یہ لوری سن کر وہ اور بھی رونے لگتا۔

ایک دوسرے دوست نے محمود سے درخواست کی کہ اسکی مرحوم بیوی کا مرثیہ لکھ دیں۔ محمود نے اسکے لئے بھی اپنا پورا زور صرف کر دیا لیکن یہ کوشش بھی بےکار رہی کیونکہ مرثیہ سننے کے بعد کسی بھی آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا، اسکے بجائے بعض لوگ تو مسکرانے لگے۔

لیکن محمود نے مریم کے ساتھ اپنے ناکام عشق کے بارے میں جو نظمیں لکھی ہیں انہیں سن کر آج بھی لوگ رو دیتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ مریم محمود کا خاص موضوع تھی... میرا خاص موضوع ہے، داغستان۔ پتہ نہیں میرا عشق معمولی ہے یا عظیم، معلوم نہیں میری سچائی گہری ہے یا سطحی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے جذبات قدیم ہیں یا جدید۔ بہرحال داغستان!

میں تیرے بارے میں لکھ رہا ہوں اور جب بھی میں تیرے بارے میں کچھ لکھتا ہوں تو میرا قلم تھرتھرانے لگتا ہے۔

ابا کہا کرتے تھے: اگر تم نے تربوز سڑک کے کنارے بوئے ہیں تو لوگ انہیں پکنے سے پہلے ہی توڑ لینگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے: اس پتھر کو ہاتھ نہ لگاؤ جسے اٹھانا تمہارے بس میں نہ ہو۔ تیرکر اتنی دور نہ جاؤ کہ واپس آنا مشکل ہو جائے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: چشمے میں اگر پانی ٹخنوں ہی تک ہے تو پائینچے گھٹنوں تک نہ اٹھاؤ!



صنف

بیوقوف چیخ پکار کے ذریعے لوگوں کو
لاجواب کر دیتا ہے اور عقلمند صرف ایک
چست اور برجستہ فقرے سے۔

بہار کا موسم گانا گانے کے لئے موزوں ہے اور
جاڑے کا موسم کہانی سنانے کے لئے۔

میں ایک پہاڑ کے سامنے کھڑا ہوں جسے مجھے بہرحال سر کرنا ہے۔ میرے پاس بہترین گھوڑا ہے جو مجھے کسی بھی درے سے نکال لےجاسکتا ہے۔ وہ پہاڑ میرا موضوع ہے اور میری زبان میرا گھوڑا۔ اب مجھے بہر طور وہ راستہ تلاش کرنا ہے جس پر چل کر میں ڈھلوان پہاڑ پر چڑھ سکوں۔

میں جن پہاڑی باشندوں کا جانشین ہوں وہ سب کے سب سیدھے راستے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ راستہ تباہی کی طرف بھی لےجاسکتا ہے اور خاصا خطرناک بھی ہے لیکن اگر یہ راستہ اپنایا جائے تو آدمی کو اپنی منزل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

یا یوں کہا جائے کہ میں ایک قلعہ کے سامنے کھڑا ہوں۔ جسے مجھے ہر حال میں فتح کرنا ہے۔ میرے پاس ایک بہترین اسلحہ ہے جو مقابلے کے وقت مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔ یہ قلعہ میرا موضوع ہے اور زبان میرا اسلحہ، مگر مجھے ایک ایسا طریقہ تلاش کرنا ہے جس پر عمل کرکے میں اس ناقابل تسخیر قلعہ پر آسانی کے ساتھ قبضہ کر سکوں۔ مجھے فیصلہ یہ کرنا ہے کہ قلعہ پر اچانک حملہ کر دوں یا محاصرے کے ذریعے قلعے کی تسخیر کے طریقے کو ترجیح دوں؟

ایک کھیت میں باجرہ بویا ہوا ہے اور قریب ہی ایک پہاڑی نالہ بھی بہہ رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں نالے کا پانی کھیت تک کیسے پہنچاؤں؟

چولھے میں لکڑی بھی موجود ہے اور اس پر ایک پتیلی بھی چڑھی ہوئی ہے۔ میرے پاس تھوڑی بہت چیزیں بھی ہیں جو پتیلی میں پکائی جا سکتی ہیں۔ لیکن میں سوچ یہ رہا ہوں کہ کھانے کےلئے کیا چیز پکائی جائے؟

مدیر موصوف نے اپنے خط میں مجھے اس بات کی کھلی چھوٹ دیدی ہے کہ میں موضوع کے اظہار کےلئے جو ہیئت چاہوں اپناؤں، جس صنف میں چاہوں اپنے احساسات قلمبند کروں، وہ طویل مختصر افسانے کی صنف ہو، کہانی ہو، نظم ہو یا مضمون۔ بات یہ ہے کہ جب بہت ساری چیزوں میں سے کسی ایک کو چننا ہو تو انتخاب کا مسئلہ خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔

اپنی نوٹ بک سے۔ ادارۂ ادب میں صورت حال کچھ اس طرح تھی، تعلیم کے پہلے سال میں شاعروں کی تعداد بیس تھی، چار نثرنگار تھے اور ایک ڈرامہ نگار۔ دوسرے سال شاعروں کی تعداد پندرہ رہ گئی، نثرنگار آٹھ ہو گئے، ڈرامہ نگار ایک ہی رہا، البتہ اب ایک نقاد کا اضافہ ہو گیا۔ تیسرا سال آیا تو شاعر آٹھ رہ گئے، نثرنگاروں کی تعداد دس تک پہنچ گئی، ڈرامہ نگار اب بھی ایک ہی رہا لیکن نقادوں کی تعداد ایک سے بڑھ کر چھ ہو گئی۔ پانچویں سال کے آخر تک شاعر، نثرنگار اور ڈرامہ نگار تو ایک ایک رہ گئے، باقی سارے لوگ نقاد بن گئے۔

یقیناً اس میں مبالغے کا بھی خاصا دخل ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ بہت سارے لوگ ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کرتے ہیں، پھر نثر کی وادی میں قدم رکھتے ہیں، ڈرامہ لکھتے ہیں اور آخر آخر مضامین لکھنے لگتے ہیں ... اور اب تو فلموں کے منظر نامے لکھنے کا کام بھی فیشن بن گیا ہے۔

بادشاہوں اور سلطانوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی ملکاؤں کو محض اس لئے چھوڑتے رہتے تھے کہ وہ ولی عہدوں کی مائیں نہ بن پائیں۔ ایسا کئی بار ہوتا اور تب جاکر انہیں احساس ہوتا کہ قصور ملکاؤں کا نہ تھا۔ لیکن ایک کسان زندگی بھر ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتا ہے اور ایک درجن بچے پیدا کرتا ہے۔

میں کہتا ہوں شراب ضرور پیو لیکن نان پاؤ کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو۔ گانے ضرور گاؤ لیکن کہانیاں بھی سنو! نظمیں ضرور لکھو، لیکن گھروں میں سنائے جانےوالے قصوں سے بھی منھ نہ موڑو!

نثر۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب میں پالنے میں پڑا رہتا اور اماں مجھے لوری سنایا کرتیں۔ ان کو بس ایک ہی لوری آتی تھی۔ ابا اگرچہ خاصے مشہور شاعر تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنے بیٹوں کےلئے کوئی گیت نہیں لکھا۔ وہ ہم لوگوں کو کہانیاں ہی سنایا کرتے، قسم قسم کی کہانیاں، بعض حقیقی واقعات پر مبنی ہوتیں اور بعض وہ کہانیاں جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی تھیں۔ یہ ساری چیزیں نثر ہی ہوتی تھیں۔

وہ اپنی نظموں کا ذکر پسند نہیں کرتے تھے۔ میرے خیال میں وہ شعرگوئی کو کوئی خاص اہمیت بھی نہیں دیتے تھے۔ انہیں جن چیزوں سے خاص شغف تھا وہ تھیں کھیت کی جتائی، کھلیان کی دیکھ بھال، گائے اور گھوڑے کا پالن پوسن، چھت پر جمی برف صاف کرنا۔ بعد کے برسوں میں وہ گاؤں اور یہی نہیں پورے ضلع کے ایسے کاموں میں حصہ لیتے جنکی انکی عمر اجازت دیتی۔

جب وہ کوئی نظم لکھتے تو انہیں اسکی فکر نہ ہوتی کہ یہ نظم شایع کہاں ہورہی ہے۔ ان کےلئے نظم کا کسی مرکزی اخبار میں شایع ہونا یا ہمارے گاؤں کے نوعمر پائنیروں کی طرف سے نکلنےوالے دیواری اخبار میں چھپنا ایک سی حیثیت رکھتا تھا۔ میرا تاثر تو یہ تھا کہ جب انکی کوئی نظم دیواری اخبار میں شامل ہوتی تو وہ زیادہ مسرت محسوس کرتے۔

اکثر وہ بتاتے کہ مشہور رومانی شاعر محمود کے والد انالسل محمد نے اپنے بیٹے سے کیا کہا۔ جب محمود ایک فضول‌خرچ بیٹے کی طرح اپنا زرد اور بےرونق چہرہ لئے، ھجر کی آگ میں تپتے اور محبت کے گیت گا گاکر تھکے تھکائے گھر آئے اور کھانا مانگا تو ان کے باپ نے بڑے اطمینان سے کہا:

''اپنی نظمیں کھاؤ اور محبت کی مٹھاس گھول کر پی لو۔ یہاں میں تم لوگوں کےلئے کھیتی کرتے کرتے مرا جا رہا ہوں۔''

یقیناً چڑیا کو گانا بھی چاھئے لیکن اسکا خاص کام ہے گھونسلا بنانا اور بچوں کے لئے خوراک فراھم کرنا۔

ابا کی نظر میں بھی ان کی نظمیں چڑیوں کے گیت جیسی تھیں، خوبصورت، دل‌کش لیکن ایسی نہیں کہ ان کے بغیر گذارا نہ ہو سکے۔ ابا کے لئے ان کی حیثیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے صبح کو ہم لوگ ایک دوسرے کو سلام کرتے ہیں اور رات کو بستر پر جاتے ہوئے ''شب‌بخیر'' کہتے ہیں، جیسے کسی تہوار کے موقع پر مبارکباد دی جاتی ہے اور کوئی غمگین خبر ملے تو پرسہ۔

شاعروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوتے ہیں اور ہر ایک کی اپنی دھن ہوتی ہے۔ لیکن ابا فطرت اور خصلت کے اعتبار سے پہاڑی علاقے کے ایک عام باشندے کی طرح تھے۔ انہیں دوستوں کے محدود حلقے میں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں سب سے زیادہ مزا ملتا۔ ہر شخص ایک دوسرے کی بات میں مداخلت کئے بغیر اپنے قصے اور سنی ہوئی خبریں سناتا اور یہ ساری چیزیں بھی نثر ہی میں ہوتیں۔

ابا نے جب اپنی ابتدائی نظمیں مشہور شاعر محمود کو دکھائیں تو انہیں بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے کہا کہ یہ نظمیں انکی سمجھ میں نہیں آئیں۔ ان کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ وہ گائے، ٹریکٹر یا کتے کو اس قابل ہی نہ سمجھتے تھے کہ ان پر نظم لکھی جا سکے یا حنزہ گاؤں کو جانے والی کسی پگڈنڈی کو نظم کا موضوع بنایا جا سکے۔

ابا نے ان سے بڑی خاکساری کے ساتھ سوال کیا: ''تو پھر میں کس چیز کے بارے میں لکھوں؟،،

''محبت اور صرف محبت کے بارے میں، تمہیں محبت کا ایک محل تعمیر کرنا چاہئے۔،،

محمود کے اشعار:

دنیا میں محبت کا اک محل یارو! تعمیر کیا میں نے
اور خود پڑا ہوں میں اک غار میں
ہاں میں نے بنایا تھا، پل ایک محبت کا
پل ٹوٹ چکا یارو! تنہا ہوں میں

ابا نے محبت کا کوئی محل تعمیر نہیں کیا اور نہ ہی کبھی انہوں نے اسکی فکر کی۔ ان کی توجہ کا مرکز، ان کا محل، انکی نظموں کا موضوع تو ان کا گھر تھا، خاندان اور بچے تھے، ان کا گاؤں اور ان کا گھوڑا اور پھر ان کا ملک، وہ دنیا اور دھرتی کے شاعر تھے، آسمان اور بارش، سورج اور گھاس یہ تھے ان کی شاعری کے موضوعات۔

ہاں، انہوں نے ایک عشقیہ نظم بھی لکھی تھی، اس عورت کے بارے میں جو انکی محبوبہ تھی۔ لیکن یہ نظم انہوں نے عربی میں لکھی تھی تاکہ کوئی دوسرا اسے پڑھ نہ سکے۔ یہ نظم تو بس ان کےلئے اور انکی محبوبہ کےلئے تھی۔

ابا کو ایسی کہانیاں بہت پسند تھیں جن میں کوئی نصیحت کا پہلو ہو اور جو قدرے سنجیدہ ہوں۔ شام کے سرمئی اجالے میں وہ مجھے اپنی گود میں بٹھا لیتے، بھیڑ کی کھال والے گرم اور مہکتے ہوئے کوٹ میں چھپا لیتے اور پھر کہانیاں سنانے لگتے۔ یہ کہانیاں کبھی ان لوگوں کے بارے میں ہوتیں جو دور دراز

ملکوں میں جا بسے تھے اور ان لوگوں کے بارے میں بھی جنہوں نے وطن چھوڑنا کبھی گوارا نہ کیا۔ وہ ندیوں اور راستوں کا ذکر کرتے، کبھی یہ بتاتے کہ پھول کیسے کھلتے ھیں اور کبھی یہ کہ شہد کی مکھی ان پھولوں پر کیوں بیٹھتی ہے۔ کبھی سورج کے طلوع اور غروب کی کہانی سناتے تو کبھی ان روائتوں، رسموں اور رواجوں کا ذکر کرتے جو پرانے زمانے میں رائج تھے اور کبھی یہ بتاتے کہ لڑائی سے پہلے لوگ کس طرح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

وہ آسمان پر نظر ڈالتے ھی یہ بتا دیتے کہ کل بارش ھوگی یا دھوپ نکلے گی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر چاروں طرف بارش ھورھی ھو اور تلیتل گاؤں پر سورج چمک رھا ھو تو اسکے معنی یہ ھیں کہ حنزہ کے پلیٹو پر طوفان آنےوالا ہے۔

وہ بتا سکتے تھے کہ رئی کی ایک بالی میں کتنے دانے ھونگے اور یہ کہ خوبصورت قوس قزح کیسے وجود میں آتی ہے۔

کوئی مسافر دور سے بھی گذرتا تو وہ یہ بتا سکتے تھے کہ یہ کون ہے، کہاں سے آرھا ہے، کس کام کےلئے آرھا ہے اور آج شب وہ کس کا مہمان ھوگا۔

افسوس اسکا ہے کہ وہ یہ ساری کہانیاں مجھے تو سناتے رہے لیکن کبھی انہوں نے انہیں قلمبند نہیں کیا کیونکہ یہ ساری کہانیاں انکی نثر کا نمونہ تھیں سدا کے رھنےوالے شاعر حمزہ سداسا کی نثر کا نمونہ۔ ان کے نزدیک افسانہ اور حقیقت دو چیزیں نہ تھیں۔ وہ ایک خیال کو ایک کہانی سمجھتے تھے اور کہانی کو خیال۔ اب رھی نظم؟ تو وہ اسے خودسر اور ضدی دل سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔

اگر ابا نے اپنی کہانیاں قلمبند کردی ھوتیں تو بہتر ھوتا کیونکہ جب میں بڑا ھوا تو میرا خودسر اور سرکش دل مجھ پر قابو پا چکا تھا جب کوئی چڑیا اڑتی ھوئی پاس سے گذرتی تو میں یہ نہ سوچتا کہ وہ کہاں جارھی ہے اور کیوں جارھی ہے، میرے دل میں یہی خواھش ھوتی کہ اس کے پر میرے ھاتھ میں آجائیں اور میں اسے پکڑ لوں۔ ابا نے بہت کوشش کی کہ میرا رخ کہانیوں کی طرف موڑسکیں لیکن میں اماں کے گیت پر

جان دیتا تھا۔ بچپن میں ابا کی تمام کہانیوں سے زیادہ مجھے یہ لوری پسند تھی۔

میرا بچپن گیتوں کے سائے میں گذرا۔ جب میں نے جوانی میں قدم رکھا اس وقت بھی یہی گیت میرے ساتھ تھے۔ جب میں مردوں کے قبیلے میں شامل ہوا تو ان گیتوں کے ساتھ اور اب میں بڑھاپے کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہوں تو بھی یہی گیت میرے ہم رکاب ہیں۔

اب مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میں چاہے جہاں بھی گھومتا پھرتا رہا ہوں، چاہے میرے لبوں پر کتنے ہی گیت کیوں نہ مچلتے رہے ہوں، ایک چٹان ہمیشہ اس انتظار میں رہی ہے کہ کسی دن کوئی عقاب اس پر ڈیرا ڈالے گا، ایک پیڑ ہمیشہ اسکا منتظر رہا ہے کہ چڑیاں اس پر گھونسلے بنائینگی، ایک مکان ہمیشہ اس کا مشتاق رہا ہے کہ کوئی آنے والا اسکے دروازے پر دستک دے گا اور نثر ہمیشہ شاعر کی راہ تکتی رہی ہے۔

اور آج میں اس چٹان پر اتر آیا ہوں جو ہمیشہ میری منتظر رہی ہے، میں دروازے پر دستک دے رہا ہوں تاکہ دروازہ کھلے اور میں مکان میں داخل ہو سکوں۔ کیونکہ اب جاکر مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ میں شاعری کے ذریعے ان تمام چیزوں کا اظہار نہیں کر سکتا جو میں نے اس دنیا میں دیکھی ہیں۔ شاعری کا سانچہ اتنا وسیع نہیں کہ میرے سارے افکار اور احساسات اس میں سموئے جا سکیں۔

مجھے احساس ہے کہ نثر کوئی گیت نہیں جسے کھڑے ہو کر گایا جا سکے۔ بلکہ اس کے لئے میز سامنے رکھ کر کرسی پر بیٹھنا اور کام کرنا پڑتا ہے۔ گھڑی میں الارم لگانا پڑتا ہے تاکہ صبح سویرے اٹھا جاسکے اور گاڑھی چائے پینی پڑتی ہے تاکہ رات کی نیند غائب ہو جائے۔

اگر بنیاد صحیح ڈھنگ سے ڈالی گئی ہو اور ڈھانچہ مناسب انداز میں کھڑا کیا گیا ہو تو مکان کی تعمیر کا کام آسانی کے ساتھ انجام دیا جا سکتا ہے۔ میری کوشش کا نتیجہ کہانی، مختصر ناول، قصہ، داستان، افسانہ، انشائیہ کی صورت میں برآمد ہوگا یا محض مضمون کی صورت میں، یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔

کچھ مدیران کرام اور نقاد یہ کہینگے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ تو ناول ہے، نہ داستان اور نہ کہانی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ یہ ہے کیا؟ کچھ اور مدیر اور نقاد اس طرح کے فیصلے صادر کرینگے کہ یہ بیک وقت ناول بھی ہے، اور داستان بھی وغیرہ وغیرہ۔

میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں کچھ لکھ رہا ہوں اب آپ اسے کسی بھی نام سے پکاریں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں کتابوں میں لکھے قواعد و ضوابط کی پابندی کے بغیر محض اپنے دل کی ہدایت پر لکھ رہا ہوں، اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دل کسی طرح کے قواعد و ضوابط کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اسکے اپنے آئین ہوتے ہیں، اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک دل کے آئین کا اطلاق دوسرے تمام دلوں پر بھی ہو۔

میں اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہوں کہ اگر میں گوشت، چاول، پھل اور مرچ سب ملا کر ایک پتیلی میں چڑھا دوں اور بیک وقت تھوڑا سا نمک اور تھوڑا سا شہد بھی ملا دوں تو جو کھانا تیار ہوگا وہ بدمزہ ہوگا نا؟ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان مختلف چیزوں سے مل کر جو چیز تیار ہو وہ ایک نیا اور مزیدار کھانا ثابت ہو۔ میں اس کا فیصلہ ان لوگوں پر چھوڑ دیتا ہوں جو میرے ساتھ دعوت طعام میں شریک ہوں۔

میری کہانی، میرے تاثرات، میری داستان! مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جاڑوں کی سرد رات میں اپنے بستر پر بےخواب پڑا بڑی بیتابی کے ساتھ اپنے بھائیوں یا ابا کے گھر واپس ہونے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ دروازے پر ہونےوالی ہر آہٹ میری توجہ کا مرکز بن جاتی اور انتظار کا ہر لمحہ گھنٹوں کا احاطہ کرتا محسوس ہوتا۔

ایسی راتوں کو نانا میرے پاس آجاتے اور آہستہ آہستہ مجھے کوئی کہانی، کوئی گیت، کوئی مقولہ یا کوئی چٹکلا سنانے لگتے۔ کبھی میں ہنسنے لگتا اور کبھی کبھی مجھے خوف سا لگنے لگتا۔ ایسی حالت میں لمحوں اور گھنٹوں کا احساس ختم ہو جاتا، بس جو چیز باقی رہتی وہ ہوتی نانا کی مدھم آواز اور میرے اپنے ذہن کے پردوں پر ابھرنےوالی تصاویر۔ ایسے

میں اگر ابا یا بھائی واپس آجاتے اور نانا کی آواز بند ہو جاتی تو مجھے ان کے آجانے پر افسوس ہوتا کیونکہ اسکی وجہ سے دلچسپ کہانی کا سلسلہ ختم ہو جاتا۔

پھر جب میں بڑا ہوگیا اور دنیا کا چکر لگانے لگا تو میں موقع ملتے ہی ابا اور دوسرے بھائیوں کی طرح گھر کی طرف بھاگتا۔ میں گھر سے جتنا نزدیک ہوتا جاتا میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جاتیں اور میں ان پہاڑی نالوں کو گننے لگتا جو آگے راہ میں ملنےوالے ہوتے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ میرا کوئی ہمسفر اپنا کوئی ذاتی تجربہ یا کوئی داستان یا کہانی دلچسپ انداز میں سنانے لگتا، اور میں اتنی محویت کے ساتھ سننے لگتا کہ کسی دوسری بات کا کوئی احساس ہی نہ رہ جاتا۔ یونہی بات کرتے ہم اپنی منزل تک آجاتے اور مجھے اس بات پر افسوس ہوتا کہ سفر ختم ہو گیا اور داستان ادھوری رہ گئی۔

گھر پہنچتے ہی ابا سوال کرتے:

''کہو بھئی درہ کیسے پار کیا؟ گھاٹی کا کیا حال ہے؟ برف سے پٹ تو نہیں گئی؟''

اور میں نہ تو پہاڑوں اور پہاڑی گھاٹیوں کے بارے میں کچھ بتا پاتا نہ برف کے بارے میں۔ بس یاد رہ جاتی تو ہمسفر کی سنائی ہوئی کہانی۔ وہ کہانی جس نے اونچے نیچے پہاڑوں کو میرے لئے ہموار میدانوں میں تبدیل کر دیا اور ٹھنڈی برف کو گرم اونی کپڑوں میں۔

میری کہانیو! میرے تاثرات! کیا تم بھی کسی ایسے لڑکے کےلئے جاڑے کی لمبی راتوں کو مختصر بنا سکوگے جو اپنے عزیزوں کی آمد کا انتظار کر رہا ہے؟ یا کسی مسافر کےلئے جاڑوں کے زمانے میں سفر کی طوالت کا احساس مٹا سکوگے جیسے اپنے گھر میں جلتے ہوئے آتشدان کی کشش تیزی سے اپنی طرف کھینچ رہی ہو؟

جس طرح سوپ میں خوشبودار مسالا ملا دو تو اسکی لذت دوچند ہوجاتی ہے اسی طرح میں اپنی پھیکی داستان میں موقع موقع سے کہانیوں اور کہاوتوں کی جھالریں ٹانک کر اسے اور زیادہ دل کش بنانا چاہتا ہوں۔

تائی‌لخ گاؤں کی دوشیزائیں اپنی ٹھوڑی پر ہونٹوں کے دونوں کناروں کے نزدیک دو تل بنا دیتی ہیں۔ خدا کرے یہ کہاوتیں بھی میری نثر کو اسی طرح حسن کی دولت سے مالامال کر دیں جیسے تلوں کا اضافہ ان دوشیزاؤں کی دلکشی بڑھا دیتا ہے۔

میں اپنی کہانی کے ڈھانچے میں اپنی یادوں کے نقوش اور اپنی نوٹ‌بک کے صفحات کے اندراجات اس طرح پیوست کرتا جا رہا ہوں جس طرح کسی سیدھی دیوار میں رنگا رنگ پتھر نصب کئے جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ دیوار میں لگایا جانےوالا ہر پتھر اس طرح پیوست ہو کہ دیوار کا ایک حصہ بن جائے۔ کبھی کبھی جب میں کوئی ایسا پتھر نصب کرچکا ہوتا ہوں اور اپنی بات آگے بڑھاتا ہوں تو مجھ پر کچھ اس قسم کی کیفیت طاری ہوتی ہے جس سے غالباً دین‌دار مانوس ہیں جبکہ عبادت کی لگن ختم ہونے پر بھی عبادت جاری رہتی ہے۔ چنانچہ جو پتھر دیوار کا حصہ نہیں بن پاتے انہیں میں اِلگ کر دیتا ہوں۔

اور یوں میں ولولہ‌انگیز نظم کی جگہ بیانیہ سنجیدگی کو اپنا رہا ہوں، نثر کو اپنا رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کچھ دنوں کےلئے شاعری سے قطع تعلق کر لوں، شاعری میرا پیچھا چھوڑنے کےلئے تیار نہیں۔ جب میں سوتا ہوں تو بلی کے معصوم بچے کی طرح وہ میرے کمبل میں گھس آتی ہے۔ صبح کو جیسے ہی میں اپنی کھڑکی کھولتا ہوں تو وہ پہاڑ کی اونچی چوٹیوں پر دکھائی دینےوالی سورج کی اولین کرنوں کی طرح میرا خیرمقدم کرتی ہے۔ وہ شراب کے بیش قیمت آخری قطرے کی طرح جام کی تہہ میں بیٹھی میری راہ تکا کرتی ہے۔ وہ ایک ایسی عورت کی طرح میرا پیچھا کرتی ہے جو اپنے سابق عاشق کو کسی سڑک پر روک لیتی ہے اور پوچھنا شروع کر دیتی ہے:

”کیا تم نے مجھے ہمیشہ کےلئے چھوڑ دیا ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ واقعی میرے بغیر تمہارا گذر ہوسکتا ہے؟ تم اس ارنے‌بھینسے کی طرح ہو جو ٹھنڈے جنگل میں چرنے کا عادی ہو، اس سامن مچھلی کی طرح ہو جو برف کی طرح سرد پانی میں رہنے کی عادی ہوتی ہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک گرم جھیل

میں رھنا تمہارے لئے ممکن ہوگا؟ خیر اگر تم نے حقیقتاً مجھ سے تعلق قطع کرنے کا فیصلہ کر ھی لیا ہے تو آؤ تھوڑی دیر بیٹھو تا کہ ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ سکیں۔ ،،

شاعری! کیا تو یہ محسوس نہیں کرتی کہ میں تجھے کبھی نہیں چھوڑ سکتا؟ کیا میں اپنی زندگی کی ساری مسرتوں سے اور اپنے اندر امڈنےوالے سارے آنسوؤں سے کنارہ کشی اختیار کر سکتا ہوں؟

تو اس وقت پیدا ہونےوالی بچی کی طرح ہے جب بیٹے کی توقع کی جارہی ہو اور اپنے پیدا ہونے کے جواز کے طور پر اسی بچی کی طرح یہ کہتی محسوس ہورہی ہے: ''میں جانتی ہوں کہ تمہیں میری توقع نہ تھی اور ابھی تک میں تم میں سے کسی کے دل میں اپنی محبت کا جذبہ پیدا نہیں کر پائی ہوں۔ لیکن ذرا مجھے بڑی ہونے دو، شباب کے میدان میں قدم رکھنے دو، مجھے اپنی لٹیں بکھیرنے اور کوئی گیت چھیڑنے دو۔ پھر ہم سب دیکھینگے کہ اس دنیا میں کون ہے وہ مائی کا لال جو مجھ سے محبت کئے بغیر رہ سکے۔ ،،

شاعری

کام اور کام گذر جائے پہ کچھ دیر آرام
اک سفر تیز بہت، پھر وہی دو پل کا قیام
شاعری! تیز سفر، منزل آرام بھی ہے
فرصت یک نفس و صبر طلب کام بھی ہے

شاعری تو مرے بچپن کی سہانی لوری
شاعری تو ھی جوانی میں مرے خواب بنی
ھاں مری پہلی محبت تھی جنم دن تیرا
جس محبت سے رھا ساتھ ازل سے میرا

میرے بچپن نے تجھے ماں کی طرح چاھا ہے
اور اب یوں ہے کہ تو ھی مری محبوبہ ہے
عہد پیری میں ترا روپ بدل جائے گا

میری بیٹی کے حسین جسم میں ڈھل جائے گا
اور جب موت صدا دے کے بلا لے گی مجھے
یاد بن کر میری اپنے میں سما لے گی مجھے

تو کبھی سلسلہ کوہ نظر آتی ہے
پالتو چڑیوں کی صورت کبھی گھر آتی ہے
تو کبھی میرے لئے شہپر پرواز بنی
رن کے میدان میں شمشیر کی آواز بنی
شاعری سرکش و بیتاب و سراپا سیماب
میں ہوں پابند وفا، تو ہے میری زیست کا خواب

کام کب ختم ہوا، وقفہ راحت آیا؟
کب مسافت ہوئی طے، لمحہ فرصت آیا؟
شاعری! تیز سفر، منزل آرام بھی ہے
فرصت یک‌نفس و صبر طلب کام بھی ہے

ابا کہا کرتے تھے: اگر کسی کو بکواس کرنے سے روکنا ہو تو کسی قابل احترام بزرگ یا مہمان سے تقریر کرنے کی درخواست کر دو۔ اگر یہ حربہ بھی اسکی بکواس کو روکنے میں ناکام رہے تو گانا شروع کر دو۔ اگر گانا بھی اسکی بکواس بند کرنے میں ناکام رہے تو اسکا گریبان پکڑ کر اسے محفل سے باہر نکال دو۔ گانے کے دوران اگر کسی کی گفتگو مخل ہوتی ہو تو اسے پیٹ دینا بھی غلط نہ ہوگا۔

شاعری۔ دوسروں کے مقابلے میں یہ بات تو کہیں زیادہ اچھی طرح جانتی ہے کہ محض تیرے بارے میں باتیں کرنا نہ تجھے زیادہ بہتر بنا سکتا ہے، نہ تیری عظمت میں اضافہ کرسکتا ہے۔ کیا باتیں کسی گیت کو بہتر بنا سکتی ہیں؟ کیا کیتلی‌بھر پانی کسی پہاڑی چشمے میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے؟ کیا آپ اپنے منہ سے پھونک مار کر ہوا میں مزید تیزی لا سکتے ہیں؟ کیا مٹھی‌بھر برف کا اضافہ کسی چوٹی کی آن‌بان بڑھا سکتا ہے؟ کیا بیٹے کے لباس کی تراش‌خراش اور اسکی مونچھوں کے انداز

میں تبدیلی ماں کے دل میں اسکے لئے امڈنے والے محبت کے دریا میں مزید طوفان پیدا کر سکتی ھے؟

<u>شاعری!</u> تیرے بغیر میں یتیم ھو جاؤنگا۔

<u>شاعری</u>

ترے بغیر یہ دنیا دھواں دھواں ھوتی
وہ لاش، قبر میں جس کو اتارنا بہتر
وہ آسماں جو ستاروں سے ھو تہی دامن
وہ عشق جو کہ فراق ھی فراق ھو یکسر

ترے بغیر یہ دنیا کا بحر بے پایاں
نہ نیلگوں، نہ چمکدار اور نہ لافانی
وہ باغ جس میں نہ گل ھوں، نہ سبزہ و شبنم
نہ عندلیب نہ ھی ان کی وہ غزل خوانی

درخت، جن پہ نہ پتی، نہ شاخ بارآور
خزاں‌دوام، نہ جاڑا، نہ گرمیاں نہ بہار
فسردہ، مہر بہ لب آدمی، غموں سے نڈھال
نہ لب پہ گیت کسی کے، نہ ھی زباں پہ ملہار

آوار لوگوں میں ایک کہاوت ھے: ”دنیا کی تخلیق سے سینکڑوں سال پہلے شاعر جنم لے چکا تھا،،۔ بہ‌ظاھر اسکا مفہوم یہی معلوم ھوتا ھے کہ اگر شاعر نے دنیا کی تخلیق میں حصہ نہ لیا ھوتا تو یہ اتنی دلکش اور حسین نہ ھوتی۔

ھم اپنے گھر میں تین بھائی تھے اور ایک بہن تھی، جو ھم سب میں بڑی تھی۔ تمام پہاڑی عورتوں کی طرح اسکی زندگی بھی محنت، رنج و غم اور آنسوؤں سے عبارت تھی۔ ابا اکثر کہا کرتے:

”تم تین بھائیوں میں صرف ایک بہن ھے۔ اسکا خیال رکھا کرو۔ اس دنیا میں تمہارا اس سے زیادہ قریبی عزیز کوئی اور نہیں۔،،

اس میں کوئی شک نہیں کہ میری بہن میری سب سے زیادہ قریبی عزیز ہے۔ لیکن میری ایک اور بہن بھی ہے اور میں یہ نہیں بتا سکتا کہ ان دونوں میں سے کون مجھے زیادہ عزیز ہے۔ میری اس دوسری بہن کا نام شاعری ہے اور اس کے بغیر زندگی میرے لئے بےمعنی ہو کر رہ جائےگی۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا چیز اسکی جگہ لےسکتی ہے۔ ہاں میرے سامنے پہاڑ بھی ہیں، برف بھی، پہاڑی چشمے بھی ہیں، بارش اور ستارے بھی۔ سورج بھی اور گیہوں کے کھیت بھی... لیکن شاعری کے بغیر یہ پہاڑ اور یہ بارش، یہ پھول اور سورج کیا حقیقت رکھتے ہیں اور ان کے بغیر شاعری کی کیا قدروقیمت رہ جاتی ہے؟ ہاں، شاعری کے بغیر یہ پہاڑ چٹانوں کا ایک انبوہ بن کر رہ جائینگے، بارش ایک ناخوشگوار نمی اور کیچڑ میں بدل جائےگی اور سورج محض اجرام فلکی میں سے ایک رہ جائےگا جو حرارت اور برقی قوت عطا کرتا ہے۔

میں بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا کوئی چیز ایسی ہے جو شاعری کی جگہ لے سکے؟ یقیناً اجنبی اور انجانے دیس بھی ہیں، پرندوں کی زمزمہ‌سنجی بھی، اور دل کی دھڑکنیں بھی۔ لیکن اگر شاعری کو الگ کر دیا جائے تو ان میں سے ایک کی بھی وہ حیثیت باقی نہ رہ جائےگی جو آج اسے حاصل ہے۔ رومانی اور پراسرار دل‌کشی رکھنےوالے اجنبی دیس صرف جغرافیائی تصور بن کر رہ جائینگے، سمندر پانی کا ایک بےمعنی ذخیرہ ٹھہرےگا اور پرندوں کی زمزمہ‌سنجی مادہ کے ساتھ جنسی ربط قائم کرنے کی حیاتیاتی ضرورت کے تحت نر کی پکار بن کر رہ جائےگی۔ نیلگوں آسمان مختلف گیسوں کا امتزاج ٹھہرےگا اور دل کی دھڑکن دورانِ‌خون کی پیداوار قرار پائےگی۔

ہاں، نزاکت، رحم دلی، دردمندی، محبت، حسن، جرأتمندی، نفرت اور افتخار کا وجود بھی ایک حقیقت ہے... لیکن وہ سارے تصورات ہیں جنہوں نے شاعری سے جنم لیا بالکل اسی طرح جس طرح شاعری ان تصورات کی پیداوار ہے۔ ان سے شاعری کا عنصر نکال لیا جائے تو ان کی حقیقت بےجان تصورات جیسی رہ جائےگی اور شاعری سے انہیں چھین لیا جائے تو شاعری کا دم گھٹ جائےگا۔

شاعری مجھے جنم دیتی ہے اور میں شاعری کو، ایک دوسرے کے بغیر ہمارا وجود عدم کے برابر ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ میرے بدن میں رگ پٹھے بھی ہیں اور ہڈیاں بھی۔ کوئی اجنبی مجھ پر ایک نظر ڈال کر یہ نہیں بتا سکتا کہ میری کونسی ہڈیاں مضبوط اور صحیح و سالم ہیں اور کونسی ایسی ہیں جو ٹوٹ گئی تھیں اور دوبارہ جوڑی گئی ہیں۔ لیکن اکس رے کی مشین میرے باطن کا کونہ کونہ چھان سکتی ہے اور اجنبی آنکھوں کے سامنے وہ ساری چیزیں بےنقاب کر سکتی ہے جو میرے جسم کے اندر چھپی ہوئی ہیں۔

یوں تو میری پسلیاں، ریڑھ کی ہڈی اور میرے پھیپھڑے سبھی میرے جسم کے اندر چھپے ہوئے ہیں، مگر ایک چیز ایسی ہے جو ان سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے اور یہ ہے میری روح۔ لیکن میری شاعری کی کرنیں اسکی گہرائیوں میں بھی اتر سکتی ہیں اور میرے سارے جذبات دوسروں کی نگاہوں کے سامنے بےنقاب کر سکتی ہیں۔ شاعری کی سحرآگیں کرنیں جب میرے بطون میں داخل ہو کر میری روح کو جگمگا دیتی ہیں تو میری روح پر پڑے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں اور ہر شخص کی نگاہیں اسکی گہرائیوں کو کھنگال سکتی ہیں۔ اس وقت جو بھی چاہے میرے وجود کی پہنائیوں میں اتر سکتا ہے۔

آج جو کمپیوٹر مشینیں بنائی جارہی ہیں ان میں ہزارہا تار اور سرکٹ لگائے جاتے ہیں۔ پھر ان گنت اعداد پر مشتمل انتہائی پیچیدہ سوالات ان کے حوالے کر دئے جاتے ہیں۔ ان ہزارہا تاروں اور سرکٹوں میں برقی رو دوڑا دی جاتی ہے۔ اس طرح کی مشینوں میں جس طرح کا عمل انجام پاتا ہے، اسکا احاطہ نہ آنکھیں کر سکتی ہیں نہ ذہن، اور پھر نتیجہ سامنے آجاتا ہے، وہ عدد جس کے حصول اور تجزیہ کا کام اس پیچیدہ مشین کو سونپا گیا تھا۔

لیکن دنیا میں کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ میرے جسم کے اندر جو لاتعداد سرکٹ ہیں ان میں کس طرح کے تاثرات اور محبت و نفرت کی کتنی لہریں دوڑتی پھر رہی ہیں۔ جو چیز سامنے آتی ہے وہ ہے نظم جسے زندگی کے ان تاثرات کی بنیاد پر

جن کی لہریں میرے اندر رواں دواں ہیں، میری روح آخری اور بنیادی نتیجے کے طور پر سامنے لاتی ہے۔

میں دنیا میں بہت گھوما پھرا ہوں... کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر، کبھی ہوائی جہاز کی آرام‌دہ سیٹ پر جھپکیاں لیتے ہوئے، کبھی کسی ٹرین کی اوپروالی برتھ پر آرام سے سوتے اور کبھی کسی تیز رفتار موٹرکار کے ذریعے شاہراہوں سے گذرتے ہوئے۔

مجھے پاپیادہ مسافت طے کرتے ہوئے یا گھوڑے پر سوار سڑک سے گذرتے دیکھ کر ہوسکتا ہے لوگوں نے کہا ہو: ''ارے یہ تو رسول حمزاتوف ہے، بیچارہ اس وقت کتنی تنہائی محسوس کررہا ہوگا۔،، لیکن میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا جب میں نے خود کو تنہا محسوس کیا ہو، کیونکہ میری بہن، شاعری ہمیشہ میرے ساتھ رہی ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی مجھ سے الگ نہیں ہوئی۔ حد یہ ہے کہ کبھی کبھی تو نیند کی حالت میں بھی میں شاعری کرتا ہوں، اپنی پرانی نظمیں دھراتا ہوں، یا دوسرے شعراؑ کی تخلیقات گنگناتا ہوں۔

ایک زمانے میں میرا خیال یہ تھا کہ دنیا میں شاعروں کی تعداد بہت کم ہے اور شاعروں کو عام لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور زندگی گذارنے میں خاصی دقت محسوس ہوتی ہوگی۔ زندگی میں ہر شخص کی اپنی اپنی دلچسپیاں ہوتی ہیں، بعض ایسی چیزیں ہوتی ہیں جنکے سلسلے میں دوستوں اور پڑوسیوں سے بات‌چیت کی جاسکتی ہے مثلاً کام، بیوی، اجرت، چھٹی کا دن، گھر، مچھلی کا شکار، سینما یا بیماری... میں سمجھتا تھا کہ بےشک یہ موضوعات تو ایسے ہیں جن پر شعراؑ دوسروں سے گفتگو کر سکتے ہونگے۔ لیکن دنیا کے بارے میں اسکے شاعرانہ تصور پر، اسکی شاعری پر کون گفتگو کر سکتا ہوگا؟

پھر مجھے احساس ہوا کہ ایسا کوئی انسان نہیں جو شاعر نہ ہو۔ ہر شخص کے دل کی گہرائیوں میں ایک شاعر چھپا ہوتا ہے۔ شاعری کسی کو اپنے فیض سے محروم نہیں رکھتی، وہ ہر دروازے پر دستک دیتی ہے اس دوست کی طرح جو اپنے دوست کے گھر ضرور جاتا ہے۔

گیتوں سے ہمارے لوگوں کا پیار اتنا ہی فطری، قدرتی اور بےاختیار ہوتا ہے جیسے بچوں سے پیار۔ ہاں! ہم سب شاعر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ شاعری کر لیتے ہیں کیونکہ انہیں شعرگوئی کا فن آتا ہے، کچھ اس مغالطے میں پڑکر شاعری کرتے ہیں کہ وہ شعرگوئی کے فن سے واقف ہیں۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو شعرگوئی کی کوشش ہی نہیں کرتے غالباً یہی لوگ اصلی شاعر ہیں۔ کون جانے یہی حقیقت ہے؟

ایک زمانہ وہ تھا جب میں شعر نہیں لکھتا تھا۔ تو کیا میں اس وقت شاعر نہیں تھا؟ کیا میرے دل کی دھڑکنوں میں اتنی تیزی نہ تھی یا میرے خون میں اتنی گرمی نہ تھی جتنی آج ہے؟ کیا اس وقت خوشی اور غم محسوس کرنے کی صلاحیت اور علم کےلئے میری پیاس آج کے مقابلے میں کم تھی؟ کیا اس وقت میری آنکھوں میں دنیا اتنی خوبصورت نہ تھی جتنی آج ہے؟ کیا اس وقت کالے بادلوں کے درمیان سے نظر آنےوالے کسی بڑے نیلگوں ستارے کو دیکھ کر جو کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے وہ اس وقت نہیں ہوتی تھی؟ کیا میں پہاڑی چشموں کی گنگناہٹ محسوس کرنے اور اس سے لطف لینے کے قابل نہ تھا؟ کیا لق‌لق کی آواز اور گھوڑے کی ہنہناہٹ کا اس وقت مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا؟ کیا یہ سچ نہیں کہ جب میں کوئی قدیم گیت سنتا یا اپنے آبا و اجداد کے کارناموں سے متعلق کوئی داستان سنتا تو میری آنکھوں میں آنسو امڈ آتے تھے؟

مجھے یاد ہے کہ لڑکپن میں اپنے ایک پڑوسی کے گھوڑے کو چراگہ لے جاتا تھا، تین دن تک اس گھوڑے کو چرانے کا معاوضہ صرف یہ تھا کہ وہ پڑوسی مجھے ایک کہانی سنائےگا۔

مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت پہاڑوں کے پتھریلے ڈھلوان راستے طے کرتا چرواہوں تک پہنچتا۔ وہاں تک پہنچنے میں آدھا دن گذر جاتا اور باقی دن واپسی کی نذر ہو جاتا اور وہاں میں ایک واحد نظم سننے جایا کرتا تھا۔

اونتسوکول کی ناشپاتیاں، گیمرہ کے انگور، بتسرا کا شہد اور آوار گیت اپنی مٹھاس کےلئے مشہور ھیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ جب میں اسکول کے دوسرے درجے میں پڑھتا تھا تو اپنے گاؤں سدا سے ۲۰ کلومیٹر دور پر واقع ایک گاؤں بتسرا تک پاپیادہ پہاڑی راستہ طے کرکے گیا تھا اور اس ساری تگ و دو کا مقصد صرف یہ تھا کہ وھاں ایک معمر بزرگ ابا کے دوست تھے جنھیں لاتعداد پرانے گانے، پرانی نظمیں اور قدیم داستانیں یاد تھیں۔ یہ بزرگ مجھے چار دن لگاتار صبح سے شام تک گانے اور نظمیں سناتے رہے۔ جہاں تک ممکن تھا میں نے ان کے گانے لکھ لینے کی کوشش کی۔ اور پھر اپنے تھیلے میں یہ بیش‌قیمت جواھر پارے لئے ھوئے جب میں گھر لوٹ رھا تھا تو خوشی سے میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔

بتسرا کے سامنے ایک پہاڑ پڑتا ہے۔ جب میں اس کی بلندی پر پہنچا بھیڑوں کی رکھوالی کرنےوالے کچھ خونخوار کتوں نے جو نہ جانے کہاں چھپے ھوئے تھے مجھ پر حملہ بول دیا۔ میرے خیال میں درجن‌بھر تو رہے ھونگے۔ وہ ھری ھری گھاس سے بجلی کی طرح یوں میری طرف لپکے جیسے کسی بحری جہاز کی طرف پھینکے جانےوالے تارپیڈو بڑھتے ھیں۔ میرے سامنے ان کے کھلے ھوئے جبڑے تھے اور مجھے ان کے زرد نکیلے دانت صاف نظر آرہے تھے۔ بس چند لمحوں کی بات تھی اور اسکے بعد انھوں نے میری دھجیاں اڑا کر رکھ دی ھوتیں، اتنے میں مجھے کسی چرواہے کی آواز سنائی دی۔

''دم سادھ کر لیٹ جاؤ!،،

اب میں زمین پر تھا، اس طرح ساکت و ساکن جیسے میں واقعی مرچکا ھوں۔ ھلنے جلنے کی تو ھمت ھی نہ تھی، بلکہ میں تو یہ سمجھتا ھوں کہ چند لمحوں کے لئے میری سانس بھی رک گئی ھوگی۔ بس میرا دل تھا جو زمین سے لگا مسلسل دھڑک رھا تھا اور اس قدر تیز کہ مجھے ڈر لگنے لگا کہ اس کی آواز بھی سنی جاسکتی ہے۔ اب کتے میرے سر پر آچکے تھے، اور یوں لگ رھا تھا جیسے انھیں بڑا اچنبھا ھوا ھو۔ انھوں نے مجھے سونگھا

پھر میرے اس تھیلے کو جس میں گیت اور نظمیں بھری تھیں۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کے انداز میں دیکھا جیسے ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہو اور پھر دوڑتے ہوئے اپنے مفروضہ شکار کی تلاش میں نکل گئے۔ اور تھوڑی دیر میں وہ راستے کے ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں اس وقت تک زمین پر دم سادھے پڑا رہا جب تک چرواہا اپنے گلے سمیت وہاں نہ آپہنچا۔

''تم کس کے بیٹے ہو؟،، اس نے پوچھا۔

''میرا نام رسول ہے، سدا گاؤں کے حمزہ کا بیٹا ہوں۔،، میں نے جان بوجھ کر ابا کا نام لیا اس امید پر کہ یہ جاننے کے بعد کہ میں کس کا بیٹا ہوں وہ اور زیادہ خیال کرے گا اور مجھے نقصان نہ پہنچنے دے گا۔

''تو پھر تم اس پہاڑ پر کیسے آ گئے؟،،

''میں کچھ نظمیں جمع کرنے بٹسرا گیا تھا... یہ میرے تھیلے میں جمع ہیں۔،،

چرواہے نے نظمیں تھیلے سے نکالیں اور انہیں غور سے دیکھا۔

''اچھا۔ تو تم بھی شاعر بننا چاہتے ہو؟ اور حال یہ ہے کہ کتوں کو دیکھ کر ڈر گئے؟ تم نے جو راستہ چنا ہے اس راستے پر اس سے کہیں زیادہ خونخوار کتے تم پر حملہ کرینگے۔ وہ تمہاری نظمیں سونگھ کر تمہیں معاف نہیں کر دینگے۔ تمہیں کبھی ڈرنا نہیں چاہئے کبھی نہیں۔ تمہیں معلوم ہے یہ کون سا پہاڑ ہے؟ یہ وہ پہاڑ ہے جہاں سے حاجی مراد نے چھلانگ لگائی تھی اور اس وقت جب مسلح سپاہیوں کے پہرے میں انہیں لے جایا جارہا تھا۔ سپاہی خالی ہاتھ واپس گئے اور حاجی مراد نے اپنی جان بچالی۔ پہاڑ بھی لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں بشرطیکہ وہ ان کے گھر ہوں۔

میں سوچا کرتا تھا کہ یہ شاعرانہ جوش و خروش جو مجھ پر طاری ہے، وہ بیقراری جو میری روح میں ڈیرہ جمائے ہوئے ہے، وہ محبت جو میرے دل میں گھر کر چکی ہے اور یہ جو میرا دوران خون ہے... یہ سب وقتی چیزیں ہیں اور جلدھی ان کا

زور ختم ہو جائے گا۔ لیکن اب میرے سر کے بال کھچڑی ہو چکے ہیں، میرے بچے بڑے ہو رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ میری کتابیں بھی پرانی ہوتی جا رہی ہیں، لیکن ان میں سے کسی بھی چیز میں کمی نہیں آئی ہے اور میری شاعری میری سب سے زیادہ وفادار ساتھی ثابت ہوئی ہے۔

اب میں کچھ باتیں اس وفادار ساتھی سے کرنی چاہتا ہوں:

شاعری! زندگی کا کوئی ایسا لمحہ نہیں رہا اور دنیا میں سیر و سیاحت کے دوران کوئی ایسی گھڑی نہیں آئی جب تو نے میرا ساتھ چھوڑا ہو۔ اور آج جب میں نثر کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی وسعتوں کی طرف چلا ہوں اس وقت بھی تو میرے ساتھ رہے گی۔ میں جانتا ہوں کہ کسی کہانی کو قافیہ اور ردیف کے شعری آہنگ میں مقید کرنا ایک بے معنی سی کوشش ہے۔ اگر یہ کوشش کی جائے تو جو نتیجہ نکلے گا وہ یہ ہوگا کہ بہترین کہانی معمولی نظم کے سانچے میں قید ہو جائے گی۔ لیکن شاعری کسی کہانی میں اسی طرح جان بھی ڈال سکتی ہے جیسے کھانے میں نمک ڈالنے سے جان پڑجاتی ہے۔ ہاں، میری زندگی میں شاعری کو وہی حیثیت حاصل رہی ہے جو کھانے میں نمک کو حاصل ہے۔ اسکے بغیر میری زندگی بے کیف اور پھیکی ہوتی۔ ہمارے پہاڑی علاقوں میں جب کسی مہمان کی دعوت کی جاتی ہے تو کھانے کی میز پر نمکدان رکھنا کوئی نہیں بھولتا۔

نثر فاصلے تو دوردراز کے طے کر سکتی ہے لیکن شاعری کی پرواز بلند تر ہوتی ہے۔ نثر ایک بڑے ہوائی جہاز کے مانند ہے جو آسانی کے ساتھ کرۂ ارض کا چکر لگا سکتا ہے جبکہ شاعری ایک لڑاکو پیچھا کرنےوالے طیارے جیسی ہے، جو نیلگوں آسمان پر ابھرتے ہی پل جھپکتے نثر کے دوش بدوش پہنچ جاتا ہے، چاہے نثر کا طیارہ کتنی ہی بلندی پر پرواز کیوں نہ کررہا ہو۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی کتاب میں مختلف ہیئتوں اور اصناف کو ایک دوسرے میں ضم کردوں اور اسے آوارستان کی سرحدوں سے باہر بھیجوں۔ اور ایسا کیوں نہ کیا جائے؟ آخر

ہماری شاعری ان قارئین کے دل میں گھر کر چکی ہے جو داغستان کی سرحدوں سے بہت دور رہتے ہیں۔ ہماری بعض کہانیوں کو بھی باہر جانے کی اجازت مل چکی ہے۔ البتہ ہمارا ڈرامہ ابھی تک باہر نہیں جا سکا ہے۔ غالباً اسکے بارے میں چھان‌بین مکمل نہیں ہو سکی ہے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ اسے شائستگی اور معاشرت کے بہتر آداب سکھائے جا رہے ہوں۔

اگر میں نے ڈرامہ لکھنے کا فیصلہ کیا تو اس کے مناظر اور اس کے واقعات پورے داغستان سے متعلق ہوں‌گے، اسکے دیہاتوں اور اسکے شہروں سے متعلق ہونگے، دنیا کے تمام ملکوں سے متعلق ہونگے اور یہی نہیں بلکہ پوری دنیا ان میں سمٹ آئے‌گی۔ اسٹیج پر نظر آنےوالے مناظر میں پہاڑ بھی ہونگے، نیلا آسمان بھی، تیزرو دریا بھی اور سمندر بھی اور خشکی بھی۔ ڈرامہ زمان کے لحاظ سے گذشتہ صدیوں پر بھی محیط ہوگا، حال پر بھی اور آنےوالے مستقبل پر بھی۔ میں ہزارہا سال کو ایک لمحۂ مستعجل میں حل کر دونگا۔ اور اسکے کرداروں میں خود میری اپنی ذات ہوگی، ابا ہونگے، میرے بچے اور دوست ہونگے، وہ لوگ ہونگے جنہیں ابدی نیند سوئے ایک مدت گذر چکی ہے اور وہ بھی جنہوں نے ابھی اس دنیا میں قدم بھی نہیں رکھا ہے۔

وہ ڈرامہ میری زندگی کا شاہ‌کار ہوگا، اس طرح کا شاہکار جیسے ''جنگ اور امن،،، ''ڈان کوئزوٹ،، اور ''ڈیوائن کامیڈی،، اپنے اپنے مصنفوں کے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا ڈرامہ لکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ بلکہ یہ جو کتاب میں لکھ رہا ہوں اس کی دیوار میں ایک بھی ''ڈرامائی،، اینٹ لگانے کا خطرہ مول لینے کےلئے فی‌الحال میں تیار نہیں۔ ڈرامہ آئندہ کبھی لکھوں یا بہتر یہ ہے کہ میں یہ کام کسی اور ادیب کےلئے چھوڑ دوں۔ میں اس کتاب میں کبھی نثر لکھونگا کبھی نظم کا سہارا لونگا، فی‌الحال میں اسی کا ارادہ رکھتا ہوں۔ شاعری یوں ہے جیسے آپ کسی گھوڑے پر سوار تیزی سے دوڑ رہے ہوں اور نثر پاپیادہ چلنے کے مترادف ہے۔ پاپیادہ چلتے ہوئے آپ دور تک تو جا سکتے ہیں، لیکن گھوڑسواری کریں تو فاصلے زیادہ تیزی کے ساتھ طے ہوتے ہیں۔ میں کبھی گھوڑے پر سوار

ھوکر دوڑونگا اور کبھی گھوڑے سے اتر کر پاپیادہ چلونگا۔ اگر میں نثر میں بیان کرسکا تو آپ سے نثر میں گفتگو کرونگا اور جہاں میں نے محسوس کیا کہ میں نثر میں اظہار کی قوت کھو رہا ھوں میں آپ تک اپنی بات نظم کے ذریعے پہنچاؤنگا۔ مجھ میں جوانی کا ولولہ بھی ہے اور بڑھاپے کی دانشمندی و تجربہ کاری بھی۔ میری جوانی آپ کو گیت سنائےگی اور میری دانشمندی و تجربہ کاری آپ سے نثر میں گفتگو کرےگی۔

میرے وجود میں مختلف لوگ بیک‌وقت سانس لیتے ھیں، کبھی میں میز کرسی پر بیٹھ کر کانٹے چھری سے مزہ کے ساتھ نپکن باندھے کھانا کھاتا ھوں اور کبھی میں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ فرش پر بچھے دسترخوان پر بیٹھ کر اپنے دونوں ھاتھوں سے کسی دنبے کا گوشت کھاتا ھوں اور بوزا کے گھونٹ لےکر اسے حلق سے نیچے اتارتا ھوں۔

جب میں شہر سے اپنے پہاڑی وطن کی طرف روانہ ھوتا ھوں تو شہر والوں کی طرح بہترین شرابیں اور پھل تحفے میں لے جاتا ھوں اور جب میں مویشی پالنےوالوں کی سادہ اور پرتپاک میزبانی کا لطف اٹھانے کے بعد شہر کےلئے روانہ ھوتا ھوں تو میرے گھوڑے کے زین میں بندھے فتراک میں بھیڑ کا دھڑ رکھا ھوتا ہے۔

یہ تو آپ جانتے ھی ھیں کہ سمندر کبھی پرسکون ھوتا ہے، کبھی مہربان، کبھی ناراض اور کبھی اس قدر ناراض کہ غصے میں دیوانہ ھوجاتا ہے۔ بالکل اسی طرح میرے کردار میں بھی مختلف خصوصیات اکٹھا ھو گئی ھیں۔

ایک بار میں نے ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کو ایک دوسرے سے ھم‌آغوش ھوتے دیکھا۔ دونوں ایک چٹان کے کنارے بیٹھے تھے۔ دور سے صرف ان کا خاکہ سا نظر آرھا تھا لیکن ان دونوں میں فرق کرنا بڑا مشکل تھا، وہ ایک دوسرے سے اس طرح لپٹے ھوئے تھے اور اس طرح ھم‌آغوش تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے دو قالب ایک ھو گئے ھوں۔

بالکل اسی طرح میری اپنی شخصیت میں مسرت اور غم، آنسو اور قہقہے، توانائی اور کمزوری بھی آپس میں ھم‌آغوش ھیں اور

اس طرح کہ آپ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا چاہیں تو نہ کر سکیں۔

نہ وہ گھوڑا الف تھا، اور نہ یوں تھا جیسے کچھ گھوڑے
بہت غصے کی حالت میں لگام اپنی چباتے ھیں
بس اس کے دانت باھر سے نظر آتے تھے جوں موتی
اور اس کا سر جھکا تھا جیسے انساں سر جھکاتے ھیں

زمین کو چھو رہے تھے بال لمبے اسکی گردن کے
چمکتا رنگ سرخ اسکا تھا، گویا ایک شعلہ ھو
پڑی میری نظر اس پر تو کچھ ایسا لگا مجھ کو
یہ گھوڑا ھنس رھا ھے، جیسے اک انسان ھنستا ھو

عجب تصویر تھی یہ، کون حیرانی سے بچ پاتا؟
مگر میں نے یہ سوچا، آؤ کچھ نزدیک سے دیکھیں
وہ گھوڑا رو رھا تھا اس طرح جیسے کہ ھم انساں
جھکا کر سر غم‌وآلام میں رونے کے عادی ھیں

بڑی، افسردہ اور بادام سی گھوڑے کی آنکھوں سے
رواں تھا ایک سیلِ اشک قطروں کی صورت میں
عزیزو! مجھ کو بھی ھنستے ہوئے پاؤ تو پاس آنا
ھنسی ھے یا کہ رونا، دیکھ لینا ایسی صورت میں

میری نوٹ‌بک سے۔ پہاڑی علاقے میں ایک گاؤں ھے سیوخ، وھاں کا رھنےوالا ایک آدمی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا تھا اچانک اسے نیچے سفید بادل نظر آئے، اس نے سوچا یہ بادل نہیں سفید اون جمع ھے اور یہ سوچتے ھی اس نے اون جمع کرنے کےلئے چھلانگ لگا دی۔ لیکن آپ تو جانتے ھی ھیں کہ سفید بادل کے کسی ٹکڑے اور سفید اون یا سفید سوت کے ذخیرے میں کتنی ھی مماثلت کیوں نہ ھو، ان کا فرق بہرحال اپنی جگہ برقرار رھےگا۔

اسی طرح اگر صرف ھیئت پر نظر رکھتے ہوئے کوئی کتاب لکھی جائے اور ھیئت کے لحاظ سے فنکاری کا بہترین نمونہ ثابت ھو تو بھی وہ کسی انسان کے دل پر اثرانداز ہونے میں قطعی ناکام رھےگی۔

ہیئت ہی سب کچھ نہیں۔ ایک ماہی گیر جس نے اپنی پوری زندگی سمندروں میں گذاری تھی، کچھ دنوں جنگل میں رہا وہاں اسکی نظر ایک دمکوڑے پر پڑی اس نے سمجھا کہ یہ مچھلیوں کے انڈے ہیں۔ اسی طرح پہاڑوں کے ایک باشندے کو جب مچھلی کے انڈوں کا ڈھیر دکھایا گیا تو وہ یہ سمجھا کہ یہ بھی کوئی دمکوڑا ہے۔

اور یہ بھی میری نوٹ بک ہی میں درج ہے۔

کسی انسان کا سینہ
کبھی تمغوں سے سجتا ہے
کبھی گولی کا گہرا زخم سینے پر ابھرتا ہے
وہی محبوبہ اکثر غم بھی دیتی ہے
مگر پھر یوں گلے ملتی ہے
شکوے دور ہو جاتے ہیں
اور دوبارہ دل میں پیار کا طوفان امڈتا ہے
کبھی دو لب
دلآویزی میں لاثانی
مگر مکروریاکاری میں بھی اپنا بدل خود آپ ہوتے ہیں
ہمارے سر پہ تا حد نظر پھیلا ہوا یہ آسمان جو ہے
اسی پر فاختائیں بھی اڑا کرتی ہیں
اور شاہیں بھی اڑتے ہیں
امڈتے بادلوں میں بجلیاں بھی دوڑتی ہیں
اور اولے بھی
گھروں میں ایک ہی کھونٹی پہ آویزاں
نظر آتے ہیں
ساز ولولہ پرور بھی
اکثر تیز خنجر بھی

میری نوٹ بک کا ایک اور صفحہ ملاحظہ ہو۔ ایک پہاڑی دوشیزہ نے جو پہلی بار محبت کا شکار ہوئی تھی، صبح سویرے کھڑکی سے باہر سر نکالا اور چلا پڑی:

''اف سر سے پیر تک پھول میں لدے پیڑ کتنے خوبصورت لگ رہے ھیں!،،

''تمہیں پیڑوں پر پھول کہاں سے نظر آ گئے؟،، اسکی ماں نے سوال کیا۔ ''یہ تو برف ہے، خزاں کا آخری دور بھی ختم ھوگیا اب تو جاڑا ھی جاڑا ہے۔،،

ایک ھی صبح دو مختلف عورتوں کو بہار کی صبح بھی نظر آئی اور جاڑے کی صبح بھی۔ ایک نے اسے بہار کی صبح کہا، دوسری نے جاڑے کی۔ میرے واحد وجود کے اندر بھی دو مختلف انسان موجود ھیں ایک نوجوان ہے، دوسرا بوڑھا، ایک پھول ھی پھول ہے دوسرا برف ھی برف۔ ایک بہار ھی بہار ہے اور دوسرا جاڑا ھی جاڑا۔ اس لئے اگر آپ کو نظم اور نثر دونوں ھی اس کتاب میں نظر آئیں تو اس پر تعجب نہ کیجئے۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم ایک ھی ھاتھ میں دو تربوز لے کر چلنے کی کوشش کر رہے ھو؟،، مجھ سے سوال کیا جا سکتا ہے۔

''نہیں،، میں جواب دیتا ھوں۔ ''ایسا قطعی نہیں ہے۔،،

کیونکہ جب میں مختلف اصناف کو ایک جگہ جمع کرتا ھوں تو اسکی وہ صورت نہیں ہے کہ پھلوں کا سلاد بنانے کے لئے طرح طرح کے پھل کاٹ کر ایک میں حل کر دئے جائیں۔ میں تو ان کو ایک دوسرے میں پیوست کرنا چاھتا ھوں۔ اس ھنرمندی کے ساتھ ایک ماھرمالی ایک نئی طرح کا پیڑ وجود میں لانے کےلئے چشمہ چڑھاتا ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ اسکا نتیجہ کس صورت میں نمودار ھوگا۔ لیکن یہ تو ھر اس قدم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے جو انجانے میں اٹھایا جائے؟ جب آپ آگ جلاتے ھیں تو آپ کو پہلے سے یہ نہیں معلوم ھوتا کہ اس کے کیا کیا امکانی نتائج ھوسکتے ھیں۔ لیکن اسکے یہ معنی ھرگز نہیں کہ آپ کو جب بھی آگ جلانی ھو آپ خوف اور خدشہ محسوس کریں۔ میں دیاسلائی جلاتا ھوں ھاتھوں کے درمیان اسے چھپائے ھوئے ایک خشک لکڑی کی طرف بڑھاتا ھوں۔ آگ بھڑک اٹھتی ہے لیکن مجھے یہ ڈر نہیں لگتا کہ جو شعلہ میں نے روشن کیا ہے ابھی

تو ننھا اور معمولی ہے لیکن ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اچانک ایک ایسی خوفناک آگ بھڑک اٹھے جس پر کسی بھی طرح قابو نہ پایا جا سکے ۔ میں یہ سب کچھ نہیں سوچتا بس آگ جلا دیتا ہوں ۔

شامیل کا ایک قول ہے جو انہوں نے اپنی تلوار پر نقش کروا رکھا تھا : ''اس آدمی کو بہادر نہیں کہا جا سکتا جو گھوڑے پر سوار رن کی طرف جاتے ہوئے یہ سوچتا ہو کہ اسکے نتائج کیا ہونگے ۔ ''

ایک اور کہاوت اس طرح ہے : ہاتھ معجزنما ہوں تو سانپ کا زہر بھی تریاق بن سکتا ہے ۔ اور اگر کسی بےوقوف کے ہاتھ میں پڑ جائے تو شہد بھی نقصان‌رساں ہوسکتا ہے ۔

ایک اور کہاوت ہے : اگر تمہیں کہانی کہنا نہیں آتا تو اسے گیت میں ڈھال دو اور اگر گانا نہیں آتا تو اسے کہانی بنا دو ۔



اسلوب اور طرز ادا

مغنی کی آواز پہچان اسکی
تو زرگر کا انداز پہچان اسکی
(کوباچی کی دستکاری کے ایک نمونے سے)

''تم مجھے ڈانٹ کیوں رہے ہو؟''
''میں ڈانٹ نہیں رہا ہوں۔ میرے
بات کرنے کا انداز ہی ایسا ہے۔''
(میاں بیوی کے درمیان مکالمہ)

''تمہاری نظمیں شاعری نہیں لگتیں''
''یہی میرا اسلوب ہے''
(قاری اور شاعر کے درمیان مکالمہ)

جب بزرگوں کو کسی معاملے پر گفتگو کرنی ہوتی تو ہم لڑکوں کو گاؤں پنچائت میں بیٹھنے کی اجازت نہ ہوتی۔ ہم کچھ دور ایک بڑی سی چٹان پر بیٹھے یہ دیکھا کرتے کہ وہاں ہو کیا رہا ہے۔

ایک دن ہم نے دیکھا کہ آندی گاؤں سے آنےوالے ایک مہمان نے پورے ایک گھنٹے تک گاؤں پنچائت کو خطاب کیا اور اس پوری مدت کے دوران سارے لوگ پورے انہماک کے ساتھ اسکی تقریر سنتے رہے۔ یہ دیکھ کر ہم لوگوں نے یقین کر لیا کہ آندی سے آنےوالا یہ مہمان ضرور کوئی اہم خبر لایا ہوگا تبھی تو سب لوگ دم سادھے اسکی بات ایک گھنٹے تک سنتے رہے۔

گھر پہنچ کر میں نے ابا سے پوچھا:

''یہ آندی سے آنےوالا مہمان کونسی خبر لایا تھا؟،،

''انھ۔ وہی باتیں تھیں جو ہم سدا کے رہنےوالے کم از کم بیسوں بار سن چکے ہونگے، مگر اس کے بولنے کا انداز ایسا ہے کہ تم چاہو یا نہ چاہو سننے پر مجبور ہوجاؤگے۔ وہ واقعی مقرر ہے، خدا اسکی زندگی بڑی کرے۔،،

ذاتی طرزنگارش کے بارے میں۔ ہر جانور کے اپنے اطوار ہوتے ہیں، شکاریوں کو دھوکہ دےکر بچ نکلنے کے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر شکاری بھی جانور کو دھوکہ دینے اور شکار کر لینے کے اپنے اپنے طریقے کا مالک ہوتا ہے۔ اور بالکل اسی طرح ہر ادیب کا بھی اپنا انداز ہوتا ہے، لکھنے کا اپنا ڈھنگ ہوتا ہے، اسکا اپنا کردار ہوتا ہے اور اسکا ذاتی اسلوب ہوتا ہے۔

جب میں پہلی بار ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے ادارۂادب میں تعلیم حاصل کرنے ماسکو آیا تو مجھے یہ ماحول قطعی اجنبی اور نامانوس محسوس ہوا۔ یہاں کی ایک ایک چیز میرے لئے سبق‌آموز تھی: خود ماسکو، سمینار اور ان سمیناروں میں حصہ لینےوالے مشہور شعراء اور پروفیسر صاحبان، میرے ہم‌جماعت اور طالب‌علموں کی اقامت‌گاہ میں میرے ساتھی طلبا۔ قدم قدم پر اور چہار طرف سے ملنے والی ہدائتوں کے ہجوم میں تھوڑی دیر کےلئے میں کھوسا گیا اور ایک نئے انداز میں لکھنے لگا، میں نے ایک ایسا عجیب سا اسلوب اختیار کر لیا جس سے اس وقت تک آوار ادب قطعی نامانوس تھا۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اس وقت میری بڑی خواہش یہ تھی کہ میری نظموں کا روسی زبان میں ترجمہ ہو ۔ میں کسی نہ کسی طرح روسی قارئین کے حلقوں تک پہنچنا چاہتا تھا اور میرا خیال یہ تھا کہ میں نے یہ جو نیا انداز اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے اس سے مجھے روسی قارئین تک پہنچنے اور ان میں مقبول بننے میں بڑی مدد ملے گی۔ میں نے اپنی مادری زبان آوار کے آہنگ کو اور اسکی شاعری کی مخصوص نغمگی کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا۔ میرے نزدیک اہم‌ترین چیز ساخت اور اصل خیال رہ گیا۔ میں نے سمجھا کہ اس طور پر میرا اپنا رنگ وجود میں آرہا ہے، لیکن جیسا کہ مجھے اب جا کر احساس ہوتا ہے، میں چالاکی سے کام لے رہا تھا۔

خوش قسمتی تھی کہ جلدھی مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ شعرگوئی اور چالاکی میں کوئی مطابقت نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس سے پہلے ھی میرے دوراندیش باپ نے اسے محسوس کر لیا تھا۔ جیسے ھی انہوں نے میری نئی نظمیں پڑھیں وہ سمجھ گئے کہ میں دنبے کی چربدار دم کے عوض پورا دنبہ چھوڑ دینے کی تیاری کر رہا ھوں۔ میں ایک ایسی بنجر اور پتھریلی زمین پر ھل چلانے کی کوشش کر رہا ھوں جس میں کبھی کوئی چیز اگ نہیں سکتی، چاھے کتنی ھی آبیاری کیوں نہ کی جائے، اور میں بغیر بادلوں کے بارش کی آرزو کر رہا ھوں۔

ابا نے یہ سب کچھ فوراً ھی محسوس کر لیا تھا لیکن وہ طبیعت کے لحاظ سے انتہائی محتاط اور لئے دئے رھنےوالے انسان تھے۔ ایک دن بات چیت کے دوران انہوں نے کہا:

''رسول! مجھے یہ دیکھ کر افسوس ھوا کہ تمہارا طرزتحریر بدلتا جا رہا ہے۔ ،،

''ابا! اب میں خاصا بڑا ھوگیا ھوں۔ طرزتحریر پر توجہ تو اس وقت دی جاتی ہے جب بچہ اسکول میں ھو۔ جب آدمی بالغ ھوجاتا ہے تو لوگ صرف یہی نہیں جاننا چاھتے کہ وہ کس طرح لکھتا ہے بلکہ یہ بھی جاننا چاھتے ھیں کہ وہ لکھتا کیا ہے۔ ،،

''یہ بات ملیشیا کے کسی سپاھی یا کسی گاؤں سوویت کے سکریٹری کے بارے میں تو کہی جا سکتی ہے، جنکا کام اندراج

کرنا اور اسناد دینا ہے۔ لیکن شاعر کے لئے ایسا نہیں کہا جا سکتا، اسکا آدھا کام یہ بھی ہے کہ وہ لکھتا کس طرح ہے اور اسلوب کونسا اختیار کرتا ہے۔ کسی نظم کا خیال کتناهی اچھوتا کیوں نہ ہو، نظم کو حسین اور دلکش بھی ہونا چاہئے۔ اور صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ اسکے حسن میں انوکھاپن بھی ضروری ہے۔ شاعر اسی وقت شاعر بنتا ہے جب وہ اپنی ذات کا عرفان بھی حاصل کرلے اور اپنا ذاتی رنگ اور اسلوب بھی دریافت کرلے۔

''تم بڑی جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔ تیز رفتار، چنچل اور شور مچانے والا پہاڑی چشمہ کبھی بھی سمندر تک نہیں پہنچ پاتا، بلکہ اپنے مقابلے میں کہیں زیادہ پرسکون اور نرم‌رو دریا میں جذب ہوجاتا ہے۔

''جو چڑیا لگاتار اپنا گھونسلا بدلتی رہتی ہے اور کبھی یہ طے نہیں کر پاتی کہ کونسے گھونسلے کا مستقل انتخاب کرے وہ آخرکار گھونسلے کے بغیر رہ جاتی ہے۔ کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہے کہ خود اپنا گھونسلا بنایا جائے؟ اس طرح انتخاب کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ،،

اور آج جب کہ میں زندگی کی چالیس منزلیں طے کر چکا ہوں، اکثر اپنی چالیسوں کتابیں لیکر بیٹھتا ہوں اور ان کے اوراق الٹتا ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں نے گیہوں کا جو کھیت بویا ہے اس میں دوسرے کھیتوں کے پودے بھی گھس آئے ہیں، ایسے پودے جنہیں میں نے بویا بھی نہ تھا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ یہ سب گھاس پھوس ہوں، شاید وہ اچھے پودے ہیں - مثلاً جو، جئی اور رئی وغیرہ لیکن گیہوں کے کھیت میں یہ کچھ کھپتے نہیں -

مجھے اپنے گلے میں بعض ایسی بھیڑیں نظر آتی ہیں جو اس گلے کی نہیں لگتیں۔ یہ بھیڑیں نہ تو کبھی پہاڑ کی بلندی کی عادی ہو پائینگی اور نہ ہی وہاں کے ماحول کی۔

کبھی کبھی اپنے آپ میں مجھے غیر لوگ ملتے ہیں۔ لیکن اس کتاب میں صرف میں ہی رہنا چاہتا ہوں، کسی اور کا دخل

مجھے گوارا نہیں۔ اچھا ہوں یا برا، بہرحال میں جیسا بھی ہوں مجھے قبول کیجئے۔

پہاڑی علاقوں میں شادی بیاہ کی تقریبوں میں جب کوئی پہاڑی مہمان شرکت کےلئے آتا ہے تو وہاں پہلے سے موجود لوگوں سے پوچھتا ہے:

''تعداد پوری ہو چکی ہے؟ یا میرے لئے گنجائش باقی ہے؟''

اس پر وہاں بیٹھے لوگ جواب دیتے ہیں:

''اگر تم واقعی تم ہی ہو تو اندر آجاؤ۔''

یہ رہی میری کتاب اور میں اس کتاب کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میرا اپنا الگ وجود ہے جو دوسروں سے مختلف ہے۔ میں حقیقتاً ادیب بننا چاہتا ہوں، کوئی ایسا اداکار نہیں جو اسٹیج پر ادیب کا رول ادا کر رہا ہو۔ کبھی کسی ایسے ایکٹر کو دیکھئے جو اسٹیج پر برانڈی پی رہا ہو۔ وہ نشے میں دھت محسوس ہوگا، اسکی آواز بھاری ہوگی، الفاظ جھٹکے کے ساتھ اسکے منھ سے نکل رہے ہونگے، گردن نشے کے بار سے جھکی ہوگی۔ یہ سب اپنی جگہ پر لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ جس بوتل سے شراب پیتا نظر آرہا ہوگا اس میں شراب کی جگہ چائے بھری ہوگی اور چائے آپ کتنی ہی پی جائیے نشہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ وہ لوگ بھی مجھ سے متفق ہونگے جنہوں نے کبھی شراب کو منھ نہ لگایا ہو۔

ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی ڈرامے میں کسی شاعر کا کردار پیش کرنا ہوتا ہے تو ڈرامہ‌نگار کےلئے اس کے اشعار لکھنے کا کام مشکل‌ترین ہوتا ہے۔ اسلئے اکثر ڈرامے کا شاعر اپنی لکھی ہوئی نظمیں نہیں پڑھتا۔ لیکن بغیر شاعری‌والا تو وہ شاعر کہاں ہوا؟ اس میں اور کسی کھڑکی پر سجاوٹ کےلئے رکھے ہوئے پیپرماشی کے گلدے میں فرق کیا رہ گیا؟

مجھے اپنی نمائندگی آپ کرنی چاہئے۔ عمر، پشکن یا بائرن جیسے لوگوں کی بھی مشابہت میرے یہاں نظر نہ آنی چاہئے۔

جب کوئی چور بھینس کی چوری کرتا ہے تو اس کی سینگ یا دم کاٹ دیتا ہے تاکہ پہچانی نہ جاسکے۔ اسی طرح جب کچھ چور کار کی چوری کرتے ہیں تو اسکا رنگ بدل دیتے ہیں۔

لیکن چوری بہرحال چوری ہے، چاہے اسے چھپانے میں کتنی ہی ہوشیاری سے کام کیوں نہ لیا جائے۔

مجھے سب سے زیادہ مسرت اس وقت ہوگی جب یہ کتاب پڑھنے کے بعد لوگ بیساختہ کہہ اٹھیں کہ بیشک رسول نے یہ کتاب اپنے مخصوص رنگ میں لکھی ہے۔

مجھے گانےوالی چڑیاں چوں چوں کرنےوالی چڑیوں سے زیادہ پسند ہیں۔ مجھے فضا میں پرواز کرتی چڑیاں ان چڑیوں سے زیادہ اچھی لگتی ہیں جو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر بیٹھی دانہ چگ رہی ہوں۔ مجھے سمندر میں شاہانہ آن بان کے ساتھ رواں‌دواں جہاز اس جہاز سے کہیں زیادہ اچھا لگتا ہے جو کسی بندرگاہ پر کھڑے جہازوں کے ہجوم میں کھو گیا ہو۔

ہلکی ڈونگی کو دیکھئے جو سمندر کی ہر موج کے ساتھ ہچکولے کھاتی رہتی ہے، اور اس کے برخلاف بلند و بالا جہاز پر نظر ڈالئے جو طوفان میں بھی پوری استقامت کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔

شراب کا ایک قطرہ بھی گلے سے اتارے بغیر بیوقوف آپس میں یوں الجھتے اور لڑتے ہیں جیسے نشے میں دھت ہوں۔ اس کے برعکس شراب کا ایک بڑا سا قدح پینے کے بعد بھی عقلمند آہستہ آواز میں باتیں کرتے ہیں، پرامن اور سنجیدہ نظر آتے ہیں۔

رسول کی لکھی کتاب! لوگوں کے ہاتھوں میں اس طرح جا اور ان سے اس طرح ملاقات کر جیسے رسول کی لکھی کتاب کو کرنا چاہئے۔

جب کوئی اجنبی کسی پہاڑی گاؤں کے مکان میں داخل ہوتا ہے تو اس سے تین دن تک نہ تو یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسکا نام کیا ہے اور نہ یہی کہ وہ کہاں سے آرہا ہے۔

آپ میری کتاب کا استقبال بھی اسی طرح کیجئے۔ اس سے یہ مت پوچھئے کہ وہ کیا ہے، کہاں سے آئی ہے اور کس کی فکر کا نتیجہ ہے؟ اسے خود اپنے بارے میں سب کچھ بتانے کا موقع دیجئے۔

میں چاہتا ہوں کہ میں جیسا ہوں آپ کو ویسا ہی نظر آؤں نہ اس سے اچھا نہ اس سے خراب۔ اگر ۲۰ سال کی عمر تک

آپ میں توانائی نہ پیدا ہو سکے تو اسکا خیال چھوڑ دیجئے، کیونکہ اب یہ کبھی پیدا نہ ہوگی۔ اگر ۳۰ سال کی عمر تک آپ میں بذلہ‌سنجی اور طباعی کا مادہ نہ پیدا ہو سکے تو اس کی امید نہ کیجئے کیونکہ اب اسکی عمر گذر گئی۔ اگر ۴۰ سال کی عمر تک آپ کے پاس پیسہ نہ جمع ہو سکے تو اسے بھول جائیے کیونکہ اس کا وقت نکل چکا۔ یہ ایک روسی کہاوت ہے۔ پہاڑی باشندوں کا کہنا ہے: "اگر ۴۰ سال کا ہونے کے باوجود کوئی انسان عقاب جیسے شہپروں کا مالک نہ بن سکے تو وہ کبھی پرواز نہ کر سکے گا۔" میں چاہتا ہوں کہ میری گاڑی اسی راستے پر چلے جو اسکی اپنی شاہراہ ہے۔

جب بارش ہوتی ہے تو اس پہاڑ سے جس کے دامن میں میرا گاؤں واقع ہے لاتعداد سوتے میرے گاؤں کی طرف بہتے ہوئے آتے ہیں۔ نیچے آنے کے بعد یہ سارے دھارے آپس میں مل جاتے ہیں اور یوں برساتی پانی کی ایک جھیل سی وجود میں آجاتی ہے، لیکن اس جھیل سے جب یہ پانی آگے بڑھتا ہے تو اسکی صورت پانی کے ایک بڑے دھارے جیسی ہوتی ہے۔

میرے گاؤں کے اردگرد جو پہاڑ ہیں، ان سے بہت ساری پگڈنڈیاں میرے گاؤں کی طرف اترتی ہیں۔ اور یہ ساری پگڈنڈیاں اسی طرح گاؤں میں آکر ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں جیسے برساتی پانی کے نالے۔ لیکن اگر آپ کو ضلع کے صدرمقام کی طرف جانا ہو، قریبی قصبے میں جانا ہو یا اس سے آگے کی دنیا کی طرف بڑھنا ہو تو اس کے لئے صرف ایک ہی سڑک ہے، کشادہ اور چوڑی چکلی سڑک۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں خود کو کسی شاہراہ سے تشبیہ دوں یا کسی پرجوش دھارے سے۔ مجھے تو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اپنے گاؤں سے تعلق رکھنے والے بہت سارے لوگوں کے خیالات، ان کے الفاظ اور ان کے جذبات میرے اندر مجتمع ہو گئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح پہاڑ سے گرنے والے نالے اور اترنے والی پگڈنڈیاں میرے گاؤں میں پہنچ کر آپس میں مل جاتی ہیں۔ اور یہ میرا اپنا راستہ تھا، میری اپنی شاہراہ تھی جس نے مجھے گاؤں سے باہر شاعری کی دنیا تک پہنچایا۔

میں دنیا کے مختلف علاقوں میں آیا گیا ہوں، گونا گوں ریاستوں کی میں نے سیر کی ہے، متعدد ملکوں اور طرح طرح کے لوگوں سے ملا جلا ہوں۔ مجھے اسکا بھی موقع ملا ہے کہ کبھی صدارتی اور شاھانہ ضیافتوں میں شریک ہوں، کبھی وزیر اعظموں کی طرف سے دئے جانےوالے استقبالیہ جلسوں میں شرکت کروں اور کبھی محض وزیروں اور سفیروں کی پارٹیوں میں شریک ہوں۔ اس طرح کے استقبالیوں میں کتنا تزک و احتشام ہوتا ہے، گنجے سر اور پیروں کے جوتے کس آب و تاب کے ساتھ چمکتے ھیں، ٹائیاں کس قدر صاف ستھری ہوتی ھیں، قمیص کے کالر اور کف کتنے بےداغ ہوتے ھیں، کتنے تپاک کے ساتھ سر جھکائے جاتے ھیں اور ایک دوسرے کی طرف مسکراھٹیں پھینکی جاتی ھیں۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک انداز کتنا نپاتلا ہوتا ہے۔ اس طرح کی تقاریب میں اداکار وزیراعظم معلوم ہوتے ھیں اور وزیراعظم اداکار۔

ایسے استقبالیہ جلسوں میں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے آپ میں نہیں رہ گیا ہوں۔ مجھے ایسے انداز اپنانے پڑتے ھیں جنہیں اپنانا مجھے کبھی پسند نہیں، اور ایسے جملے بولنے پڑتے ھیں جنکا نہ میں کبھی عادی رہا ہوں، نہ عادی بننا چاھتا ہوں۔ اس طرح کی استقبالیہ تقریبوں کی چمک دمک میں اچانک مجھے بہت دور سدا کے گاؤں میں اپنے گھر کا چولھا یاد آجاتا ہے اور اس کے اردگرد جمع اپنے اعزا یاد آجاتے ھیں یا پھر مجھے کسی ہوٹل کے کمرے میں اپنے بےتکلف دوستوں کا حلقہ یاد آجاتا ہے۔ طرح طرح کے کھانوں کے بجائے میرا جی چاھتا ہے کہ میں لہسن پڑی خنکالی کھاؤں۔ اوہ، آستین چڑھا کر گھر کے چولھے کے اردگرد دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر خنکالی کھانے میں کتنا مزہ آتا ہے اور اس طرح کھانے میں کہ چربی آپ کی انگلیوں سے ٹپک رھی ہو۔

جب میں کچھ ادیبوں کی کتابیں پڑھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی رسمی اور سرکاری استقبالیہ میں شریک ہوں، ان کے انداز، ان کے رکھ رکھاؤ اور ان کی بول‌چال میں بے تکلفی کی جگہ مجھے ایک طرح کا رسمی اور سرکاری انداز نظر آتا ہے۔

میری کتاب! تجھے ایسا نہیں ہونا چاہئے جیسے تو کسی رسمی یا سرکاری استقبالیہ میں شریک ہو۔ تیری زبان پر وہی الفاظ ہونے چاہئیں جو تیری اصل فطرت سے ہم‌آہنگ ہوں۔ ایسی باتیں زبان پر کبھی نہ لانا جو محض انکسار یا پاسداری کےلئے کہی جاتی ہیں۔

میں ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو گھر میں اپنے خاندان‌والوں، اپنی بیویوں، بچوں یا دوستوں کے ساتھ ہوتے ہیں تو ان کا انداز ویسا ہی ہوتا ہے جیسا عام آدمیوں کا۔ ایکن اگر آپ ان کو دفتر میں انکی کرسی پر بیٹھے دیکھیں تو وہ انتہائی خشک‌مزاج، نک‌چڑھے بلکہ کسی حد تک ذلیل نظر آئینگے۔ لگتا ہی نہیں کہ وہی آدمی ہے جسے گھر پر دیکھا تھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں، جیسے جیسے ان کے عہدے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ان کی عادتیں، خصلتیں اور ان کے چہرے کے زاوئے بھی بدلتے جاتے ہیں۔

میری کتاب! خبردار، تیری فطرت میں بھی میری ہی طرح کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ شاندار استقبالیوں پر نہیں بلکہ دوستوں کے حلقوں پر جان دے، گھر کے سادہ چولھے سے اٹھنےوالے دھوئیں سے عشق کر، تقاریب اور جشنوں کےلئے بنائے گئے بڑے کمروں سے نہیں، میدانوں اور کھیتوں سے محبت کر، کنسرٹ سے نہیں بلکہ زمین کی خاموش زبان سے آنےوالی آوازیں سن، کانفرنسوں کے شوروغل پر دھیان نہ دے۔ کیا تو نے یہ نہیں دیکھا ہے کہ لوگ کانفرنس میں کچھ اور کہتے ہیں اور بعد میں قطعی مختلف انداز میں گفتگو کرتے ہیں؟

اپنی نوٹ‌بک سے۔ داغستان میں جنم لینےوالا وہ کون انسان ہوگا جو سلیمان استالسکی کی اونچی پاپاخ ٹوپی، ان کے بھیڑ کی کھال والے مہک‌دار کوٹ اور چمڑے کے ہلکے جوتوں سے واقف نہ ہو؟ اگر آپ داغستان سے تعلق نہ رکھتے ہوں تو بھی میرے خیال میں آپ کے ذہن میں سلیمان استالسکی کی جو شبیہہ محفوظ ہوگی وہ ان سارے لوازمات کے ساتھ محفوظ ہوگی۔

پھر ایسا ہوا کہ حکومت کی طرف سے انہیں اعزاز دیا گیا اور میکسم گورکی نے انہیں ۲۰ ویں صدی کا ہومر قرار دیا۔ سلیمان کو ماسکو آنے کی دعوت دی گئی جہاں انکی ملاقات داغستانی حکومت کے ایک رکن سے ہوئی۔

اس داغستانی وزیر نے شاعر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میرے پیارے سلیمان، ماسکو میں اس لباس میں پھرنا تمہارے لئے زیب نہیں دیتا۔ تمہیں اپنا حلیہ بدلنا ہوگا۔،،

پھر داغستانی حکومت کی طرف سے ان کے لئے گرم سوٹ سلوایا گیا، نئے جوتے خریدے گئے، ایک گرم ہیٹ، جس میں کان ڈھانپنے کا انتظام بھی تھا خریدا گیا، اوورکوٹ بنوایا گیا جس کے کالر پر سمور لگا ہوا تھا۔ سلیمان نے ایک ایک چیز کا جائزہ لیا۔ ایک شانے پر اوورکوٹ ڈالا، جوتوں کے تلے آپس میں ملائے اور پھر کسی نہ کسی طرح یہ ساری چیزیں تہہ کرکے اپنے بیگ میں رکھ لیں۔ اس کے بعد کہا: ''بہت بہت شکریہ۔ یہ ساری چیزیں نئی بھی ہیں اور اچھی بھی۔ میرے بیٹے مسلم کےلئے بہت مناسب رہینگی۔ اب رہا میرا معاملہ تو میں بہرحال سلیمان ہی رہنا چاہتا ہوں۔ گرم سوٹ یا ایک جوڑے جوتے کےلئے اپنا نام بدلنے کو تیار نہیں۔ میرے پرانے جوتے اس بیوفائی کےلئے مجھے کبھی معاف نہیں کرینگے۔،،

ابا کو سلیمان کی جو چیزیں بہت زیادہ پسند تھیں اور جنکی وہ بےحد قدر کرتے تھے ان میں اپنی انفرادیت کے اس طرح کے ظاہری مظاہر سے ان کی بےپناہ دلچسپی اور محبت بھی شامل تھی۔

اپنی نوٹ‌بک سے۔ سلیمان کے بیٹوں نے بار بار اس بات کی کوشش کی کہ ان کے والد کو لکھنا آجائے۔ ہر بار سلیمان بڑے خلوص اور بڑی لگن کے ساتھ سلسلہ شروع کرتے، لیکن پھر کاغذ اور پنسل ایک طرف رکھ دیتے اور کہتے:

''نہیں میرے بیٹو! یہ سب نہیں چلے گا۔ جیسے ہی میں پنسل ہاتھ میں لیتا ہوں میری نظمیں دور بھاگ جاتی ہیں کیونکہ میری ساری توجہ اس واہیات پنسل پر مرکوز ہوجاتی ہے۔،،

اپنی نوٹ بک کا ایک اور اندراج - ایفندی کاپیئف سلیمان استالسکی کے دوست بھی تھے اور انہوں نے ہی انکی نظموں کا روسی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے - آپ جانیں بعض گھٹیا اور ذلیل لوگ بھی ہوتے ہیں، جو کسی کی دوستی برداشت نہیں کر سکتے، چنانچہ ایسے لوگوں کی نگاہوں میں ان دونوں کی دوستی کھٹکنے لگی - انہوں نے کوشش کی کہ کاپیئف کو اس شہرۂآفاق شاعر کی نگاہوں سے گرا دیں، چنانچہ ان کے کان بھرنے لگے :

''سلیمان، افسوس ہے کہ تم روسی زبان نہیں جانتے - ہم لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایفندی کاپیئف ترجمہ کرتے ہوئے تمہاری نظموں کی ریڑہ مار دیتا ہے - وہ کبھی کچھ بڑھا دیتا ہے، کبھی کچھ گھٹا دیتا ہے، کبھی پورے مصرعوں کے مفہوم بدل دیتا ہے - ''

ایک دن غیر رسمی باتچیت کے دوران سلیمان نے یہ مسئلہ چھیڑا :

''دوست! میں نے سنا ہے کہ تم میرے بچوں کو مارتے پیٹتے ہو ؟''

ایفندی نے سلیمان کا مطلب فوراً سمجھ لیا اور جواب دیا :

''سلیمان! تمہاری نظمیں تمہارے بچے نہیں، یہ تم ہو، تمہاری ذات ہے، سلیمان استالسکی ہے جس نے ان نظموں کا روپ لے رکھا ہے - ''

''اگر یہ بات ہے تو بزرگ ہونے کی وجہ سے میں اپنے بچوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ احترام کا مستحق ہوں - ''

''سلیمان! مجھے یہ بتاؤ کہ کسی نظم میں مصرعوں کی تعداد زیادہ اہمیت رکھتی ہے یا اسکا اسلوب اور اسکا بنیادی خیال اور جذبہ؟ تمہارے سامنے شراب رکھی ہوئی ہے، اگر تم اسے بے کیف بنا دو تو اسکی مقدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی البتہ اس میں وہ مزہ نہ رہ جائے گا جسے ہم سب اتنا پسند کرتے ہیں - اہم چیز شراب کی مقدار نہیں ہے، بلکہ اسکی خوشبو، اسکا مزہ اور اسکی تیزی ہے - ''

''تم ٹھیک کہتے ہو، اہم چیز تو یہی ہے - ''

اور یقیناً یہ ایفندی کاپیئف ہی تھے جنھوں نے سلیمان کی تخلیقات کو روسی قارئین تک پہنچایا۔

میری نوٹ بک سے۔ ''مجھے تمہارے ابا کے کلام کی کاید نہیں مل سکی۔ ،، ایفندی نے ایک دن مجھ سے شکایت کی۔ وہ حمزہ سداسا کے کلام کا روسی زبان میں ترجمہ کر رہے تھے۔ ''تمہارے ابا کا اپنا انداز ہے۔ بظاہر وہ ہنستے نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً وہ اداس ہوتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ کسی کی تعریف کر رہے ہیں حالانکہ دراصل اس تعریف کے پس پشت طنز ہوتا ہے، مذاق اڑانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ مذاق اڑاتے نظر آتے ہیں تو دراصل اس مذاق کے پردے میں تعریف کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ محسوس کرتا ہوں لیکن روسی زبان میں اسے منتقل کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ میں انکی شعری تکنیک اور مصرعوں کے مفہوم پر تو گرفت حاصل کر لیتا ہوں لیکن جو چیز میرے بس میں نہیں آتی وہ حمزہ کی ذات ہے، خود حمزہ ہیں جیسے کہ وہ حقیقی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ روسی زبان میں حمزہ کے پڑھنےوالے انکی نظموں میں جیتے جاگتے حمزہ کو دیکھیں جو ہمارے ہی جیسے انسان ہونے کے باوجود ہم میں سے کسی سے بھی کوئی مماثلت نہیں رکھتے۔ ،،

شاعر کے اشعار کو بھی اسی طرح کا ہونا چاہئے۔

یادوں کی ایک جھلک۔ آج مجھے میرے گاؤں کے لوگ شاعر رسول حمزاتوف کے نام سے جانتے ہیں۔ لیکن ایک زمانہ تھا جب لوگ مجھے کوڑھ مغز اور الھڑ سمجھتے تھے، مجھ میں ایک لاابالی پن تھا۔ میں کر کچھ رہا ہوتا اور سوچ کسی اور چیز کے بارے میں رہا ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی قمیص الٹی پہن لیتا، کبھی کوٹ کے بٹن اوپر نیچے ہوجاتے اور اسی حالت میں باہر نکل کھڑا ہوتا۔ کبھی جوتے کے فیتے بندھے نہ ہوتے، باندھنے کی کوشش بھی کرتا تو اس طرح بندھتے کہ فوراً کھل جاتے چنانچہ لوگ میرے بارے میں کہا کرتے تھے:

''تعجب ہے کہ اتنے صاف ستھرے، باقاعدہ اور نیک‌دل انسان کا بیٹا اسقدر لاپرواہ اور پھوھڑ کیسے نکل گیا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان باپ بیٹوں میں بوڑھا کون ھے اور جوان کون؟ وہ جسے جوتے کے فیتے باندھنا بھی یاد نہیں رھتا یا وہ جو کبھی کوئی چیز فراموش نہیں کرتا؟''

اس طرح کی باتوں کا میرے پاس ایک جواب تھا، اور وہ یہ کہ ''ھاں! میں نے ابا سے ان کا بڑھاپا لے لیا ھے اور انہیں اپنی جوانی دیدی ھے۔''

اور واقعہ بھی یہی ھے کہ ابا اپنی زندگی کے آخری دنوں تک جوانوں ھی کی طرح خوش‌سلیقگی، نرمی اور لوچ کے حامل رھے۔ انہوں نے ظاھری اور باطنی دونوں ھی لحاظ سے ھمیشہ باسلیقہ، منظم اور آداب و آئین کی پابند زندگی گذاری۔ گاؤں کا ھر فرد اس بات سے واقف تھا کہ وہ کس وقت اپنے گھر کی چھت پر کوٹ پہنے نظر آئینگے۔ لوگ انہیں چھت پر دیکھ کر اپنی گھڑیاں ملایا کرتے تھے۔ گاؤں کے ایک نوجوان نے جو فوج میں ملازم تھا اپنے والدین کو ایک بار لکھا تھا کہ ''بیداری کا بگل بہت سویرے بجتا ھے۔ ھمیں ٹھیک اس وقت اٹھنا پڑتا ھے جس وقت گاؤں میں حمزہ اپنی چھت پر نظر آتے ھیں۔''

اگر کسی کو صبح کے وقت حمزہ سے ملنا ھوتا تو اسے معلوم رھتا کہ اسے ٹھیک کتنے بجے حنزہ کو جانےوالی سڑک پر پہنچ جانا چاھئے۔ حمزہ روزانہ ایک مقررہ وقت پر گھر سے کام کےلئے روانہ ھوتے تھے۔

لوگ ان کے بارے میں بہت ساری باتیں جانتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ کتنی دور تک اپنے گھوڑے کی لگام تھامے پاپیادہ چلینگے، اور کب اچھل کر گھوڑے پر بیٹھ جائینگے۔ لوگ انکی سادہ سیاہ قمیص، انکی برجس اور ان کے جوتوں سے واقف تھے جو انہوں نے خود بنائے تھے اور جن پر خود ھی روز صبح پالش کیا کرتے تھے۔ وہ انکی پیٹی سے واقف تھے اور انکی داڑھی سے بھی جسے وہ بڑی نفاست سے کتر لیا کرتے تھے لیکن کبھی مونڈتے نہیں تھے۔ وہ ان کی پاپاخ سے واقف تھے جو ان کے سر پر کچھ کسی سی محسوس ھوتی۔ ان کی ٹوپی پر

بھیڑ کے جو بال تھے وہ نہ تو بہت زیادہ گھونگریالے تھے اور نہ ہی بہت زیادہ گھنے۔

ابا کا اپنا ایک انداز تھا، وہ جو کچھ پہنتے یا جو کچھ کرتے وہ اس انداز کے عین مطابق ہوتا۔ حمزہ کے لباس میں یا رکھ رکھاؤ میں کسی تبدیلی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

یہ تبدیلی خود انہیں بھی ناپسند تھی۔ جب ان کے کپڑے پہننے کے قابل نہ رہ جاتے اور انہیں نئے کپڑے بنوانے پڑتے تو وہ پرانے کپڑوں اور پرانی چیزوں کی ہوبہو نقل تلاش کرتے۔ اور اگرچہ یہ نئے کپڑے پرانے کپڑوں کی ناپ کے ہی بنتے اور تراش‌خراش بھی مختلف نہ ہوتی پھر بھی وہ نئے کپڑے پہن کر کچھ دنوں تک مضطرب سے نظر آتے اور ایسا لگتا جیسے کچھ مغموم سے ہوں۔

ایک بار انکی پیٹی گھستے گھستے ٹوٹ گئی۔ نئی پیٹی خریدنے کے لئے کچھ زیادہ پیسوں کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن ابا نے بڑی احتیاط کے ساتھ پرانی پیٹی کی مرمت کی اور مزید کچھ دن اسے استعمال کرتے رہے۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ تنگ‌دست رہے ہوں اور اتنا پیسہ نہ رہتا ہو کہ اس طرح کے کاموں پر خرچ کیا جا سکے۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ جن چیزوں کے عادی ہوجاتے انہیں چھوڑنا پسند نہ کرتے۔ آخر پیٹی پھر ٹوٹ گئی، اب انہیں نئی پیٹی خریدنے پر مجبور ہونا پڑا، لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنی تسکین کا سامان فراہم ہی کر لیا، انہوں نے اس نئی پیٹی میں پرانی پیٹی کا بکسوا لگا لیا۔

وہ اپنی پاپاخ پر اس طرح ہاتھ پھیرتے جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا میمنہ ہو۔ جب انہیں اپنی پرانی پیٹی اتنی عزیز تھی، تو آپ یہ سوچ ہی سکتے ہیں کہ ان کے دل میں اپنی اس پاپاخ کے لئے کتنا پیار رہا ہوگا۔

۱۹۴۱ء کے موسم گرما میں جنگ چھڑ گئی۔ داغستان کی حکومت اس بات پر مصر ہوئی کہ ابا پہاڑی گاؤں چھوڑ کر مخاچ‌قلعہ چلے جائیں۔ وہ پہاڑ کی سرد آب و ہوا کے عادی تھے، شہر میں انہیں گھٹن سی محسوس ہوتی۔ پہاڑوں پر جو گرم

کپڑے وہ پہنا کرتے تھے، وہ شہر کے گرم موسم میں بوجھ سے محسوس ہونے لگے۔ خاص طور پر ان کی پاپاخ ٹوپی اس ماحول میں قطعی ناموزوں تھی۔ حمزہ نے طرح طرح کی ٹوپیوں اور ہیٹوں کا استعمال کیا لیکن انہیں پہن کر وہ اپنے حلقے میں اتنی تبدیلی محسوس کرنے لگتے کہ کسی طرح اپنی پاپاخ بدلنے پر تیار نہ ہوپائے حالانکہ ہم لوگ اپنی طرف سے پوری کوشش کرتے رہے کہ وہ کسی طرح مان جائیں۔

نتیجہ یہ تھا کہ حمزہ مخاچ‌قلعہ کی سڑکوں پر اس طرح گھومتے کہ انکی پاپاخ ان کے ھاتھ میں ھوتی۔ وہ کچھ دیر تک اسے پہنے رھتے، پھر اتار کر ھاتھ میں لے لیتے لیکن ایک منٹ کےلئے بھی اسے علاحدہ کرنے پر راضی نہ تھے۔

لوگ رفتہ رفتہ حالات کے عادی ھو جاتے ھیں چاھے وہ جنگ کے تباہ کن حالات ھی کیوں نہ ھوں۔ زندگی کا دھارا بہہ نکلتا ھے چاھے اب اسکا آھنگ جنگ کا آھنگ ھی کیوں نہ ھو۔ ابا پھر وقتاً فوقتاً پہاڑی علاقے میں آنے جانے لگے۔ ان کے لئے پہاڑ کی کھلی فضا میں سانس لینا کتنا آسان ھوتا اور انہیں کتنی مسرت ھوتی جب وہ اس آب و ھوا میں اپنی کبھی جدا نہ ھونے والی پاپاخ پہن کر چہل قدمی کرتے۔ اپنے ان سفروں کے دوران ان کے چہرے پر ایسی بشاشت نظر آتی جیسے کسی انسان کو طویل عرصے تک سگریٹ پینے پر سخت پابندی کی اذیت جھیلنے کے بعد اچانک تیز اور خوشبودار گھریلو تمباکو مل گئی ھو اور اب وہ بڑے آرام کے ساتھ لذت لے لے کر اس تمباکو سے سگریٹ بنا رھا ھو، پھر متوقع لذت کے شدید احساس کے ساتھ سگریٹ جلا رھا ھو اور پھر سگریٹ کے ایک طویل کش کا مزہ لوٹ رھا ھو۔

حمزہ نے سگریٹ کبھی نہیں پی لیکن انہیں اتنی ھی یا اس سے بھی زیادہ لذت زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے حاصل ھو جایا کرتی تھی تخلیق سے حاصل ھونےوالی مسرت یا گھر اور ملک سے شدید محبت سے ملنے والی مسرت جیسی بڑی چیزوں کا تو ذکر ھی کیا ھے۔

ابا کی نوٹ بک سے۔ "رجب میرا دوست ہے، لیکن اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو دشمن بھی نہیں کر سکتا۔ اس میں ایک استرے نے اسکی مدد کی۔" یہ ابا کی نوٹ بک میں ایک جگہ درج ہے۔ بات یوں ہے کہ ۱۹۳۴ء میں ابا ادیبوں کی پہلی کانگرس میں شرکت کی غرض سے ماسکو گئے۔ آوار ادیب رجب دین ما گومائیف نے جو اس وقت زندہ تھے ابا کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ ایک حجام کی دکان پر جا کر سر اور داڑھی کے بال ترشوا لیں۔ اب یہ بتانا تو مشکل ہے کہ رجب نے اشارہ کردیا تھا یا حجام کو غلط فہمی ہوئی بہرحال ہوا یہ کہ ابا ابھی پوری طرح سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ ہو کیا رہا ہے، جب تک انکی وہ داڑھی جو کبھی بھی مونڈی نہ گئی تھی، ان کے چہرے سے صاف ہوچکی تھی۔ جب انہیں اپنی اس درگت کا احساس ہوا تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ جب انہوں نے آئینے میں ایک قطعی نیا اور نامانوس چہرہ دیکھا تو وہ چیخ پڑے، اپنے دونوں ہاتھوں سے انہوں نے اپنے چہرہ چھپایا اور حجام کی دکان سے بھاگ آئے۔ اس کے بعد انہوں نے کانگرس کے کسی اجلاس میں شرکت نہ کی اور اپنے دوستوں سے بھی الگ تھلگ رہے۔ بعد میں انہوں نے کہا:

"جب میں زندگی میں اپنے چہرے سے غداری نہ کرسکا تو پھر اپنی نظموں میں اپنے چہرے سے غداری کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟"

ابا کو تصنع اور بناوٹ نہ زندگی میں پسند تھی نہ شاعری میں، زندگی میں صرف ایک بار انہوں نے طبیعت کے خلاف بناوٹی انداز اختیار کیا، مگر وہ بھی کچھ ہی دیر کے لئے۔

یاد کی ایک جھلک۔ ایک دن مخاچ قلعہ میں ہمارے گاؤں کے کچھ لوگ ابا سے ملنے آئے۔ گفتگو کے دوران ان لوگوں نے محسوس کیا کہ ابا ایک ایسے انداز میں بیٹھے ہیں جو قطعی نیا اور انوکھا ہے، یعنی انکی ٹھوڑی تین انگلیوں پر ٹکی ہوئی ہے۔

ان میں سے ایک نے کہا: "اس سے پہلے ہم نے تم کو کبھی اس طرح بیٹھے نہیں دیکھا ہے کہ تمہاری ٹھوڑی تین

انگلیوں پر ٹکی ہو ۔ یہ عادت کب سے پڑی؟ کیوں پڑی؟ یہ عادت تم پر اچھی نہیں لگتی، حمزہ! یہ انداز تو تمہارا ہے ہی نہیں ۔ ''

''ہاں ۔ مجھے یہ عادت چھوڑ دینی چاہئے ۔ '' حمزہ نے کہا ۔ ''اسکی ذمہ‌داری مصور محی‌الدین جمال پر ہے ۔ اسے میری تصویر بنانی تھی اور اس نے پورے تین مہینے تک مجھے یونہی بٹھائے رکھا ۔ پورے تین مہینے میں اسکے سامنے بے‌حس و حرکت بیٹھا رہا یوں کہ میری تین انگلیاں میری ٹھوڑی کو سہارا دئے رہیں ۔ مصور یہی چاہتا تھا اور مجھے بہرحال اسکے حکم کی تعمیل کرنی تھی ۔ ''

''یہ تو بڑا صبر آزما کام رہا ہوگا؟''

''نہیں ۔ یہ صبرآزما تو نہ تھا البتہ مسلسل اس انداز کو برقرار رکھنا یقیناً خاصا تکلیف دہ تھا ۔ کبھی مجھے یوں لگتا کہ یہ جو تین انگلیاں میری ٹھوڑی کو سہارا دئے ہوئی ہیں وہ میری نہیں کسی اور کی ہیں ۔ اور کبھی یہ احساس ہوتا کہ میری تین انگلیاں کسی اور کی ٹھوڑی کو سہارا دے رہی ہیں ۔ میں تین مہینے تک روزانہ اسی انداز سے بیٹھتا رہا آخر اسکا عادی ہوگیا ۔ اب یوں بیٹھنا نہیں پڑتا، تصویر مکمل ہوچکی ہے اور دیوار پر آویزاں ہے لیکن جیسا کہ آپ لوگ دیکھ ہی رہے ہیں میں اب بھی اپنی تین انگلیوں سے اپنی ٹھوڑی کو سہارا دئے رہتا ہوں ۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ دل کا مریض اس وقت بھی اپنا ہاتھ اپنے سینے پر بائیں جانب رکھے رہتا ہے جب اس کے دل میں درد بھی نہ ہو رہا ہو ۔ لیکن آپ لوگ پریشان نہ ہوں، میں یہ عادت جلد ہی چھوڑ دونگا ۔ ''

ابا کی نوٹ‌بک میں ایک اور اندراج بھی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے دانت کیسے تبدیل کرائے ۔

جب دوسرے دانت لگائے جانے لگے تو دندان ساز نے حمزہ سے پوچھا کہ وہ کس قسم کے دانت پسند کرتے ہیں : سونے، چاندی یا فولاد کے؟ حمزہ کچھ طے نہ کر پائے، انہوں نے دوستوں سے صلاح کی جو اس وقت ان کے ساتھ تھے ۔

"سونے کے دانت لگوالو۔ سونا بہت اچھی دھات ہے۔"
ان میں سے ایک نے مشورہ دیا۔

"نہیں فولاد بہتر رہے گا، وہ مضبوط بھی ہوگا اور گھسے گا بھی نہیں۔" دوسرے نے کہا۔

"میں سونے یا فولاد کے دانت لگوا کر گاؤں پہنچا تو کیسا لگوں گا؟" ابا نے اعتراض کیا۔ "لوگ میری طرف یوں دیکھینگے جیسے میرے منھ میں دانت نہ ہوں بلکہ قمقمے لگے ہوں۔ وہ مجھے نہیں دیکھینگے کیونکہ انکی نگاہیں دانتوں پر جم کر رہ جائینگی، میرے دانتوں کی آب و تاب میرے چہرے کو پس‌منظر میں ڈال دےگی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ہڈی کے دانت لگا دیں تاکہ کوئی یہ نہ محسوس کر سکے کہ میں نے نئے نقلی دانت لگوائے ہیں، میری پسند تو یہی ہے۔"

دنداں ساز نے حمزہ کے حکم کی تعمیل کی اور ان کے لئے ویسے ہی دانت بنا دئے جیسے پہلے تھے۔

بعد میں جب بھی ابا کو کسی شاعر کی نظم میں بےمیل مصرعے یا کسی اور کے مصرعے نظر آتے تو وہ کہا کرتے:
"مجھے اسکی نظموں میں چمکتے ہوئے نقلی دانت دکھائی دے رہے ہیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ سونے کے دانت سے بھی سیب کھایا جاسکتا ہے لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ سونے کے دانت سے سیب کھانے میں نہ اتنا مزہ ملےگا نہ اتنا رس منھ میں آئےگا جتنا اصلی دانت سے ملتا ہے۔

یاد کی ایک جھلک۔ ۱۹۶۷ء میں مخاچ‌قلعہ تھیٹر میں ایک شاندار جشن کا اہتمام کیا گیا۔ یہ جشن شاعر حمزہ کی ۷۰ ویں سالگرہ سے متعلق تھا تقریروں کے ذریعے انہیں مبارکبادیں دی گئیں، تہنیت کے پیغامات پڑھے گئے، بہت ساری نظمیں سنائی گئیں اور تحفے دئے گئے۔ آخر میں معزز مہمان کے بولنے کی باری آئی۔ ابا اسٹیج پر آئے، انہوں نے کوٹ کی اوپری جیب سے بڑے سکون کے ساتھ کاغذ کا ایک صفحہ نکالا جس پر انکی وہ نظمیں تھیں جو انہوں نے اس موقع کےلئے لکھی تھیں۔ پھر

انہوں نے اسی سکون کے ساتھ دوسری جیب میں ھاتھ ڈالا، عینک کی تلاش میں، لیکن اب ان کا روائتی سکون رخصت ھوچکا تھا۔ انہوں نے ایک جیب ٹٹولی، دوسری جیب کی تلاشی لی اور اب یہ بات سب کو معلوم ھو گئی کہ ابا اپنی عینک گھر ھی چھوڑ آئے ھیں۔

فوراً ایک آدمی عینک لانے کےلئے گھر بھیجا گیا۔ مگر حمزہ اسٹیج پر پہنچ چکے تھے اور خاموش کھڑا رہنا کچھ عجیب سا لگ رہا تھا، اس لئے ان کے دوست ابوطالب نے اپنا چشمہ پیش کر دیا جسکے بارے میں انہیں یقین تھا کہ حمزہ کو بھی لگ سکےگا۔ حمزہ نے چشمہ لگایا اور پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ وہ اپنے ھی اشعار پڑھ رہے تھے لیکن انکی آواز میں کچھ ایسی جھجک اور انکے پڑھنے کے انداز میں کچھ ایسی کیفیت تھی جس سے یہ معلوم ھورھا تھا کہ وہ ایسے اشعار پڑھ رہے ھیں جنہیں اس سے پہلے انہوں نے کبھی دیکھا تک نہ ھو۔

ابھی انہوں نے دوسری نظم شروع ھی کی تھی کہ وہ لڑکا جسے انکی عینک لینے کےلئے بھیجا گیا تھا بھاگتا ھوا ھال میں داخل ھوا۔ حمزہ نے فوراً ابوطالب کا چشمہ واپس کیا اور اپنی عینک لگالی۔ اور فوراً ھی ان کا انداز بدل گیا اور انکی آواز میں وہ خود اعتمادی پیدا ھوگئی جو انکی خصوصیت تھی۔ حاضرین نے اس تبدیلی کا پرجوش تالیوں کی گونج کے ساتھ خیر مقدم کیا گویا سداسا حمزہ حقیقتاً اب اسٹیج پر آئے ھوں اور اب تک جو آدمی اسٹیج پر کھڑا تھا وہ حمزہ نہ تھے بلکہ کسی نے ان جیسا سوانگ رچا رکھا تھا۔

"اس چشمے نے تو میری سالگرہ کی تقریب تقریباً چوپٹ ھی کر دی تھی۔" حمزہ نے مسکراتے ھوئے کہا۔

"کیا میرا چشمہ اچھا نہ تھا؟" ابوطالب نے سوال کیا۔

"نہیں، وہ چشمہ بھی بہت اچھا تھا، مگر بات یہ ھے کہ وہ تمہارا تھا۔ ھر آدمی کے پاس اسکی اپنی آنکھیں ھوتی ھیں اور اسے اپنے چشمے کی ضرورت ھوتی ھے۔"

ابا کا عالم یہ تھا کہ نہ تو وہ اتنی تیز روشنی میں دیکھنا پسند کرتے تھے کہ آنکھیں چکاچوند ھو جائیں اور نہ اتنے اندھیرے

میں کہ کوئی چیز نظر ہی نہ آسکے۔ نہ انہیں بہت زیادہ موٹی چیزیں اچھی لگتیں نہ بہت زیادہ پتلی، نہ بہت زیادہ سرد نہ بہت زیادہ گرم، نہ بہت زیادہ مہنگی نہ بہت زیادہ سستی، نہ بہت زیادہ پرانی قسم کی اور نہ بہت زیادہ جدید طرز کی۔

انہیں بھیڑیئے کی خونخوار فطرت بھی ناپسند تھی اور خرگوش کا بوداپن بھی، من‌مانی حکومت بھی اور غلاموں کی سی ماتحتی بھی۔ وہ کہا کرتے تھے:

''اتنے خشک بھی نہ ہو کہ چٹخ کر ٹوٹ جاؤ اور اتنے نم بھی نہیں کہ کپڑے کی طرح نچوڑے جا سکو!،،

وہ اس طرح کے آدمی نہ تھے کہ پانی کا ایک قطرہ انہیں شرابور کر دے یا معمولی سی ہوا سے وہ خشک ہو جائیں۔ وہ ایک سیدھے سادے محنت کش انسان تھے جن میں عوام کی تمام عادتیں اور خصوصیات مجتمع ہو گئی تھیں اور یوں وہ عوام کے ایک باعزت نمائندے بن گئے تھے۔

یاد کی ایک جھلک۔ ایک دن ابا کو اور مجھے اپنے ایک عزیز کی عیادت کےلئے مخاچ‌قلعہ سے گاؤں جانا تھا۔ ہمارے گاؤں جانے کی خبر عبدالرحمان دانیالوف کے کانوں تک پہنچ گئی جو ان دنوں داغستانی حکومت کے سربراہ تھے۔ انہوں نے ہمارے سفر کےلئے سرکاری سیاہ موٹر بھیج دی جو جہاں تک مجھے یاد ہے ''زیم،، ماڈل کی تھی۔

جب تک ہماری موٹر شہر کی سڑکوں پر چلتی رہی ابا بہت خوش نظر آتے رہے۔ مگر جیسے ہی ہم دیہی علاقے میں داخل ہوئے اور ہماری موٹر گدھوں، خچروں اور گھوڑوں پر سوار یا پیدل چلنےوالے پہاڑی باشندوں کے قریب سے گذرنے لگی ابا نے اپنی آرام‌دہ سیٹ پر یوں نظر ڈالی جیسے وہ کچھ بہت زیادہ ناگوار سی چیز ہو۔ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا اور مجھ میں بڑوں جیسے احساسات ابھی پیدا نہ ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال دیا تاکہ لوگ یہ دیکھ سکیں کہ ہم کتنی شاندار موٹر میں سفر کر رہے ہیں، ادھر ابا کا یہ حال

تھا کہ وہ کونے میں دھنستے جا رہے تھے تاکہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

اس درمیان بارش ہونے لگی۔ جب ہم گوت سال ندی پر پہنچے تو ہمیں وہاں ایک بیل گاڑی نظر آئی جو بیچ دھارے میں پھنس گئی تھی۔ بوڑھا گاڑی بان اسے باہر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا مگر معاملہ اس کے بس سے باہر تھا۔ ابا نے ڈرائیور سے گاڑی رکوائی، دریا میں اترے اور وہاں بوڑھے گاڑی بان کے ساتھ بیل گاڑی باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ دونوں نے مل کر بیل کی باگ سنبھالی، کاندھوں سے گاڑی کے پہیوں کو دھکا دیا اور دیکھتے دیکھتے بیل گاڑی دوبارہ سڑک پر آ گئی۔ ہمارا سفر پھر شروع ہوا لیکن ابھی چند ہی کلومیٹر گئے ہونگے کہ پھر ایک ندی راستے میں پڑی۔ ابا نے موٹر پھر رکوا دی اور وہاں ٹھہر کر بوڑھے گاڑی بان کا انتظار کرنے لگے۔

''یہاں پہنچ کر وہ پھر پھنس جائے گا۔ بیلوں کو یہ دریا پار کرانا مجھے اچھی طرح آتا ہے، میں یہاں رک کر اسکا انتظار کروں گا اور اسے دریا پار کرا کر ہی آگے بڑھوں گا۔''

ہم لوگ وہاں انتظار کرتے رہے، آخر بوڑھا گاڑی بان اپنی بیل گاڑی لئے ہلتا ڈلتا ہم تک پہنچا، ابا نے اسے ندی پار کرائی اور تب ہم آگے بڑھے۔

''کئی بار میں بھی بوئیناکسک سے طرح طرح کے سامان لے کر گاؤں لوٹتے ہوئے اسی طرح کی مصیبت میں پھنس چکا ہوں،'' ابا نے کار کی طرف آتے ہوئے اور کوٹ کے دامن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ایک غم گین مسکراہٹ کے ساتھ بیل گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے گویا اس ہلتی ڈلتی بیل گاڑی کے ساتھ ان کا ماضی اور ماضی ہی نہیں بلکہ انکی پوری زندگی بھی ان سے دور ہوتی جارہی ہو۔

حمزہ کے پلیٹو کی چڑھائی پر ایک لاری ہماری کار سے آ ٹکرائی اور کار کا ایک پہیہ ٹوٹ گیا۔ ہم لوگوں کو یوں لگا جیسے ابا اس حادثے سے خوش ہوئے ہوں کیونکہ اب کار چھوڑنے اور پیدل گاؤں جانے کا ایک بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ ہم نے

ان سے اصرار کیا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائیں تاکہ ہم کار میں موجود فالتو پہیہ لگا لیں، مگر انہوں نے ہماری ایک بات نہ سنی۔

''میں تو اس طرح کی کار میں بیٹھ کر کسی شادی کی تقریب میں شرکت کےلئے جانا بھی شرمناک سمجھتا ہوں، اس وقت تو میں اپنے ایک بیمار دوست کی عیادت کےلئے جارہا ہوں مجھے اس آن‌بان کی ضرورت نہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ کار خراب ہوجانے سے مجھے خوشی ہوئی ہے، کیونکہ اب میں پیدل چل سکوں گا۔ ''

یہ کہہ کر وہ اسی پگڈنڈی پر چل پڑے جس پر وہ بچپن سے چلتے آئے تھے اور جس پر پہاڑی باشندوں کی لاتعداد نسلیں یکے بعد دیگرے ہمارے گاؤں آتی رہی ہیں۔ ہم نے دوسرا پہیہ لگایا اور شاہراہ سے ہوتے ہوئے ٹھیک اس وقت گاؤں پہنچے جب ابا گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔

مخاچ‌قلعہ میں واپسی پر عبدالرحمان دانیالوف نے تردد کے ساتھ ابا سے حادثے کے بارے میں پوچھا۔

''کار تو بہت اچھی تھی،'' ابا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بس ذرا سا اور خراب ہوجاتی تو سب کچھ ٹھیک ہوتا۔ ''

یاد کی ایک جھلک۔ زندگی کے آخری برسوں میں ابا بےحد علیل رہا کرتے تھے۔ ابا پر بیماری کا حملہ اچانک پہاڑی علاقوں کے ایک دورے کے درمیان ہوا جہاں انہیں اپنے حلقۂ انتخاب میں لوگوں سے خطاب کرنا تھا۔ سوویت یونین کی اعلی سوویت کےلئے الیکشن ہونےوالا تھا اور انہیں امیدوار نامزد کیا گیا تھا۔

وہ ضلع کے صدرمقام تک تو کار سے گئے تھے لیکن انہیں پہاڑی علاقے میں اپنا سفر گھوڑے پر کرنا تھا۔ ابا کو پرسکون اور فرمانبردار گھوڑے پسند تھے۔ عام طور پر وہ بہت آہستہ گھوڑا چلایا کرتے تھے، بار بار گھوڑے سے اتر جاتے اور اسکی باگ پکڑ کر چہل‌قدمی کرنے لگتے۔ چہل قدمی سے ابا کو سب سے زیادہ خوشی ہوتی تھی۔

مقامی حکام نے غیرمعمولی طور پر ابا کا خیال کیا۔ انہوں نے اپنے ہونے والے نمائندے کے لئے ایک جوان اور تیز رفتار

گھوڑے کا اهتمام کیا تھا ۔ جو کچھ ھوا اسکا الزام ان کے سر نہیں، کیونکہ ان بیچاروں نے تو بڑی نیک‌نیتی کے ساتھ اپنے معزز مہمان کے لئے علاقے کے بہترین گھوڑے کا اهتمام کیا تھا ۔

اور یہ بہتر سالہ بزرگ بھی اپنے میزبانوں کی دل شکنی نہیں کرنا چاھتا تھا ۔ چنانچہ اس نے اپنی ضعیفی بھلا دی اور جوانوں کی طرح اچھل کر اس گھوڑے پر سوار ھو گیا ۔ معمر شاعر کو چاروں طرف سے نوجوان گھوڑ سوار گھیرے ھوئے تھے اور یوں لگ رھا تھا جیسے کوئی امام اپنے نائبوں کے ساتھ کہیں سفر کر رھا ھو ۔

جوان‌سال گھوڑ سواروں نے اپنے اپنے گھوڑوں کی باگ سنبھالی، ایڑ لگائی اور تیزی کے ساتھ چابک لہراتے مختلف راستوں سے مختلف دیہاتوں کی طرف یہ اعلان کرنے چل دئے کہ حمزہ وھاں آنے‌والے ھیں ۔ جوش و خروش کی اس فضا سے ابا کا گھوڑا بھی متاثر ھوئے بغیر نہ رہ سکا اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور اس مجنونانہ دوڑ میں شامل ھوگیا ۔ زین پر بیٹھے ضعیف‌العمر شاعر کو اس دوڑ نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، ان کی طبیعت بگڑنے لگی، اور بگڑتی ھی چلی گئی یہاں تک کہ وہ گھوڑے سے نیچے آ رھے ۔ سخاچ‌قلعہ واپس آئے تو ابا بہت بیمار تھے اور یہ مرض انکی جان لے کر ھی ٹلا ۔

''شاعری کا بھی یہی حال ھے،، انہوں نے کھانستے ھوئے کہا تھا ۔ ''شاعر کو چاھئے کہ وہ اپنے ھی گھوڑے پر سواری کرے، اسی گھوڑے پر جسکا وہ عادی ھے، اور کسی غیر کے گھوڑے پر سوار نہ ھو جسکو وہ قابو میں نہ رکھ سکے ۔ غیر کا گھوڑا یقیناً کہیں جا کر اسے دغا دے‌گا ۔ ،،

ابا کے بارے میں گفتگو کرنی ھو تو میں بے تکان بول سکتا ھوں ۔ لیکن اب میں آپ سے ان کے ایک دوست ابوطالب کا ذکر کرنا چاھتا ھوں جن کے ساتھ میں نے کل کا پورا دن گذارا ھے ۔

ابوطالب کے ساتھ ایک دن ۔ میرے لئے اپنی کسی ناتمام نظم کو جو کسی وجہ سے ادھوری رہ گئی ھو، پورا کرنا مشکل

ترین کام ہوتا ہے۔ پہاڑی لوگ کہتے ہیں کہ مینڈک کے دم نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دم لگانے کا کام اس کی تخلیق کے وقت اگلے دن کےلئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔

صبح کو میں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ لمبی نظم جو میں نے پندرہ دن پہلے شروع کی تھی، آج پوری کر ڈالوں۔ اس کے لئے ایک پورا دن درکار تھا اس لئے میں نے اپنے بچوں کی کھلائی فروسیا سے کہا:

''اگر کوئی مجھے پوچھنے آئے تو کہہ دینا کہ میں باہر گیا ہوں اور اگر کوئی ضروری کام ہو تو دن کے کھانے کے بعد ہی گھر پر مل سکوں گا۔''

یہ کہہ کر میں نے زینے طے کئے، اپنے کمرے میں آیا اور کام شروع کر دیا۔ لیکن سڑک کا شوروغل مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ میں نے پھاٹک کھلنے کی آواز سنی۔ پھر فوراً ہی گھنٹی بجی، میں یہ تو نہ سن سکا کہ فروسیا کیا کہہ رہی تھی مگر ابوطالب کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں جس کرسی پر بیٹھا تھا اچانک وہ یوں لگنے لگی جیسے جلتا ہوا توا ہو یا کانٹوں بھرا بستر۔ کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ ابوطالب حمزہ اور اب رسول کے دروازے سے اس طرح واپس لوٹے ہوں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ دروازے پر آئے ہوں اور گھر میں داخل ہوئے بغیر لوٹ گئے ہوں۔ یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ نہ تو میں یہ برداشت کر سکتا تھا کہ ابوطالب مایوس لوٹیں اور نہ ہی یہ بات کچھ اچھی لگتی تھی کہ فروسیا کو جھوٹا ثابت کیا جائے جس نے میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ابوطالب سے کہہ دیا تھا کہ میں گھر پر موجود نہیں ہوں اور سہ پہر کے بعد واپس آؤنگا۔

آخر دل نے دماغ پر فتح پالی۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور ابا کے پرانے دوست سے کہا:

''آئیے ابوطالب۔ میں یہاں ہوں۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔ کیا حمزہ کے بیٹے پر ایسا وقت آسکتا ہے کہ وہ اپنے قرض خواہوں سے چھپنے لگے؟''

ابوطالب نے فوراً اپنی پاپاخ اتاری اور فروسیا کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر آگئے۔ انہوں نے ترچھی نگاہوں سے فروسیا کو دیکھتے ہوئے کہا: ''رسول! اس عورت کو سمجھا دو کہ جب ابوطالب اس دروازے پر آتا ہے تو یہ اپنے آپ کھل جاتا ہے اور رسول ہمیشہ اس سے ملنے کے لئے گھر پر موجود رہتا ہے۔ ہاں! اسے یہ بھی بتا دو کہ اگر تم نہ بھی ہو تو اس گھر میں ہمیشہ ابوطالب کے لئے کھانے اور پینے کا سامان موجود رہتا ہے اور اگر اسے رات گذارنی ہو تو اسکا انتظام بھی ہو جاتا ہے۔''

''اس میں فروسیا کی غلطی نہیں۔ قصور فاطمہ کا ہے، صبح جب وہ کام پر جا رہی تھی تو وہ فروسیا کو یہ حکم دے گئی تھی کہ جو بھی مجھ سے ملنے آئے اس سے کہہ دے کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ میری بیوی میرا بڑا خیال رکھتی ہے۔''

''بیوی کی موجودگی بھی کتنی بڑی چیز ہے، سارا قصور اسکے سر ڈال دو اور خود سارے الزام سے بری ہو جاؤ۔ فاطمہ کبھی بھول ھی نہیں سکتی کہ آج جمعرات ہے''، ابوطالب نے اپنی جھبری شرابور پاپاخ ھلاتے ہوئے کہا۔

''جمعرات کی ایسی کیا خاص خصوصیت ہے؟''، میں نے پوچھا۔

''خصوصیت۔ یہ میرے غسل کا دن ہے۔ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ میں ہر جمعرات کو حمام جاتا ہوں اور چونکہ یہ جگہ تمہارے یہاں سے اتنی قریب ہے اس لئے ہر جمعرات کو اسکا امکان رہتا ہے کہ میں یہاں آجاؤں، کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کروں، تمبا کو پیئوں اور سستانے کے بعد اپنے گھر چل دوں؟''

''ابوطالب آپ کو حمام جانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے مکان میں تو خود غسل خانہ موجود ہے جس میں گرم پانی کا نل لگا ہوا ہے۔''

''شاور اور ٹب تو میرے نزدیک کالی روٹی جیسے ہیں، اور ترکی طرز کا غسل خانہ شادی کی ضیافت۔ میرا ایک باغ ہے اور اس باغ سے ایک چشمہ گذرتا ہے جو ہزارھا سال سے اسی طرح پہاڑوں سے بہتا چلا آرہا ہے، میں نے اس سے ہر پیڑ کی طرف نالیاں نکال دی ہیں اور یوں ہر پیڑ تک پانی پہنچ جاتا ہے۔ کیا میں گھڑے اور ڈونی کے ذریعے تمام پیڑوں کی آبیاری کر سکتا

تھا؟ حمام میرے نزدیک پہاڑ سے بہنے والا یہ چشمہ ہے اور تمہارا شاور اور ٹب گھڑا اور ڈوئی۔ نہیں، رسول! یہ کھلونے بچوں کے شاعر نورالدین یوسفوف کےلئے ہی رہنے دو! میں نے سنا ہے کہ وہ کسی کٹھ پتلی کے ڈرامے کا منظرنامہ لکھ رہا ہے، تم اپنا شاور اور ٹب اسکی کٹھ پتلیوں کے حوالے کردو۔''

''اس وقت آپ حمام سے لوٹ رہے ہیں۔ غالباً ایک پیالی چائے پینے میں آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا''، میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کہا۔

''واللہ، چائے کا خیال برا تو نہیں، لیکن اگر شوربہ مل جائے تو کیا کہنا، اور خدا کی قسم شراب تو اور بھی اچھی رہےگی۔ مگر بھئی غسل کے بعد سب سے اچھی چیز ہے تھوڑی سی خالص وودکا۔''

''کچھ شوربہ تو ہے، مگر کل کا ہے۔ ابھی تو صبح ہوئی ہے، آج کے لئے شوربہ تیار نہیں ہو پایا ہے۔''

''اچھا تو شروعات باسی شوربے سے ہی ہو جائے، جب تک ہم اسے ختم کرینگے، آج کا شوربہ بھی تیار ہوجائےگا۔''

ادھر فروسیا میز پر سامان لانے میں مشغول تھی، ادھر میں ابوطالب کو شراب کا ذخیرہ دکھانے لگا، جو بیرونی شرابوں پر مشتمل تھا۔ میں مختلف ملکوں سے رم، برانڈی، جن، وھسکی، کالوادوس اور افسینتنی شراب، ورساؤتھ اور سلیووتسی نیز ھنگری کی یونیکم... وغیرہ کی رنگارنگ بوتلیں ساتھ لایا تھا۔ برانڈی بھی طرح طرح کی تھی، مارٹینی، کاسں اور پلسکا۔

''ابوطالب! آپ کےلئے کون سی بوتل نکالی جائے؟''

''رسول! یہ ساری واھیات چیزیں میرے سامنے سے ھٹا لو! اگر واقعی تم میری خاطر کرنا چاھتے ھو تو مجھے معمولی قسم کی وودکا کا ایک گلاس دیدو۔ وودکا محض اس لئے اچھی نہیں رہےگی کہ ھم اس سے پوری طرح واقف ھیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ بھی ھمیں اچھی طرح جانتی ہے۔ اب تک جو کچھ تم نے دکھایا، ھو سکتا ہے، وہ ساری شرابیں اچھی ھوں، لیکن یہ ساری بوتلیں دوردراز ملکوں سے آئی ھیں اور ایسی زبانیں بولتی ھیں جن سے میں واقف نہیں، اور میں جو زبان بولتا ھوں اس سے یہ بوتلیں

نامانوس ہیں۔ اور یہی حال ہماری مختلف عادتوں اور کردار کا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو قطعی نہیں جانتے۔ تمہاری یہ بوتلیں اجنبی مہمانوں کی طرح ہیں، جن سے اچھی طرح واقف ہونے کےلئے سب سے پہلے تو ایسی زبان چاہئے جو ہم دونوں کو آتی ہو، پھر کچھ اور قربت اور بےتکلفی چاہئے تب جاکر کہیں ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط قائم ہو سکتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ ان بوتلوں کے ساتھ یہ رشتہ قائم ہو سکےگا۔ تم انہیں اپنے دوست ماسکو کے ادیبوں کےلئے محفوظ رکھو۔ ان لوگوں کےلئے چھوڑ دو جو گھر کے چولہے پر ماں کے ہاتھوں تیار ہونےوالے کھانے کا مزہ بھول گئے ہوں۔ ،،

مشکل یہ تھی کہ میرے اس ذخیرے میں ووڈکا کی ایک بوتل بھی نہ تھی۔ میں نے کچھ ایسا ظاہر کیا جیسے میں فوراً بازار جاکر ووڈکا لانے کے لئے تیار ہوں، ساتھ ساتھ یہ امید بھی تھی کہ ابوطالب مجھے جانے نہیں دینگے کیونکہ بارش بھی ہورہی تھی اور سرد ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔ پھر گھر میں شراب کی بوتلیں بھری ہوئی تھیں اور یقیناً یہ ایک بےتکی بات تھی کہ جب بہترین فرانسیسی برانڈی کی بوتلیں سامنے ہوں تو ووڈکا کی فرمائش کی جائے۔

اور ابوطالب نے مجھے روکنے کی کوشش بھی کی۔

''رسول! کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کہ بال پک جانے کے باوجود تم ابھی تک جوان ہو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ تم خود جاؤ؟ کیا کوئی ایسا آدمی بازار نہیں بھیجا جا سکتا جو تم سے کم عمر ہو؟ ایسا کرو کہ باہر نکل کر پڑوسی کے لڑکے سے یہ درخواست کرو کہ وہ بازار جاکر ووڈکا لےآئے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے، میں اسکی واپسی تک انتظار کرسکتا ہوں۔ ،،

میں نے ابوطالب کی بات مان لی۔ پڑوسی لڑکے کو کچھ پیسے دئے اور وہ دکان کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس درمیان ابوطالب نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کردیا۔

''مجھے تمہارے گھر میں پہاڑی علاقے سے آیا ہوا کوئی مہمان نظر نہیں آرہا ہے۔ کیا یہاں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے؟،،

''نہیں، آج تو نہیں ہے۔ ''

''جب تمہارے والد اور میرے دوست حمزہ زندہ تھے تو یہاں ہمیشہ لوگ ٹھہرا کرتے تھے۔ مہمان بڑے اچھے ہوتے ہیں — ان کے پاس ہمیشہ تمباکو کا ذخیرہ موجود رہتا ہے۔ ''

''سگریٹ پینی ہو تو میں آپ کی خدمت میں لاتعداد سگریٹیں اور سگار پیش کر سکتا ہوں،، میں نے ایک دراز سے سگار کیس نکالتے ہوئے کہا جس میں طرح طرح کے سگار اور سگریٹیں بھری ہوئی تھیں۔

''تم اپنی یہ سفید نلکیاں اپنے پاس ہی رکھو۔ ماسکو میں لوگ ان کو پیتے ہونگے، میرے لئے یہ بیکار ہیں، مجھے تو تم اپنا پہاڑی قسم کا تیز تمباکو دے دو ورنہ مجھے اپنی ہی تھیلی نکالنی پڑےگی ''۔

ابوطالب نے اندر کی کسی جیب سے ایک بڑی سی تھیلی نکالی، اسے کھولا اور اس کی تہہ سے بچا کھچا تمباکو نکالا پھر انہوں نے بڑی مہارت سے سگریٹ تیار کی اور لب لگا کر اسکو تر کیا۔

'' کہاں یہ سگریٹ اور کہاں وہ تمہاری صاف ستھری ننھی منی نلکیاں، ہے کوئی مقابلہ ان کا؟ میری سگریٹ کی اپنی شخصیت ہے، روئے زمین پر یہ اپنا ثانی نہیں رکھتیں جب کہ تمہاری جیسی ہزارہا سگریٹیں مل جائینگی۔ تمہیں بتاؤ، ڈبیہ سے بنی بنائی سگریٹ نکال کر پینے میں زیادہ مزہ ہے یا اپنے لئے اس جیسی شاندار سگریٹ تیار کرنے میں؟ میں تو سگریٹ پینے کا لطف اسی وقت سے لینا شروع کر دیتا ہوں جب وہ تیاری کے مراحل سے گذر رہی ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو اس لطف سے محروم رکھنے سے کیا فائدہ؟''

میں نے سوئٹزرلینڈ یا بلجیم کا بنا لائٹر جلایا، لیکن ابوطالب نے میرا ھاتھ ہٹا دیا۔ انہوں نے اپنی ایک جیب سے لوہے کا ایک ٹکڑا، چقماق اور سن کی ایک لڑی نکلی۔ سن کی لڑی کا ایک سرا چقماق پر رکھا اور لوہے کے ٹکڑے سے اس پر ضرب لگائی، چنگاری سی پیدا ہوئی اور سن کی لڑی نے آگ پکڑلی، انہوں نے ہوا میں اسے ذرا دیر لہرایا، شعلہ بھڑک اٹھا جس سے

اپنی سگریٹ جلائی اور سن میری ناک کے قریب لہراتے ہوئے بولے :
''اسے سونگھو! کیسی خوشبو آرہی ہے، ہے نا؟ اور تمہارے لائٹر سے کیسی بو آتی ہے؟،،
کچھ دیر کےلئے ابوطالب دھویں کے بادل میں ڈوب گئے، پھر اس بادل سے ابھرتے ہوئے بولے :
''رسول! مجھے ایک بات بتاؤ، تمہارے بال اتنی جلدی پک کیسے گئے؟،،
''میں تو نہیں جانتا۔،،
''لیکن مجھے اپنے بڑھاپے کا سبب معلوم ہے۔ ،،
''تو بتائیے نا۔،،
''میرے بال اس لئے پک گئے کہ مجھے ہمیشہ بہت دیر تک ان نو عمر لڑکوں کا انتظار کرنا پڑا ہے جنہیں وودکا لانے کےلئے بازار بھیجا گیا تھا۔ رسول بات یہ ہے کہ بچے اس وقت تک والدین کے احساسات نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ وہ خود والدین نہیں بن جاتے۔ اور میری طرح کے لوگ تو یہ توقع بھی نہیں رکھتے کہ انہیں وہ لوگ سمجھ سکینگے جو خود شراب نہیں پیتے۔ وودکا منگانی ہو تو بازار کسی ایسے آدمی کو بھیجو جو خود بھی شراب کا مزہ لےچکا ہو، ایسی صورت میں کبھی تاخیر نہیں ہوگی۔ ،،
اس درمیان فروسیا نے میز پر کھانے پینے کی چیزیں سجادی تھیں اور تھوڑی دیر کے بعد وودکا کی ایک بوتل بھی میز پر لاکر رکھ دی گئی۔
''اھاھا،، ابوطالب نے کہا۔ ''یہ تو سرخ کے پنچائتی فارم کے اس صدر کی طرح ہے جو اچانک پنچائتی کسانوں کے درمیان آدھمکتا ہے۔ ،، انہوں نے وودکا کی بوتل اٹھا لی اور اسے اس طرح پیار کرنے لگے جیسے وہ کوئی معصوم بچہ ہو۔ ''ھائے ھائے، کتنی خوبصورت بوتل ہے، مجھے یقین ہے کہ جو لڑکا یہ بوتل لایا ہے بڑا ہوکر بہت اچھا انسان نکلے گا۔ ،،
اس کے بعد ابوطالب نے ان جاموں پر نظر ڈالی جو میز پر قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس طرح منھ بنایا جیسے کوئی کڑوی چیز کھالی ہو یا دانت میں درد ہونے لگا ہو۔ انہوں نے

اپنے سامنے رکھا ہوا جام اٹھا لیا، اسے الٹاپلٹا اور پھر اس کے اندر جھانکنے لگے۔ میرے خیال میں اس وقت ان کا جی یہ چاہ رہا تھا کہ اس چھوٹے سے جام میں اپنی سگریٹ بھر دیں اور یوں اپنے اس جذبہ تحقیر کا اظہار کریں جو ان کے دل میں مچل رہا تھا۔

میں نے شراب پینے کا ایک بڑا سا سینگ ابوطالب کے آگے بڑھا دیا جو مجھے جارجیا سے تحفے میں ملا تھا۔

معمر شاعر نے خاصی دیر تک اسکا جائزہ لیا اور پھر ان الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا:

''یہ سینگ بہت اچھا ہے لیکن اگر اس پر چاندی کی لیس نہ لگی ہوتی تو اسکی خوبصورتی دوچند ہوجاتی۔ اس سینگ پر چاندی ویسے ہی ہے جیسے کسی دولھا پر پٹکا ہو۔ آخر اسکی ضرورت بھی کیا تھی؟ کیا چاندی کی وجہ سے ووڈکا کا مزہ بہتر ہو جائے گا یا اس میں کچھ زیادہ تیزی پیدا ہوجائے گی؟ نہیں رسول! یہ نہیں چلے گا۔ مجھے تو تم کوئی معمولی سا گلاس لا دو ویسا گلاس جیسا میں زندگی بھر استعمال کرتا رہا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس طرح کے گلاس میں شراب کے کتنے گھونٹ ہوتے ہیں، اور کب شراب‌نوشی روک دینی چاہئے اور کب تک اسے جاری رکھنا چاہئے۔،،

میں نے ابوطالب کی یہ خواہش بھی پوری کردی۔ انہوں نے گلاس میں شراب بھری، روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس میں ڈالا اور پھر دارغین زبان میں بولے:

''درخاب،، پھر انہوں نے شراب کا گلاس خالی کر دیا اور اطمینان کی سانس لیکر بولے: ''شراب پینے سے پہلے ہمیشہ ''درخاب،، کہنا چاہئے۔ اس لفظ کے معنی کیا ہیں یہ بتانا تو یقیناً مشکل ہے، ہو سکتا ہے اس لفظ کے معنی ہی نہ ہوں۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ جب آپ ''درخاب،، کہتے ہیں تو آپ کی مراد کیا ہوتی ہے۔،،

گلاس خالی کرنے کے بعد ابوطالب نے اسے ایک طرف رکھا شوربے کی پلیٹ اپنے قریب کھینچی، گوشت کی بوٹیاں الگ کیں اور انہیں ایک دوسری طشتری میں جمع کر دیا، اور روٹی کے

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے شوربے میں حل کرنے لگے۔ وہ آہستہ آہستہ کھا رہے تھے، کھانے کا لطف لیتے ہوئے۔ وہ گرم اور خوشبودار شوربہ چمچے میں بھر کر چٹخارہ لیتے ہوئے حلق کے نیچے اتار رہے تھے۔ وقتاًفوقتاً وہ اتنے ہی مزے میں بوٹی کا ایک چھوٹاسا ٹکڑا کاٹتے اور اپنے منھ میں ڈال لیتے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر انہوں نے گوشت کھانے کا کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہوتا یا اپنی جیبی چھری کے علاوہ کوئی اور چھری استعمال کی ہوتی تو انہیں اس وقت جو مزہ مل رہا تھا اسکا آدھا مزہ بھی مل پاتا۔

گوشت اور شوربہ ختم ہوگیا تو ابوطالب نے میز پر بکھرے ہوئے روٹی کے تمام ٹکڑے جمع کئے اور انہیں بھی منھ میں بھر لیا، پھر انہوں نے تھوڑی سی ووڈکا پی اور اپنی مونچھیں صاف کیں۔

''کیا اب آپ چائے پینا پسند کرینگے؟،،

''کھانے کے بعد میں جو چیز پینا پسند کرتا ہوں وہ ہے مزید تمباکو۔ اچھا رسول! مجھے ایک بات تو بتاؤ، اگر تم سے پوچھا جائے کہ سگریٹ کی وہ کونسی خصوصیت ہے جو اسے دوسری چیزوں سے الگ کرتی ہے، تو تم کیا جواب دوگے؟،،

''میں اسکا جواب نہیں دے سکتا۔،،

''بات یہ ہے کہ دوسری چیزوں کو آپ جتنا کھینچئے وہ بڑھتی جاتی ہیں، جب کہ سگریٹ ہر کش پر گھٹتی جاتی ہے۔،، انہوں نے اپنے اس سیدھےسادے معصوم لطیفے پر خوش ہوکر قہقہہ لگایا۔

''ابوطالب! آپ بہت زیادہ سگریٹ پیتے ہیں۔ کیا یہ آپ کی صحت کے لئے مضر نہیں؟،،

''لوگوں کا کہنا ہے کہ خود دیوتا بھی پیٹ بھر کر کھانے کے بعد سگریٹ پیتے ہیں۔،،

خیر انہوں نے اپنی سگریٹ ختم کی اور پھر اچانک پوچھ بیٹھے۔

''ادیبوں کی یونین کے بورڈ کی اگلی میٹنگ کب ہے؟،،

''کل۔،،

''کیا تمہیں کچھ معلوم ہے کہ ادیبوں کے امدادی فنڈ

کے لئے زین الدین نے جو درخواست دی ہے وہ کل زیر غور آئے گی یا نہیں؟،،

''نہیں، میں نہیں جانتا۔ لیکن اس سے آپ کو کیا سروکار؟،،

''میں تمہیں ایک سبق آموز کہانی سناؤں۔ میں لڑکپن میں بچھڑے چراتا تھا۔ بچھڑے بڑے سیدھے تھے، انھوں نے کبھی مجھے پریشان نہیں کیا۔ میں مزے سے سبزے پر لیٹا دھوپ سینکتا رہتا اور میرے قریب ہی بچھڑے چرا کرتے۔ ہر شخص مطمئن اور مسرور تھا، میں، بچھڑے اور ان کا مالک۔ اتنے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک بچھڑا ذرا شریر قسم کا تھا، اچانک وہ ایک ایسے راستے پر چل نکلا جو جئی کے ایک کھیت کو جاتا تھا۔ دوسروں نے بھی اسکی پیروی کی۔ اور میری مطمئن زندگی کا وہ آخری دن ثابت ہوا۔ اب میرے لئے بچھڑوں کو جئی کے کھیت سے دور رکھنا مشکل تھا۔ میں اب انہیں چھوڑ کر ایک قدم بھی آگے نہیں جا سکتا تھا۔ ادبی فنڈ اور ہمارے شاعروں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ جب تک انہوں نے ادبی فنڈ کی بات نہیں سنی تھی وہ سکون کی زندگی گذارتے تھے اور کتابیں لکھا کرتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس سلسلے میں پہل کس نے کی مگر اب یہ معلوم ہے کہ ہر ایک کا رخ ادبی فنڈ کی طرف ہے بالکل میرے بچھڑوں کی طرح جو چھوٹتے ہی جئی کے کھیت کی طرف دوڑتے تھے۔ اب وہ ادبی فنڈ کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں اپنی نظموں کے بارے میں کم۔ صبح ہوتی ہے تو وہ نظم لکھنے کے بجائے یہ درخواست لکھنے بیٹھ جاتے ہیں کہ انہیں ادبی فنڈ سے مدد دی جائے۔ اور اب بھئی، میں بھی ایک ایسی ہی درخواست لکھنا چاہتا ہوں۔،،

''ابوطالب! آپ درخواست کیوں لکھینگے، اسکی کیا ضرورت پڑ گئی؟،،

''تم تو جانتے ہی ہو کہ میرے جسم کو کبھی کسی ڈاکٹر نے ہاتھ نہیں لگایا، اب میں کسی صحت گاہ میں کچھ دن گذارنا چاہتا ہوں۔،،

''اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو سمجھ لیجئے کہ صحت گاہ میں آپکی جگہ محفوظ ہو گئی ہے اور ٹکٹ آپکی جیب میں پہنچ

چکا ہے۔ البتہ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ادیبوں کی یونین کے بجائے آپ کا داغستان کی اعلی سوویت کے پاس درخواست بھیجنا زیادہ بہتر نہ رہےگا؟ کیونکہ بہرحال آپ اعلی سوویت کی مجلس‌صدارت کے رکن ہیں، اور حکومت کی طرف سے قائم صحت گھر ادیبوں کے اپنے صحت گھر کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے۔ ''

ابوطالب نے سر ہلایا اور زبان سے تت تت کی آواز نکالی، ان کے منھ سے نکلنے والی یہ آواز مختلف اوقات میں مختلف جذبات کی ترجمانی کرتی ہے، کبھی خوشی اور کبھی بےبسی و مایوسی کی، کبھی استعجاب کی اور کبھی نفی کی، اور اس وقت تو یہ آواز انکار کی ہی ترجمان تھی۔

''نہیں رسول! پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اعلی سوویت کا رکن چار سال کےلئے چنا گیا ہوں جب کہ ادیب میں ساری زندگی رہا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کمزوریاں اور خامیاں تو دونوں ہی طرح کے صحت گھروں میں ہونگی۔ اب تم ہی بتاؤ کہ تمہیں اور خاپالائیف کو تنقید کا نشانہ بنانا آسان ہے یا اعلی سوویت کو؟''

''ٹھیک ہے۔ آپ درخواست مجھے دیدیجئے۔ کل ہی فیصلہ ہو جائےگا۔ ''

''میری درخواست تو مرزا لکھینگے کیونکہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی درخواست نہیں لکھی ہے اور تم لوگ ٹکٹ وغیرہ کا سارا بندوبست کر لینا۔ '' یہ کہتے ہوئے ابوطالب اٹھ کھڑے ہوئے گویا جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

''ابوطالب! اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میرا ارادہ یہ ہے کہ ذرا اشاعت گھر ہوتا جاؤں۔ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ میری نئی کتاب چھپ گئی ہے، میں دیکھنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ ہے کیا بیٹا یا بیٹی۔ ''

''آج شام کو ٹیچرز کالج میں ہم نے ادیبوں اور طالب‌علموں کی باہمی ملاقات کا اہتمام کیا ہے۔ اگر موقع ہو تو آپ بھی آجائیے!''

''اچھی بات ہے، میں آؤنگا، کیا میں اپنا زورنا بھی ساتھ لاؤں؟''

''ابوطالب، آپ زورنا بجانے والے موسیقار نہیں ھیں، آپ شاعر ھیں - اپنی شاعری کا کوئی مجموعہ اپنے ساتھ لائیےگا۔ ،،

''اچھا تو پھر شام کو ملاقات ھوگی،، یہ کہتے ھوئے ابوطالب رخصت ھوئے۔

عورتوں کے ٹیچرز کالج میں ادبی نشست سات بجے شروع ھونےوالی تھی - اس وقت تک داغستان کی متعدد قومیتوں سے تعلق رکھنےوالے شاعر اسٹیج پر جمع ھو چکے تھے - میں نے چاروں طرف نظر ڈالی مگر ابوطالب کہیں نظر نہ آئے، اب ان کے بغیر ھی جلسے کی کارروائی شروع کرنی پڑی - یکے بعد دیگرے شعرا' اپنی اپنی زبانوں میں اپنی نظمیں سناتے رھے، کسی نے لاک زبان میں شعر سنائے، کسی نے کومیک میں، کسی نے لیزغین زبان میں اور کسی نے آوار زبان میں - پھر ایسا ھوا کہ ایک نوجوان شاعر اپنی نظم سنا رھا تھا کہ درمیان میں ھی ھال فلک شگاف تالیوں سے گونج اٹھا - ابوطالب غفوروف ھال میں داخل ھو چکے تھے اور لڑکیاں پرجوش تالیوں سے ان کا استقبال کر رھی تھیں -

مزید دو شعرا' کے بعد میں نے ابوطالب کو اشارہ کیا کہ اب انکی باری آنےوالی ھے، وہ تیار ھوجائیں - اب وہ ذرا سنجیدگی کے ساتھ بیٹھ گئے گویا تصویر کھنچوانے جا رھے ھوں، اور اپنی مونچھیں اینٹھنے لگے - ان کے انداز سے ایسا لگ رھا تھا جیسے وہ کہہ رھے ھوں: ''لو ! دیکھو ! میں تیار ھورھا ھوں!،،

ابوطالب نے لڑکیوں سے کبھی روسی زبان میں، کبھی آوار زبان میں اور کبھی لاک زبان میں گفتگو کی کیونکہ وہ داغستان میں بولی جانےوالی ساری ھی زبانوں میں شدبد رکھتے ھیں - پھر انھوں نے لاک زبان میں دو نظمیں سنائیں -

اپنے پروگرام کا وہ حصہ جسے ادبی کہا جا سکتا ھے، انھوں نے اس طرح پیش کیا جیسے بہت جلدی میں ھوں یا اصل تخلیق کی پیشکش سے پہلے کوئی دیباچہ یا تمہید سنا رھا ھو - چنانچہ نظموں کے خاتمے پر جب تالیوں سے ھال گونجنے لگا تو انھوں نے رک جانے کا اشارہ کیا اور پھر حاضرین سے پوچھا:

''کیا آپ لوگ پسند کرینگے کہ میں زورنا پر کوئی دھن بجاؤں؟،،

''ضرور، ضرور،، لڑکیوں نے شور مچایا۔

وہ اٹھے اور اپنا زورنا اور بانسری اسٹیج کے پیچھے سے اٹھا لائے اور بڑے سکون کے ساتھ یکے بعد دیگرے ساز سر پیدا کرنے لگے۔ ہر شخص سمجھ گیا کہ وہ سازوں کو آزما رہے ھیں، اپنی آواز ٹھیک کر رہے ھیں۔ پھر جب انہیں اسکا یقین آگیا کہ سارے ساز پوری طرح درست ھیں تو ابوطالب نے ھاتھ بڑھا کر میز سے پانی کا گلاس اٹھایا اور اپنے زورنا میں پانی بھر دیا۔

''خود پانی پینے سے پہلے گھوڑے کو پانی پلا دو،، پہاڑی علاقے کے باشندوں کی کہاوت ہے۔ اسی طرح پہاڑی زورنا بجانےوالے کہتے ھیں کہ ''خود پانی پینے سے پہلے اپنے زورنا کی پیاس بجھا دو!،،

پھر ابوطالب نے زورنا بجانا شروع کیا، وہ کبھی زورنا ایک طرف موڑتے تو کبھی دوسری طرف۔ ھال بھر لڑکیوں کے سامنے ابوطالب نے اپنی مہارت کی پوری آب و تاب پیش کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس رات ابوطالب کے زورنا کی گونج پورے مخاچ قلعہ میں ھو رہی ھو۔

زورنا بجانے کے بعد وہ شہ‌نشین پر اپنی جگہ آ بیٹھے اور بڑی سادگی کے ساتھ مجھ سے پوچھنے لگے:

''کیا میں نے زورنا اچھی طرح نہیں بجایا؟،،

''بہت اچھی طرح۔،،

''پھر تمہاری تالیوں میں سردمہری سی کیوں تھی؟ آؤ، دوبارہ تالیاں بجاؤ!،،

ان کی اس بات پر ھال میں قہقہوں کا طوفان اٹھ کھڑا ھوا۔

بات بھی یہی تھی کہ اسٹیج سکریٹری کے فرائض ادا کرنے کی وجہ سے مجھے یہ کچھ زیادہ اچھا نہیں لگا تھا کہ ابوطالب جیسا اچھا شاعر زورنا بجانےوالے کے روپ میں سامنے آئے۔ یہ تو ایسا ھی تھا جیسے روسی شاعر ایسینن اپنی نظمیں سنانے کے بجائے اسٹیج پر آ کر ناچنے لگیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایسینن کو ناچنا نہیں آتا تھا، لیکن ھر بات کا ایک مقام اور محل ھوتا

ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے اسی احساس نے میرے چہرے پر ایک ناگوار تاثر پیدا کردیا تھا اور اسی لئے میری تالیوں میں رسمی انداز پیدا ہوگیا تھا جس کی وجہ سے ابوطالب نے مجھے وہ پھٹکار سنائی جو حاضرین کے لئے قہقہوں کا باعث بن گئی ۔

لڑکیوں کے گھیرے میں ہم نے چوڑے زینے طے کئے اور نیچے آکر اس کمرے میں چلے گئے جہاں ہمارا سامان رکھا ہوا تھا ۔ میں نے اپنا کوٹ پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر کوٹ کی شکنیں درست کیں ۔ ان دنوں کوٹوں میں اونچے چوڑے اور ایسے کاندھے بنانے کا رواج تھا جس کے اندر روئی کے موٹے ٹکڑے استر کے طور پر لگائے جاتے تھے، میرا کوٹ اس معیار پر پورا اترتا تھا ۔ ابوطالب نے مجھے دیکھا اور سر ہلایا :

''ہم لوگ اپنے شانے صحت‌بخش اور چرب‌دار غذاؤں کے ذریعے دنبے کی چرب‌دار دم کا گوشت کھاکر چوڑے کیا کرتے تھے، لیکن اب روئی بھر کر انہیں چوڑا بنایا جاتا ہے ۔ ہم اپنے گیت کمز کی دھن کے ساتھ گایا کرتے تھے اور اب ہم کاغذ کے صفحے پر لکھ کر اپنی نظمیں سناتے ہیں ۔ دنیا میں زبردست تبدیلیاں آگئی ہیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ تبدیلیاں پسند ہیں ۔''

''اچھا ابوطالب! یہ بتائیے کہ آپ کو اتنی دیر کیوں ہوگئی؟''

''میں کپڑے پہن چکا تھا اور گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ آوار تھیٹر کا ایک اداکار بھاگتا ہوا میرے پاس پہنچا...''

''آوار تھیٹر سے آپ کا کیا تعلق؟''

''بھائی بات یہ ہے کہ ڈرامے میں شادی کا ایک سین تھا (اور آج کل شادی کے سین کے بغیر تو کوئی ڈرامہ مکمل ہی نہیں سمجھا جاتا) اور زورنا بجانے والے اداکار صاحب بیمار پڑ گئے ۔ بھلا ایسی بھی کوئی شادی ہو سکتی ہے جس میں زورنا نہ بجے؟ چنانچہ وہ لوگ میرے پاس آئے کہ میں ہی خانہ‌پری کر دوں ۔ زورنا کو صرف ۱۰ منٹ بجنا تھا، پھر بھی کچھ وقت تھیٹر پہنچنے میں لگا، پھر ہمیں شادی کے سین کا انتظار کرنا پڑا ۔ میں نے ان کے سامنے زورنا پر دو گانے گائے، جنہیں حاضرین نے اسقدر

پسند کیا کہ وہ ڈرامے کو بھول گئے، انکی ساری توجہ کا مرکز میں بن گیا۔ اگر میں رات‌بھر زورنا بجاتا رہتا تو لوگ اسی طرح بیٹھے سنا کرتے۔ ،،

''اگر میں ابوطالب غفوروف ہوتا، مشہور شاعر اور اپنی جمہوریہ کی اعلی سوویت کی مجلس صدارت کا رکن تو میں تو زورنا بجانےوالے کی حیثیت سے کبھی اسٹیج پر نہ آتا۔ ،،

''ابوطالب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے۔ ،،

''اچھا یہ بتائیے کہ آپ اشاعت گھر گئے تھے؟ آپ کی کتاب کا کیا رہا؟،،

''خدا کا شکر ہے کہ کتاب چھپ گئی ہے، خدا کا یہ بھی شکر ہے کہ مجھے ایک معمولی سی رقم بھی مل گئی جس سے میں نے اپنے قرضے ادا کرکے خدا کا شکر ادا کیا اور ایک قاز بھی خرید لی۔ ،،

''کیا آپ اس خوشی میں کوئی چھوٹی موٹی ماگاریچ (یعنی پارٹی) کا اہتمام کرنے جا رہے ہیں؟،،

''کس کےلئے؟،،

''ایڈیٹر، مصور اور محاسب کے لئے، ان تمام لوگوں کےلئے جو آپکی کتاب کی اشاعت میں شریک رہے ہیں۔ ،،

''ایڈیٹر کو دعوت،، ابوطالب غصے میں جامے سے باہر ہوگئے ''اس کے لئے ''ماگاریچ،، کا نہیں ''موگوروچ،، کا اہتمام ہونا چاہئے۔ ،،

آوار زبان میں موگوروچ کے معنی ہیں مار مار کے بھرکس نکال دینا۔ ابوطالب نے اپنے اس فقرے کی تراش‌خراش پر قہقہہ لگایا، اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''سنو رسول! لوگ کہتے ہیں کہ اگر کسی داغستانی نے اپنے بچے کے ختنے کی اجازت دی تو اسے ملازمت سے برطرف کیا جا سکتا ہے اور یہی نہیں پارٹی کی رکنیت سے بھی نکالا جا سکتا ہے۔ آخر یہ لوگ ان مدیروں کے ساتھ یہی برتاؤ کیوں نہیں کرتے جو میری نظموں میں کانٹ‌چھانٹ کرتے ہیں اور انکی صورت مسخ کر دیتے ہیں؟ کتاب کی ادارت کا طریقہ دیکھ کر ہی میں

بتا سکتا ھوں کہ جن صاحب نے اسکی ادارت کے فرائض انجام دئے ھیں وہ کس گاؤں کے رھنےوالے ھیں۔ لاک قوم کے ھر گاؤں کی بولی الگ ھے اور مدیر اس بات کی کوشش کرتا ھے کہ میری نظموں کا ترجمہ اس بولی میں کرے جو اس کے گاؤں میں رائج ھے،، یہ کہہ کر ابوطالب کچھ خاموش ھوگئے، پھر انھوں نے مسکراھٹ کے ساتھ اپنی بات شروع کی: ''البتہ وہ عورت جو معاھدوں پر دستخط لیتی ھے بڑی اچھی ھے۔ اوہ کتنی اچھی۔ وہ واحد شخصیت تھی جس کا میں نے شکریہ ادا کیا۔ ،،

''آپ نے شکریئے کے علاوہ بھی کچھ کہا؟ کیا آپ نے اپنی عقیدت کے اظہار کےلئے کوئی تحفہ بھی اسے پیش کیا؟،،

''میں نے اس سے کہا کہ اگر تمہارے یہاں کوئی برتن گھس گیا ھو، اس میں چھید ھوگیا ھو یا داغ دھبے پڑ گئے ھوں تو مجھے دیدو میں اسے ٹھیک کرنے میں خوشی محسوس کرونگا، تمہارے پرانے برتن کو بالکل نیا کردوں گا۔ ،،

مجھے انکی یہ بات اور بھی زیادہ بری لگی، آوار تھیٹر میں زورنا بجانےوالے کے روپ میں ان کی اداکاری سے بھی زیادہ بری۔ اسی درمیان مجھے ایک چاردیواری کے پاس تانبے کے ٹکڑوں کا ایک انبار سا دکھائی دے گیا، میں نے اس معمر بزرگ پر طنز کے تیر چلائے:

''پرانے زمانے میں جب آپ برتنوں کی مرمت کیا کرتے تھے، اس وقت اگر تانبے کے ٹکڑوں کا یہ انبار نظر آجاتا تو آپ نے اسے کبھی نہ چھوڑا ھوتا، ھے نا درست بات؟ آپ اسے فوراً تھیلے میں لے کر گھر چل دئے ھوتے؟،،

''نہیں، مجھے اسکا موقع ھی نہ مل پاتا،، انھوں نے بڑی خوش‌مزاجی کے ساتھ جواب دیا ''مجھ سے پہلے ھی کوئی اور اسے لے کر چمپت ھوچکا ھوتا۔ ،،

راستے میں ھماری ملاقات ایک اور صاحب سے ھوئی وہ بھی ھماری طرح رات کے سناٹے میں پیدل ھی کہیں جا رھے تھے۔ ابوطالب نے انھیں کسی پس و پیش کے بغیر روکا، ان سے تھوڑا سا تمباکو مانگا اور پھر ماچس لے کر سگریٹ پینے لگے۔

مجھے ابوطالب کی یہ ساری حرکتیں پسند نہ آئیں۔ داغستان کا عوامی شاعر، ایک ایسا آدمی جسے اسکی جمہوریہ کا بچہ بچہ جانتا ہے، حکومت کا رکن ہے اور حرکتیں یہ ہیں کہ کبھی کسی تھیٹر میں زورنا بجانے والے کے روپ میں اسٹیج پر آتا ہے، کبھی برتنوں کی مرمت کرنے والے کی حیثیت سے ہمارے اشاعت گھر کی سکریٹری کو اپنی خدمات پیش کر رہا ہے تو کبھی مخاچ قلعہ میں رات گئے سڑک پر چلتے ہوئے ایک راہ گیر کو روک کر اس سے تمباکو مانگ رہا ہے۔ لیکن اس معمر بزرگ سے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ میں سوچنے لگا کہیں وہ ناراض نہ ہو جائیں۔ میں نے اپنے دل کا بخار دوسری طرح نکالا:

''ابوطالب! اب آپ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ کیا آپ کی صحت کے لئے یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ سگریٹ چھوڑ دیں؟''

''شروعات تو اچھی ہے۔ آج سگریٹ پینی چھوڑ دو، کل حکم ہوگا کہ برتنوں کی مرمت ترک کر دو اور پرسوں کہا جائے گا کہ زورنا بجانا چھوڑ دو۔ اور آخرکار مجھے شاعری بھی ترک کرنی پڑے گی۔ میری نظمیں خود مجھے چھوڑ دینگی۔ وہ مجھے اس ابوطالب کے طور پر جانتی ہیں جو برتنوں کی مرمت کرتا ہے، سگریٹ پیتا ہے اور زورنا بجاتا ہے اور اسی ابوطالب سے محبت کرتی ہیں۔ کسی اور ابوطالب سے انہیں کیا غرض؟ میں ابوطالب غفوروف ہوں، رسول حمزاتوف نہیں جو نہ سگریٹ پینا پسند کرتا ہے اور نہ ہی برتن ٹھیک کر سکتا ہے، بس وہ اتنا ہی جانتا ہے کہ ادیبوں کی یونین کا کام کس طرح چلایا جائے۔ ہاں، نہ میں یوسف خاپالانیف ہوں نہ نورالدین یوسفوف، نہ میکسم گورکی اور نہ ہی زوشچنکو...''

یہ وہ زمانہ تھا جب زوشچنکو نشانۂ ملامت بنا ہوا تھا چنانچہ ابوطالب کو بھی یہ نام یاد رہ گیا تھا۔

''ارنے بھینسے پہاڑوں کے علاوہ کہاں چھپ سکتے ہیں؟ پہاڑ سے اترنے والے چشمے گھاٹی کے علاوہ کہاں بہہ سکتے ہیں؟ اگر تم کسی اور کی ٹوپی میرے سر پر نہ رکھو تو میں تمہارا مشکور ہونگا۔ اور ہاں، براہ مہربانی میرے ماضی کا مذاق اڑانے کی کوشش نہ کرو۔ ہاں، میں زورنا بھی بجایا کرتا تھا، چرواہا

بھی تھا اور برتنوں کی مرمت کا کام بھی کیا کرتا تھا۔ تو کیا میں اپنے ماضی پر شرمندہ ہوں؟ میرا ماضی میرے، یعنی ابوطالب کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ رسول! میری بات غور سے سنو اور گرہ میں باندھ لو: اگر تم ماضی کو پستول کا نشانہ بناؤ گے تو مستقبل تمہیں توپ کا نشانہ بنائے گا۔ میں نے کئی بیویوں کو طلاق دی ہے، اور میری کئی بیویوں نے مجھے چھوڑا ہے۔ لیکن جس کام کو میں انجام دینا جانتا ہوں، نہ وہ مجھے چھوڑ سکتا ہے اور نہ میں اسے۔"

ہاں بزرگ شاعر اور ابا کے دوست ابوطالب اسی طرح کے آدمی تھے۔ ان کی فطرت کی تعمیر اسی نہج پر ہوئی تھی اور انہیں اسی طرح قبول کیا جانا چاہئے۔ اگر وہ ذرا بھی مختلف ہوتے تو نہ تو وہ ابوطالب ہوتے اور نہ شاعر۔

اور اب میں آپ کو ایک اور کہانی سنانا چاہتا ہوں جو ابوطالب ہی سے متعلق ہے، یہ ہے ابوطالب کے نئے مکان کی کہانی۔

ابوطالب کا نیا مکان۔ میں اسی زمانے میں داغستانی ادیبوں کی یونین کے بورڈ کا نیا نیا صدر چنا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا عہدہ ہے جس میں مراعات تو بہت ہوتی ہیں لیکن ذمہ داریاں بہت کم۔ اگر میں اپنی مصروفیت کا کوئی پہلو نہ نکالوں تو بڑے مزے میں پہلے ہی کی طرح اطمینان و سکون کے ساتھ نظمیں لکھ سکتا ہوں۔ لیکن اس وقت تک میری طبیعت میں جوش و خروش کا مادہ تھا اور میں مصروفیتیں تلاش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ میں نے اس عہدے سے متعلق ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ اگر کسی مکان کی پائیداری اور استواری کا اندازہ لگانا ہو تو سب سے پہلے شہتیروں، کونے پر لگے ستونوں اور ان تمام چیزوں کا جائزہ لینا چاہئے جو سہارے کا کام دیتی ہیں۔ میں نے بھی اسی جذبے کے تحت ادھر ادھر نظر ڈالی اور محسوس کیا کہ داغستانی ادیبوں کی یونین کے ستون کی حیثیت ان چار عوامی شاعروں کو حاصل ہے جو داغستان کی

چار قومیتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ ہیں لیزغین شاعر خریوگ کے طاہر، کومیک شاعر علی قاضیئف، آوار شاعر زاهد خواجیئف اور لاک شاعر ابوطالب غفوروف۔ اس فیصلہ کے بعد میں نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ان چار معمر شاعروں کی ملاقات داغستانی حکومت کے کسی رکن سے کرائی جائے تو بڑا اچھا رہیگا۔ یہ شعرا' حکومت کو اپنی ضروریات سے آگاہ کر سکینگے اور ادھر حکومت انہیں اپنی خواهشوں اور توقعات سے باخبر کر سکیگی۔

چنانچہ ہمارے خطے کی پارٹی کمیٹی کے سکریٹری عبدالرحمان دانیالوف کے ساتھ بات‌چیت کا اهتمام ہوا۔ گفتگو چائے کی میز پر غیررسمی ماحول میں ہوئی جس میں ہر ایک نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا۔ شعرا' اس ملاقات سے بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے متفقہ طور پر ادیبوں کی یونین کے نئے صدر رسول حمزاتوف پر تحسین و ستائش کے پھول برسائے۔ ادھر کامریڈ دانیالوف بھی جنہیں عوامی شاعروں سے مل کر بڑا مزہ آرہا تھا دل ہی دل میں رسول کی دوراندیشی کے معترف تھے اور میں پوری گفتگو کے دوران یوں بیٹھا رہا گویا ان باتوں کا مجھ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

بات‌چیت کے دوران داغستان، وهاں کی زندگی اور شاعری کا بھی ذکر آیا۔ ملاقات ختم ہونے کو آئی تو پارٹی سکریٹری نے ہر شاعر سے یہ دریافت کیا کہ اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بتائیں۔ سب سے پہلے خریوگ کے طاہر نے بات شروع کی:

''کامریڈ دانیالوف! مجھے بےحد تشویش ہے۔ جب زوروں کی سردی پڑتی ہے تو ہماری چراگاہوں میں بھیڑیں اسکی نذر ہو جاتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گرمیوں میں لوگوں کی ایک بھاری جمعیت بھیجی جائے جو چارے کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر سکے کہ جاڑے بھر بھیڑوں کو خوراک کی قلت نہ ہو؟،،

کامریڈ دانیالوف نے بزرگ شاعر کے خیالات اپنی ڈائری میں نوٹ کر لئے اور پھر دریافت کیا۔

''کوئی اور بات؟،،

''کیا آپ خریوگ گاؤں کے پنچائتی فارم کے لئے ایک گاڑی فراہم کر سکتے ہیں؟''

اس کے بعد علی قاضیئف کی باری آئی۔ انہوں نے اپنا منھ کھولا اور سکریٹری کے ساتھ ہم سب کو اپنے کرم‌خوردہ اور گرتے ہوئے دانت دکھائے۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مجھے نئے دانت مل جائیں کیونکہ ان دانتوں سے میں کوئی چیز چبا نہیں سکتا۔ پھر ایک پوپلے آدمی کے لئے گانا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ میں جب نظم پڑھنے کھڑا ہوتا ہوں تو سی سی کی آواز ہی نکل پاتی ہے۔''

قاضیئف نے اسی وقت پوپلے منھ سے نظم سنانے میں پیش آنےوالی قباحت کا عملی مظاہرہ بھی کر دیا۔ انہوں نے اس موقع کے لئے ایک منظوم درخواست کا انتخاب کیا جو انہوں نے خاصاویورت کی شہری انتظامیہ کمیٹی کے صدر کے نام بھیجی تھی اور جس میں بڑے درد بھرے انداز میں بزرگ شاعر نے یہ درخواست کی تھی کہ گھر کو گرم رکھنے کے لئے اسے کچھ کوئلہ فراہم کیا جائے۔

''تو کیا ہوا، کوئلے کا انتظام ہو گیا؟'' دانیالوف نے سوال کیا۔

''جی نہیں! گزشتہ سال سے آج تک اس پر غور ہی ہو رہا ہے۔''

سکریٹری نے ایک بار پھر اپنی ڈائری میں کچھ اندراجات کئے، اس بیچ ہم زاھد خواجیئف کے بولنے کا انتظار کرتے رہے۔

''ان دنوں نئے گلوکار گانے کے بجائے چیختے چلاتے اور اودھم مچاتے ہیں اور اپنی ان حرکتوں کی بدولت خوبصورت عوامی گیتوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ نئے گانے ایسے ہیں کہ گلوکار چاہیں یا نہ چاہیں چیخے چلائے بنا کام نہیں چلتا۔ ہمیں اس صورت حال کی روک‌تھام کرنی چاہئے۔ ریڈیو پر زیادہ تر گانے محبت کے بارے میں نشر کئے جاتے ہیں۔ اور بعض گانوں میں تو پرانے قصوں کہانیوں کی حوروں کے گن تک گائے جاتے ہیں۔ کامریڈ دانیالوف! آپ گلوکاروں سے کہہ دیجئے کہ حوروں کے گن گان کے بجائے کھیتوں اور فارموں میں کام کرنےوالے محنتی هیرووؤں کی ستائش وتحسین کو اپنا موضوع بنائیں۔''

اپنی بات ختم کرنے کے بعد خواجیئف نے مجھ سے سرگوشی کی:

''ایک بات اور ہے۔ مجھے خبر ملی ہے کہ کل شاہ‌تمانوف اور سلیمانوف ایک ریستوراں میں شراب پی رہے تھے۔ ادیبوں کو شراب پینے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر میں تم سے خاص طور پر گفتگو کرنی چاہتا ہوں۔ ،،

اور اب ابوطالب کی باری تھی۔

''عزیز عبدالرحمان!،، ابوطالب نے اول سکریٹری کو مخاطب کیا۔ میری نئی بیوی کے بطن سے ایک بیٹے نے جنم لیا ہے۔ ،،

''کیا، نئی بیوی؟ میں نے آپ کی بات ٹھیک سنی ہے نا؟،،

''جی ہاں! میں کئی بیویاں کر چکا ہوں۔ اور اس میں میرا قصور بھی کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ اخبارات میں میری تصویریں شائع ہوتی ہیں۔ ریڈیو پر میرا ذکر ہوتا ہے، مجھے داغستان کا عوامی شاعر کہا جاتا ہے، اور ساری دنیا یہ سب کچھ سنتی ہے۔ میں پارلیمنٹ کا ممبر ہوں، مجھے بہت سارے سرکاری اعزاز مل چکے ہیں۔ سادہ‌لوح عورتوں کے لئے چارہ بہت کافی ہے۔ وہ اپنی حماقت میں یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ جو آدمی اتنا مشہور ہو اسکے پاس یقیناً ایک محل ہوگا، اس کے صندوق بیش‌قیمت چیزوں سے مالامال ہوں‌گے اور روپئے کی گڈیوں سے اس کی تجوریاں بھری ہونگی۔ یہ سوچ کر وہ مجھ سے شادی کر لیتی ہیں۔ اور یہاں ان کا سابقہ غریب ابوطالب سے پڑتا ہے جس کا مکان کال کوٹھری جیسا ہے۔ انہیں یہ بات پسند نہیں آتی اور اس لئے مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کئی شادیاں کر چکا ہوں اور ہر بار یہی ہوتا رہا ہے۔ اور پیارے عبدالرحمان حقیقت بھی یہی ہے کہ میں رہتا ہوں تہہ‌خانے کی کال کوٹھری میں جبکہ میرے گیت بلبل کی نغمہ‌سنجیوں کی طرح آسمان کی وسعتوں میں گونجتے ہیں۔ ہاں، میں اپنے اسی گھٹیا سے تہہ‌خانے میں بیٹھ کر الوہی نغموں کو جنم دیتا ہوں۔ لیکن بیویاں تو یہ نہیں سمجھتیں چنانچہ اب میری نئی بیوی بھی جس نے مجھے ایک بیٹے کا باپ بنایا ہے، مجھے چھوڑ دینے کی دھمکی

دے رہی ہے - اس کا کہنا ہے کہ اگر میرے لئے نئے فلیٹ کا انتظام جلد ازجلد نہ ہوا تو نہ صرف یہ کہ وہ مجھے چھوڑ دیگی بلکہ میرے بیٹے کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گی - عبدالرحمان! ابھی اس نے مجھے چھوڑا نہیں ہے - اور اگر اس نے مجھے چھوڑ دیا تو میں یہ صدمہ برداشت نہ کرپاؤنگا براہ کرم میرے چھوٹے سے خاندان کو تباہی سے بچا لو اور مجھے کوئی ایسی جگہ دیدو جہاں میں چولہا جلا سکوں اور کھانا پکا سکوں - میری عمر ستر سے اوپر ہو چکی ہے، میں ڈوبتا ہوا آفتاب ہوں چڑھتا ہوا سورج نہیں - میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے مکان مل گیا تو میں تمہاری دعوت کرونگا !،،

ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ابوطالب کو ان کے نئے مکان کی کنجی پکڑا دی گئی - اور یوں وہ اپنی کال کوٹھری سے رخصت ہوکر شاہراہ پشکن کے ایک نئے مکان کی تیسری منزل پر تین کمروں والے فلیٹ میں آ گئے -

ایک دن سڑک پر ابوطالب مجھے نظر آ گئے - انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا، مگر میری طرف بڑھنے کے بجائے وہ لوہے کے ٹکڑوں کے انبار میں کچھ تلاش کرنے لگے -

''آداب عرض ہے! کہئے ابوطالب، نئے مکان میں زندگی کیسی گزر رہی ہے، پسند آیا یہ فلیٹ آپ کو؟،،

''پچھلے کئی دنوں سے میں کسی ایسی گھنٹی کی تلاش میں تھا جسے لاکر گھر کے قریب لٹکا کر بجاتا اور یہ خبر دیتا کہ سدا گاؤں کے حمزہ کا بیٹا اب مجھ سے ملنے میرے گھر آ سکتا ہے - اس دوران تین بار میں نے سمندر کی جانب کھلنےوالی کھڑکیاں کھول کر اس امید میں زورنا کی دھنیں چھیڑیں کہ شاید وہ میری آواز سن لے اور اس پر لبیک کہے - اب مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس غرض کے لئے مجھے کوئی بڑا سا گھنٹہ لانا پڑیگا، میں نے اسی امید میں گھنٹے کی تلاش جاری رکھی ہے -،،

ہم فوراً ہی ابوطالب کے نئے گھر کی طرف چل پڑے - گھر میں داخل ہوئے تو ہمیں ننگی دیواروں کے سوا کچھ نظر نہ آیا - کمروں کے فرش پر ابوطالب کا سارا اثاثہ بکھرا ہوا تھا، یہ وہ سارا سامان تھا جو ابوطالب اپنی کال کوٹھری سے ساتھ لائے تھے -

ان کا پرانا زورنا، کمز، دھونکنیاں (خدا جانے اس نئے مکان میں ان کی کیا ضرورت تھی)، تیل کے چولھے، ڈول، مٹی کی صراحیاں اور گوڑے، جوتے اور بھیڑ کی کھال والا ایک کوٹ سب چیزیں پورے فلیٹ میں بکھری ہوئی تھیں۔ جب بوڑھے لوگ پہاڑی علاقوں سے اپنے پرانے تھیلے لئے کسی کام سے شہر آتے تو ان کے میزبان ابوطالب ان کے خالی تھیلے اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا کرتے تھے:

''کمبخت تھیلہ تو خالی کیوں ہے؟ اگر تو کسی بھاری چیز سے مثلاً میمنے وغیرہ سے بھرا ہوتا تو میرے مہمان کا کام جلدازجلد ہو جاتا۔ میرے دوست کو کتنی بار چانخ پہاڑی پار کرنے کی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے اور محض اس لئے کہ تو خالی ہوتا ہے۔''

اور اب ابوطالب اپنے خالی تھیلے پر غصہ اتار رہے تھے اور ان کی نگاہیں کمرے میں چاروں طرف کسی ایسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں جس پر مجھے بٹھا سکیں۔ جب انہیں ایسی کوئی چیز نہ ملی تو انہوں نے ایک بڑی سی چھری میرے ہاتھوں میں تھمائی اور کھڑکی کھول کر صحن میں بنے ایک دربے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اس دربے میں قاز ہے، جاؤ اسے ذبح کرو۔ اس وقت ہم اسی کو کھائینگے۔''

میں نے دربے کا دروازہ کھولا اور تھوڑی سی جد و جہد کے بعد قاز پکڑ لی۔ قاز میرے ہاتھوں میں بری طرح تڑپ رہی تھی لیکن میں نے اپنا کام شروع کردیا۔ اوپر سے ابوطالب نے چیخ کر کہا:

''کہیں قاز کی گردن پر اس طرح بھی چھری پھیری جاتی ہے؟ اس کا رخ دوسری جانب کرو۔ تمہیں معلوم نہیں مکہ کدھر ہے؟''

بہر حال میں نے اپنے اس کام کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے لیا، اتنی خوبی کے ساتھ کہ ابوطالب کو بھی تعریف پر مجبور ہونا پڑا۔

ابوطالب نے جیسا کہ ہمارے اطراف میں کہا جاتا ہے، ''پتیلے پر زین کسی'' اور کافی دیر تک تیار ہونے والے کھانے

کی دیکھ بھال میں مشغول رہے۔ میں اس درمیان میں فلیٹ کا جائزہ لیتا رہا۔ اگرچہ معمر شاعر اپنا تہہ‌خانہ چھوڑ کر نئے مکان میں آگیا تھا مگر وہ پرانے برتن سے لے کر اپنی پرانی عادتوں تک، تہہ خانے کی پوری زندگی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ پورے مکان میں نہ ایک کرسی نظر آئی، نہ کوئی میز، نہ کوئی الماری، نہ ہی کوئی پلنگ۔ فرنیچر نام کی کسی چیز کا وھاں کوئی وجود ہی نہ تھا۔

''ابوطالب! آپ کہاں بیٹھ کر نظمیں لکھتے ھیں؟،، میں نے پوچھا۔

''ان کمروں میں ابھی تک میں نے کوئی قابل ذکر نظم نہیں لکھی ھے۔ شروع شروع میں مجھے کچھ لکھنا ھوتا تو اسی تہہ‌خانےوالے مکان میں چلا جاتا مگر اب اسے ایک مصور کو دے دیا گیا ھے اور اس نے وھاں اپنا نگارخانہ بنا لیا ھے۔ خدا گواہ ھے کہ مجھے یہاں نیند بھی اس سکون کے ساتھ نہیں آتی جیسی وھاں آتی تھی۔ وھاں میں کم پیسے خرچ کرتا تھا اور مجھے وقت زیادہ ملتا تھا۔ لوگ میری فکر بھی اتنی نہیں کیا کرتے تھے۔ تہہ‌خانے میں مجھ سے ملنے کبھی کبھار ھی کوئی آتا تھا۔ یہ سچ ھے کہ وھاں سے مجھے سمندر نظر نہ آتا اور اب سمندر ھر وقت بوڑھے ابوطالب کے سامنے انگڑائی لیا کرتا ھے۔،،

پھر ان کی نگاھیں ٹھاٹھیں مارتے کیسپین پر خاصی دیر تک جمی رھیں جسکی سطح پر طوفانی موجیں لگاتار نیلے سفید رنگ کے بلبلوں کو وجود میں لانے اور مٹا دینے کے شغل میں مصروف تھیں۔ میں نے مداخلت نہ کی، خاصی دیر تک ھم خاموش کھڑے رھے۔ پھر ابوطالب نے ھی گفتگو شروع کی:

''رسول! آؤ، آج میں تمھیں اپنی زندگی کے دو خاص دنوں کی کہانی سناؤں، یہ ھیں انتہائی خوشی اور انتہائی غم کے دن۔،،

''ضرور، میں ھمہ‌تن گوش ھوں۔،،

''اس میں کوئی شک نہیں رسول کہ میری زندگی میں ایسے بہت سارے دن آئے ھیں جو خوشی کے دن تھے، مسرت کے دن تھے۔ میں اس دن خوش ھوا تھا جب مجھے سرکاری اعزاز سے نوازا گیا تھا، اور وہ دن بھی میرے لئے پرمسرت تھا جس دن مجھے یہ فلیٹ

ملا ۔ مسرت کی ایک لہر اس دن بھی میرے روم روم میں دوڑ گئی تھی جب تیسری دھائی میں سرخ فوج نے مجھے ایک جنگی گھوڑا دیا تھا اور کمپنی کا زورناکار مقرر کیا تھا اور جب میں اپنے گھوڑے پر سوار اپنے کمانڈر کے عین پیچھے جنگ کے مورچوں پر گامزن تھا، تو اس وقت بھی مسرت کی موجیں میرے دل میں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں ۔ لیکن میری پہلی اور سب سے بڑی مسرت کا تعلق ان میں سے کسی واقعے سے نہیں ۔ جب میں ۱۱ سال کا تھا اور بچھڑے چرایا کرتا تھا اس وقت میرے ابا نے میرے لئے جوتے خریدے ۔ یہ زندگی میں پہلی بار میرے لئے خریدے گئے تھے اور ان نئے جوتوں کو دیکھ کر مجھے جس فخرو انبساط کا احساس ھوتا تھا اس کے اظہار سے میری زبان قاصر ھے ۔ کل جہاں یخ بستہ نکیلی چٹانوں پر ننگے پیر چلنے کی وجہ سے میرے پیر چھل جاتے تھے، وھاں اب میں بڑی جرأت کے ساتھ ان گھاٹیوں میں اور پگڈنڈیوں پر چل سکتا تھا ۔ اب میں بڑے اعتماد کے ساتھ ان ھی چٹانوں پر چلتا، نہ مجھے سردی کا احساس ھوتا اور نہ ھی درد کا ۔ لیکن اس احساس مسرت کے ٹھیک تین دن بعد میری زندگی کا انتہائی غمناک لمحہ بھی میری دنیا میں گھس آیا ۔ چوتھے دن ابا نے مجھے بلا کر کہا :

''ابوطالب! اب تمہارے پاس پائیدار جوتے بھی ھو گئے ھیں، تمہارے ھاتھ میں چھڑی بھی ھے اور زندگی کے گیارہ برسوں کا تجربہ بھی ۔ اب وقت آگیا ھے کہ تم دنیا میں باھر قدم نکالو اور اپنے کھانے اور پہننے کا انتظام کرو !،،

ابا نے مجھے گاؤں گاؤں گھومنے اور بھیک مانگنے کا حکم دیا ۔ مجھے اس وقت جو روحانی اذیت پہنچی تھی، اور میرے دل پر جو چوٹ لگی تھی ویسی چوٹ سے زندگی میں مجھے کبھی دوچار نہیں ھونا پڑا ۔ میں نے بعد میں بھی آنسو بہائے ھیں، لیکن اس وقت کے آنسوؤں میں جو تلخی تھی، اس کی یاد اب بھی آتی ھے تو رونگٹے کھڑے ھو جاتے ھیں ۔

ایک ادیب ھیں جنہوں نے یہ فرمایا ھے کہ اب دیکھنا یہ ھے کہ ابوطالب اس نئے مکان میں رہ کر کس طرح کی نظمیں لکھتا ھے ۔ گویا کوئی شاعر کس قسم کی نظمیں لکھتا ھے اس کا

انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس طرح کے مکان میں رہتا ہے۔ شاعر خود اپنی نظموں کا گھر ہوتا ہے۔ یہ شاعر کا دل ہے جس میں اس کی شاعری رہتی بستی ہے۔ میری زندگی کے سارے پر مسرت اور اندوہناک لمحات میری ذات میں، میرے وجود میں رہتے ہیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ ،،

ابوطالب کے گھر سے لوٹا تو میں بےحد اداس تھا۔ میں نے اس صورتحال سے داغستانی حکومت کے رہنماؤں کو مطلع کیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ان کی کتاب ''ابابیلیں جنوب کو اڑ رہی ہیں،، کی رائلٹی سے کچھ رقم نکال کر ان کے نئے مکان کے لئے بےحد نفیس قسم کا فرنیچر خرید لیا جائے۔ اس کام کے لئے تین آدمیوں پر مشتمل ایک ''کارکن دستہ،، بنایا گیا جس میں کتابوں کی داغستانی اشاعت گھر کے منتظم ڈائرکٹر اور داغستان کے وزیرتجارت کے ساتھ میرا نام بھی شامل تھا۔ ہمیں یہ کام سونپا گیا کہ جو بھی سامان ضروری ہو ، اسے خرید کر ان کے نئے مکان میں پہنچا دیں۔ میری ذمہ‌داری یہ تھی کہ اس سلسلے میں خود بزرگ شاعر سے جو گفتگو کرنی ہو، میں کروں اور یوں اپنے دستے اور شاعر کے درمیان رابطے کا وسیلہ بنوں۔

ہم تینوں نے مخاچ‌قلعہ کے گوداموں کا چکر لگایا اور اس طرح ہم نے ایک خواب گہ کے لئے (تاکہ ہمارا عوامی شاعر سکون کی نیند سوسکے)، ایک لکھنے پڑھنے کے کمرے کے لئے (تاکہ وہ خوبصورت نظمیں لکھتے رہیں) اور ایک کمرۂطعام کے لئے (تاکہ وہ اچھی طرح کھا پی سکیں) سارا ضروری سامان خریدا۔

ہم نے سوچا تھا کہ یہ سارا سازوسامان پانے اور ان سے اپنے نئے مکان کے کمرے مزین کر چکنے کے بعد ابوطالب ممنونیت کے بےپناہ احساس کے ساتھ ہمارے پاس دوڑے ہوئے آئینگے۔ لیکن جب کئی دنوں تک کوئی خبر نہ ملی، شکرئیے کے دوبول تو دور رہے ، فرنیچر پہنچنے کی رسید بھی موصول نہ ہوئی تو ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ابوطالب کے گھر چلیں اور دیکھیں کہ انہوں نے فرنیچر کا کیا حشر کیا۔

ہمیں دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرۂ طعام میں لگی ہوئی میز کے بغل میں فرش پر بچھے ہوئے قالین پر ابوطالب اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ لوگ کھانے کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے اور ان کے سامنے اخبار کے ورق تھے جن پر کھانا رکھا ہوا تھا۔ ابوطالب ایک طشتری سے مٹھا پی رہے تھے اور بغل میں رکھی چمکتی ہوئی کھانے کی میز کو اس طرح گھور رہے تھے جیسے وہ کھانے کی میز نہیں کوئی ایسی دوشیزہ ہو جو ان سے محبت کی بھیک مانگ رہی ہو لیکن وہ اسے منھ لگانے کے لئے تیار نہ ہوں۔

دوسرے کمرے میں ایک خوبصورت میز رکھی تھی، جس پر بڑی نفاست کے ساتھ سادہ کاغذ، قلم اور قلمدان رکھے تھے۔ یہ ساری ہی چیزیں یوں لگ رہی تھیں جیسے میوزیم میں رکھا ہوا سامان ہو اور ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا گیا ہو۔ کمرے کے دوسرے کونے میں فرش پر کچھ کاغذات بکھرے ہوئے تھے جن پر عربی رسم الخط میں کچھ تحریر بھی نظر آ رہی تھی۔

''ابوطالب! وہ کیا ہے؟ کیا آپ جدید رسم الخط سے مانوس نہیں ہیں کہ اس کا استعمال کر سکیں؟،،

''میں واقف بھی ہوں اور مانوس بھی، لیکن پرانے رسم الخط میں لکھنا میری عادت بن چکا ہے۔ میں پہلے اپنے مصرعے عربی رسم الخط میں لکھتا ہوں، پھر ایڈیٹر کی سہولت کے لئے انہیں دوبارہ جدید رسم الخط میں، یا یوں کہوں کہ اپنے ہی کلام کا ترجمہ کرتا ہوں۔،،

''اس پلنگ پر سونے کی تو انہوں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی،، ان کی بیوی نے بتایا ''آپ لوگوں نے خوامخواہ اتنا قیمتی فرنیچر خریدنے کی زحمت مول لی۔،،

''پلنگ میں کیا دھرا ہے؟ جب میں شہر میں رہنے کے لئے پہلی بار آیا تھا تو تکیہ کی جگہ ایک پتھر سر کے نیچے رکھ لیتا اور مزے کی نیند سوتا۔ پتھر سر کے نیچے رکھ کر سونے کی عادت بہت پرانی ہے، میں اسی زمانے سے اس کا عادی ہوں جب میں بھیڑیں چرایا کرتا تھا۔،،

''میرے خیال میں آپ کو اس فرنیچر کا کوئی خیال نہیں جو ہم نے آپ کے لئے خریدا ہے میز، کرسیاں، الماری وغیرہ؟،،

''نہیں یہ ساری چیزیں بہت اچھی ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ یہ چیزیں میرے پڑوسی گوٹ‌فرید حسانوف کے لئے زیادہ موزوں رہتیں۔ ،،

''کیا گوٹ‌فرید حسانوف کو آپ ایک اچھا پڑوسی نہیں سمجھتے؟،،

''وہ اچھے آدمی ہونگے، لیکن ہم دونوں کے درمیان گہرے تعلقات نہیں قائم ہو سکتے!،،

''کیوں نہیں؟،،

''بات یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ مہذب ہیں۔ مجھ میں ضرورت سے زیادہ گنوارپن ہے اور ان میں ضرورت سے زیادہ شہریت۔ میری طبیعت پر پہاڑوں کا اثر غالب ہے، اور ان کے مزاج پر میدانوں کا اثر۔ ہماری ٹوپیاں مختلف ہیں اور غالباً ہمارے ذہن بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ میں اپنی زمین کی پیداوار ہوں اور وہ اپنے پیشے کی۔ نہ وہ میری زورنا اور اس کی دھنیں برداشت کر سکتے ہیں نہ میں ان کا پیانو اور سیمفنی۔ میں ان کی موسیقی سے لطف لینا چاہتا ہوں، مگر مجھے مزہ ہی نہیں ملتا۔ اور یہی حال ان کا بھی ہے۔ میں جیسے ہی زورنا بجانا شروع کرتا ہوں وہ دروازے پر دستک دیتے ہیں: ''ابوطالب میں کام نہیں کر پا رہا ہوں،،۔ میں بہانہ کرتا ہوں کہ زورنا میں نے نہیں بجایا بلکہ ریڈیو نشر کر رہا ہے اور کئی بار ہوا بھی یہی کہ انہوں نے جب دروازے پر دستک دی تو زورنا کی آواز ریڈیو ہی سے آ رہی تھی۔ لیکن وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ میں نہ صرف زورنا بجانا چھوڑ دوں بلکہ ریڈیو پر زورنا سننا بھی بند کر دوں۔ مختصراً یہ کہ ہم دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا دو آدمیوں میں ہو سکتا ہے۔ میرے مہمان دیہاتوں اور پہاڑی علاقوں سے آتے ہیں جن کے ہاتھوں میں دیہاتی تھیلے ہوتے ہیں اور ان کے مہمان ماسکو سے آتے ہیں بریف کیس لئے ہوئے۔ میں اپنے مہمانوں کے سامنے پینے کے لئے دیسی بوزا اور کھانے کے لئے لہسن پڑی خنکالی پیش کرتا ہوں اور وہ برانڈی اور کافی۔

میں بازار جاتا ہوں اور وہ شاپ سے خریداری کرتے ہیں۔ جب میں سوتا ہوں تو وہ لکھتے ہیں اور جب ان کے سونے کا وقت ہوتا ہے تو میرے لکھنے کا۔ انہیں وہ پھول پسند ہیں جو شہروں میں باغ کے تختوں پر کھلتے ہیں اور میں پہاڑ کی وادیوں کو گلزار بنا دینےوالی گھاس سے عشق کرتا ہوں۔ دوستو! وہ اس وقت اپنی ترتیب دی ہوئی کوئی سیمفنی بجا رہے ہیں۔ ''

ابوطالب کے پڑوسی گوت‌فرید حسانوف سے ہم سب بخوبی واقف تھے جو داغستان اور روسی وفاق کے مستند اور معزز فنکار ہیں۔ اس وقت وہ کوئی پیانو کنسرٹ تیار کر رہے تھے۔ میں ان کی ولولہ‌انگیز دھن سننے لگا جو میرے لئے باعث مسرت تھی۔ ساتھ‌ہی‌ساتھ میرے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ ''اگر ہم ان دو عظیم اور ممتاز صلاحیتوں کو، ابوطالب کی سیدھی‌سادی صلاحیت اور حسانوف کی پیشہ‌ورانہ اور تربیت‌یافتہ صلاحیت کو آپس میں جوڑ سکیں تو اس سے نغموں کا جو مجموعہ تیار ہوگا وہ کتنا شاندار ہوگا۔ ''

میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر میری نظموں اور میری کتابوں میں یہ دو سوتے یعنی میری قوم کا معصوم اور بےتصنع کردار، اس کی فراخ‌دلی اور سادہ فطرت نیز پیشہ‌ور فنکاروں کی تربیت‌یافتہ اور تراشیدہ ہنرمندی ایک دوسرے میں جذب ہو جائیں تو یہ کارنامہ کتنا عظیم ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری نظمیں ابوطالب اور گوت‌فرید کا سنگم بن جائیں۔ میری خواہش ہے کہ میرے فن میں یہ دونوں اچھے پڑوسیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ رہیں، اس طرح نہیں جیسے وہ دونوں حقیقی دنیا میں ہیں۔

جی ہاں! میں ان دونوں سوتوں کے اتصال کی تمنا کرتا ہوں۔ لیکن اگر یہ تمنا ناقابل‌تکمیل نظر آئے اور مجھے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو میں سمجھتا ہوں کہ میں بہر حال پہاڑی چشموں کے ٹھنڈے اور بلور کی طرح پاک و صاف پانی کو نفیس ترین مہذب مشروب پر ترجیح دونگا۔ آپ جو چاہیں کہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کلچر، تہذیب اور پیشہ‌ورانہ ہنرمندی کی اگر کمی ہو تو یہ ساری چیزیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ نادر چیز جسے ہم قومی یا عوامی احساس

کہتے ہیں، انسان میں پیدائشی ہوتا ہے اور اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ زورنا بجانے والا عوامی شاعر ابوطالب ہو سکتا تھا کہ مختلف حالات میں ایک پیشہ‌ور اور تربیت یافتہ موسیقار یا موسیقی کا جنم‌داتا بن جاتا لیکن گوت‌فرید کبھی بھی ایک عوامی مطرب نہیں بن سکتا تھا۔

پھر جب ہم رخصت ہونے لگے تو ابوطالب نے کہا:

''رسول! کیا تم میرے یہاں ٹیلی‌فون نہیں لگوا سکتے؟''

''آپ کو ٹیلی‌فون کی کیا ضرورت ہے، جبکہ آپ میز اور پلنگ تک استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں؟''

''بات یہ ہے کہ میں ٹیلی‌فون پر زورنا بجاؤنگا، کبھی اس کی دھن ماسکو میں نکولائی تیخونوف کو سناؤنگا اور کبھی اپنے پنچائتی فارم کے صدر کو۔ اگر میں زورنا کی دھن نہ سنا سکوں تو پنچائتی فارم کے صدر کو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ میں زندہ ہوں اور اپنے زورنا پر آج بھی پرانی دھنیں بجا سکتا ہوں؟ جب وہ ٹیلی‌فون پر زورنا کی آواز سنینگے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرے اس شہری مکان میں بھی پہاڑوں کی آواز اور بوباس زندہ ہے۔''

''ابوطالب! آپ فکر نہ کریں، آپ کی دھنیں جن میں پہاڑوں کی بوباس بھری ہوئی ہے، ٹیلی‌فون کی مدد کے بغیر بھی ماسکو پہنچ جاتی ہیں۔ انہیں آپ کے اپنے گاؤں کے لوگ ہی نہیں، داغستان کے ہر گاؤں کے باشندے بلکہ کرۂ‌ارض کے کونے کونے کے لوگ سنتے ہیں۔ وہ بلند ہیں، اتنی بلند کہ پہاڑوں کی فصیلیں انکی راہ نہیں روک پاتی ہیں۔''

اب میں ابوطالب سے رخصت ہوتا ہوں اور ایک ایسی بات سناتا ہوں جس کا تعلق ابا سے اور میری ذات سے ہے۔

یاد کی ایک جھلک۔ نہ جانے کیوں ہمارا یہ دستور تھا کہ نہ تو کبھی ہم ایک دوسرے کو اپنی نظمیں سناتے اور نہ ہی ان کے بارے میں کبھی گفتگو کرتے۔ ابا کی کسی تازہ

نظم کی اطلاع مجھے یا تو اس وقت ملتی جب وہ چھپ کر میرے سامنے آتیں یا ریڈیو پر سن لیتا، یا پھر ان دوستوں کی زبانی ملتی جو انہیں سن چکے ہوتے۔ اسی طرح ابا کو بھی اس وقت تک میری نئی نظموں کی کوئی خبر نہ ہوتی جب تک وہ شایع نہ ہو جاتیں۔

۱۹۶۹ء کی بات ہے، ایک آوار اخبار میں میری نظم ''میری پیدائش کا سال،، شایع ہوئی۔ ابا نے یقیناً اسے اخبار میں پڑھا، اور بعد میں اخبار کا وہ شمارہ میرے ھاتھ لگا۔ ابا نے میرے مصرعوں پر پنسل سے نشان لگا دئے تھے۔ اور کہیں کہیں اپنے خیالات بھی لکھ دئے تھے۔ مجھے اندازہ ھوا کہ ابا نے نہ صرف یہ کہ میری نظم بڑی توجہ سے پڑھی ہے بلکہ بعض مصرعوں میں ترمیم و تنسیخ بھی کی ہے، جن میں ابا کا اپنا رنگ جھلک رھا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ابا نے انتہائی مرصع مصرعے بدل دئے ھیں، انہیں میرے انتہائی پیچیدہ استعارے پسند نہیں آئے تھے اور نہ ھی شوخ تشبیہات ان کے گلے سے اتر پائی تھیں۔ میرے مصرعوں کے اوپر انہوں نے اپنے قلم سے جو مصرعے لکھے تھے ان میں انہی خیالات کا نسبتاً زیادہ سادگی، صفائی اور کہیں زیادہ بامعنی زبان میں اظہار کیا گیا تھا۔

مجھے آج بھی اس کا افسوس ہے کہ وہ اخبار جس پر انہوں نے اصلاحات کی تھیں، محفوظ نہ رہ سکا۔ یہ میری عادت ہے کہ نظم کے چھپتے ھی اس کے سارے مسودے، جن پر کاٹ‌چھانٹ ھوتی رھتی ہے نذرآتش کر دیتا ھوں، یہ اخبار بھی اسی کے ساتھ تلف ھو گیا۔

ابا نے جو اصلاحات کی تھیں ان کا زیادہ‌تر حصہ مجھے پسند آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان اصلاحوں نے نظم کو زیادہ بہتر بنا دیا ہے، لیکن بعض تبدیلیاں ایسی تھیں جنہیں میں قبول نہ کر سکا۔ اور یہ بات میں نے ان سے کہہ بھی دی:

''اس میں شک نہیں کہ آپ میرے مقابلے میں کہیں زیادہ دوررس اور باصلاحیت ھیں۔ آپ مجھ سے بڑے شاعر ھیں۔ لیکن میں ایک مختلف دور کا شاعر ھوں۔ میرا تعلق ایک مختلف مدرسۂ‌فکر سے ہے، میرا ادبی ذوق بھی مختلف ہے اور اسلوب

بھی ۔ سب کچھ مختلف ہے ۔ آپ نے جو اصلاحیں کی ہیں ان میں ہر شخص حمزہ کے اسلوب‌نگارش کو محسوس کر سکتا ہے ۔ میں حمزہ نہیں، میں صرف رسول ہوں ۔ اس لئے مجھے خود اپنا اسلوب اور خود اپنا انداز اپنانے کی اجازت دیجئے ۔ ،،

''یہ بات تم نے غلط کہی ہے ۔ تمہارے اسلوب اور تمہارے انداز کو، مطلب یہ ہے کہ تمہارے طریقوں اور تمہارے کردار کو تمہاری نظموں میں لازمی طور پر ثانوی حیثیت حاصل ہونی چاہئے ۔ اولین حیثیت کے حقدار تمہاری قوم کے عادات و اطوار اور اس کا کردار ہے ۔ تم سب سے پہلے پہاڑی علاقے کے باشندے اور آوار قوم کے ایک فرد ہو اور اس کے بعد رسول حمزاتوف ۔ تم اپنی نظموں میں اپنی ذات کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہو کہ پہاڑی علاقے کا کوئی باشندہ اس طرح کرنا کبھی پسند نہیں کریگا ۔ اگر تمہاری نظمیں پہاڑی عوام کی فطرت اور روح سے ہم‌آہنگ نہیں، ان کے کردار سے ہم‌آہنگ نہیں تو تمہارا انداز محض مصنوعی ہوکر رہ جائے گا اور تمہاری نظمیں صرف خوبصورت اور غالباً دلچسپ کھلونے بن جائینگی ۔ بادل نہ ہوتے تو پانی کہاں سے برستا؟ آسمان نہ ہوتا تو برف کہاں سے گرتی؟ اگر آوارستان اور آوار قوم نہ ہوتی تو رسول حمزاتوف کہاں پیدا ہوتا؟ ان قوانین کے بغیر جو تمہاری قوم کی ملکیت ہیں اور جو صدیوں تک نشو و نما حاصل کرتے رہے ہیں، تم اپنے قوانین کہاں سے تراشوگے؟،،

جی ہاں! ایک بار میرے اور ابا کے درمیان یہ گفتگو ہوئی تھی ۔ بعد میں جتنے بھی سال گزرے ہیں اور میں نے جتنے بھی راستے اختیار کئے ہیں ان سے اس بات کی توثیق ہو گئی ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا ۔

تیسری بیوی کی کہانی ۔ داغستان کا ایک جوان‌سال شاعر ادارۂادب میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے ماسکو آیا ۔ ایک سال بعد داغستان کے اس طالب‌علم نے اعلان کیا کہ وہ اپنی بیوی کو جو ایک دوردراز پہاڑی گاؤں کی رہنےوالی ہے طلاق دے رہا ہے ۔

"تم کیوں طلاق دے رہے ہو؟"، ہم نے جاننا چاہا۔
"تمہاری شادی کو ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا، پھر تمہیں اپنی بیوی سے محبت بھی تھی۔ آخر کیا بات ہو گئی؟"
"بات یہ ہے کہ ہم دونوں مختلف زبانیں بولنے لگے ہیں۔ وہ شکسپیر کو جانتی ہی نہیں۔ اس نے "ایوگینی اونیگن" کبھی نہیں پڑھا، "لیک اسکول" کا تو نام بھی نہیں سنا اور نہ ہی میریمے کو جانتی ہے۔"

پھر جب یہ جواں‌سال شاعر مخاچ‌قلعہ واپس آیا تو ماسکو سے ایک بیوی بھی ساتھ لایا جو غالباً شکسپیر اور میریمے دونوں ہی سے واقف تھی۔ وہ ایک سال ہمارے شہر میں رہی، مگر پھر اسے ماسکو جانا پڑا کیونکہ اس کا شوہر دوبارہ طلاق کا خواہاں تھا۔

"اب طلاق کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"، ہم نے پوچھا۔ "ابھی تمہاری اس شادی کو زیادہ دن بھی نہیں ہوئے، پھر جہاں تک ہم لوگوں کا خیال ہے تمہیں اپنی بیوی سے محبت بھی تھی۔ پھر آخر ہوا کیا؟"

"معاملہ پھر وہی زبان کا ہے۔ لگتا ہے ہم دونوں کی زبانیں مختلف ہیں۔ وہ آوار کا ایک لفظ بھی نہیں جانتی، ہمارے آوار رسم و رواج سے قطعی نابلد ہے، پہاڑی لوگوں کے کردار کو سمجھتی ہی نہیں جن کے بیچ میں پیدا ہوا تھا اور نہ ہی یہ پسند کرتی ہے کہ پہاڑی لوگ ہمارے یہاں آئیں جائیں۔ اسے نہ تو کوئی آوار کہاوت آتی ہے، نہ پہیلی اور نہ ہی کوئی گیت۔"

"تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"میرے خیال میں مجھے تیسری شادی کرنی پڑیگی۔"

اور میرا کہنا ہے کہ تیسری بیوی ڈھونڈھنے سے پہلے اس نوجوان شاعر کو خود اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنا چاہئے۔

میں چاہتا ہوں کہ میری کتاب کا تعلق آوارستان کے پہاڑوں سے بھی ہو اور شکسپیر کے سانیٹوں سے بھی۔ میں

چاھتا ھوں کہ میری کتاب اس تیسری بیوی کی طرح ھو جسے آج بھی وہ نوجوان شاعر تلاش کر رھا ھے۔

میری نوٹ‌بک سے۔ مخاچ‌قلعہ میں ایک عمارت ادیبوں کے لئے بنائی گئی جس میں چالیس فلیٹ تھے۔ جب فلیٹ الاٹ کئے جانے کا وقت آیا تو یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ھوا کہ تقسیم کی بنیاد کیا ھو۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ادیب کی ادبی حیثیت کو بنیاد بنایا جائے، بعض لوگ اس پر مصر تھے کہ خاندان میں بچوں کی تعداد کا لحاظ رکھا جائے۔

مجھے یہ تسلیم ھے کہ ادیبوں کے درمیان مکان تقسیم کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو نپٹایا گیا۔ ادیبوں کے چالیس خاندان نئے مکانوں میں منتقل ھوئے، اور حسب دستور اس موقع پر جشن منائے گئے۔ ایک دن بعد بیس ادیبوں کی بیویاں گروہ کی صورت میں ماسکو روانہ ھوئیں۔ کئی دنوں بعد وہ تھکی تھکائی واپس آئیں جیسے کسی مورچے سے آ رھی ھوں۔ اور پھر مال گاڑیوں سے ماسکو کا نیا فرنیچر آنے لگا۔

جیسا کہ بعد میں ھمیں پتہ چلا کہ کچھ دنوں تک تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری رھا۔ پھر ان لوگوں نے اپنے نشانے طے کئے۔ ٹھیک اسی وقت ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر فرنیچر خرید لیا۔ دوسری بیبیاں بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں رھنا چاھتی تھیں۔ مصیبت یہ تھی کہ اس نے سب سے قیمتی فرنیچر خرید لیا تھا۔ ماسکو میں اس سے بہتر فرنیچر تھا نہیں۔ چنانچہ نتیجہ یہ ھوا کہ یہ تمام بیسوں مکان اس طرح ایک جیسے ھو گئے جیسے ایک ھی کنگھی کے دانت ھوں، اور ایک بھی مکان ایسا نہیں جسے دیکھ کر یہ لگتا ھو کہ اس میں آوار رھتے ھیں۔

دوسرے مکانات ایسے ھیں جن میں داخل ھوتے ھی خشک گوشت، دیسی مشروب بوزا، بھیڑ اور بھیڑ سے حاصل ھونے والی چکنائی کی مہک آپ کا خیرمقدم کرے گی۔ یہ تو صاف ظاھر ھو جاتا ھے کہ ان مکانوں میں آوار رھتے ھیں، لیکن یہ پتہ نہیں

چلتا کہ یہ ان ادیبوں کے مکانات ہیں جن کو عصر حاضر کی روح اور اس کے اسٹائل کا احساس ہے۔

میں یہ چاہتا ہوں کہ میری کتاب پڑھنے کے بعد لوگ یہ محسوس کریں کہ اس میں آوار رہتے بستے ہیں لیکن پہلے ہی قدم پر یہ احساس بھی دلا دینا چاہتا ہوں کہ یہ مکان عصر حاضر کے ایک فرد کا، بیسویں صدی کے ایک انسان کا مکان ہے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ اس مکان میں سایہ ہی سایہ ہو یا دھوپ ہی دھوپ۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے مکان میں بڑی بڑی کھڑکیاں بھی ہوں جن سے دھوپ آتی ہو اور سایہ‌دار اور آرام‌دہ گوشے بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مکان میں جو بھی آئے وہ سکون اور آرام محسوس کرے اور اتنا کہ یہاں سے جانے کا جی نہ چاہے یا (چونکہ ہم مہمانوں کی بات کر رہے ہیں) جائے تو افسوس اور یہاں دوبارہ آنے کی خواہش کے ساتھ جائے۔

مختلف ملکوں کے نمائندے جاپان آئے ہوئے تھے۔ ایک موقع پر ہم ایک دوسرے کو اپنے تاثرات بتانے لگے۔ اس وقت ہم ایک فوارے کے سامنے کھڑے تھے جو یوں لگتا تھا جیسے داغستانی پتھروں سے بنا ہو، ان ہی پتھروں سے جو اس میدان میں ہیں جہاں ہماری گاؤں پنچائت کا جلسہ ہوتا ہے۔

بات شروع کرتے ہوئے ایک امریکی موسیقار نے کہا: ”یہ عجیب و غریب ملک ہے۔ مجھے تو جاپان میں صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ امریکہ کی جھلک نظر آتی ہے۔“

”لیکن نہیں“، ہائیٹی کے ایک صحافی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی ابھی جاپان کا ایک گاؤں دیکھ کر لوٹا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ جاپان ہمارے چھوٹے سے جزیرے سے سب سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔“

ان دونوں کی باتوں کا برا مانتے ہوئے فرانس کے ایک ماہرفن تعمیر نے کہا۔ ”آپ لوگ جو چاہیں کہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ پیرس کی ساری مسرتیں اور سارے دکھ جاپان میں جمع ہو گئے ہیں۔“

فوارے پر نظریں جمائے ہوئے جس کے پتھر لگتا تھا کسی آوار گاؤں سے لائے گئے ہوں، میں نے دل ہی دل میں کہا:

''جاپان واقعی عجیب و غریب ملک ہے کیوں کہ یہاں وہ ساری چیزیں ملتی ہیں جو دنیا کے دوسرے ملکوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود جاپان کسی دوسرے ملک کی طرح نہیں، وہ جاپان اور صرف جاپان ہے۔''

میری خواہش ہے کہ میری کتاب میں ہر شخص کو اپنی جھلک نظر آئے مگر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ یہ میری کتاب ہو، دوسری کتابوں سے مختلف اور خود اپنے رنگ روپ کی مالک۔ میری کتاب! تو میرا آوار، میرا داغستانی وطن ہے۔ میری خواہش ہے کہ ان تمام چیزوں کے شانہ بہ شانہ جو یہاں صدیوں سے موجود رہی ہیں تجھ میں کچھ ایسی باتیں بھی ہونی چاہئیں جو یہاں پہلے کبھی نظر نہیں آئی ہوں۔

ابا کہا کرتے تھے کہ اگر کسی تحریر میں مصنف کا وجود محسوس نہ ہو تو وہ تحریر کسی سڑک پر دوڑتے ہوئے بے سوار گھوڑے کی طرح ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ پہاڑی علاقے میں کوئی آدمی تھا جس کے صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اسے بیٹے کی بڑی خواہش تھی۔ ہوا یہ کہ بدقسمت باپ کو ہر شخص مشورے دینے لگا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اسے لوگوں نے اتنے مشورے دئے کہ مشوروں کی بھر مار سے وہ اوب گیا اور ایک دن چلا پڑا۔
''خدا کے لئے میری جان بخش دو! تم لوگوں نے مجھے اتنے مشورے دئے ہیں کہ اب میں وہ طریقے بھی بھول گیا جو مجھے خود آتے تھے۔''



کتاب کا ڈھانچہ اور نفس مضمون

ہم پتھر ہیں اور وہ دن زیادہ دور نہیں
جب ہم جڑجائینگے گرجے، زنداں، یا باڑی
کی دیواروں میں۔

(ایک پتھر پر تحریر)

قیمتی پتھر کے جوہر کا انحصار اس پر
ہے کہ وہ جڑا کہاں گیا ہے، اور آدمی
کو سمجھنا ہو تو اسے گھر میں دیکھو۔

شادی تو ہو چکی، اب نئے جوڑے کو اپنا
مکان بنانا ہے۔

میری فکر کے عظیم‌الشان محل، میری قوت تخیل کے ٹھوس ستون، میری کہانیوں کے ایوان اور میری نظموں کے بلند مینارے... میں نے پتھر جمع کر لئے ہیں، عمارتی لکڑیاں تیار کر لی ہیں، ایک نئی عمارت کی تعمیر کے لئے جگہ چن لی ہے۔ اب مجھے اپنے اندر معمار، انجنیر، ریاضی‌داں، راج گیر اور

منصوبہ بنانے والے کی تھوڑی تھوڑی خصوصیات پیدا کرنی ہیں تاکہ میں یہ عمارت بنا سکوں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ میں کس طرح کا ڈھانچہ بناؤنگا؟ میں جو عمارت بنانے جا رہا ہوں اس کی شکل کیا ہوگی، ایسی شکل جو دیدہ‌زیب بھی ہو، خوبصورت اور خوش‌منظر بھی۔ اتنی انوکھی کہ اس سے پہلے کوئی دوسری عمارت ایسی نہ بنی ہو اور پھر بھی جانی پہچانی ہو۔ نہ اس قدر نیچی کہ چھت سر پر گرتی محسوس ہو جیسا کہ ان دنوں بننے والی عمارتوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے اور نہ اتنی بلند کہ دیکھنا چاہیں تو سر کی ٹوپی گر پڑے۔ دروازے نہ اتنے تنگ ہوں کہ معمولی میز اندر لے جانے میں بھی دقت محسوس ہو اور نہ اتنے چوڑے‌چکلے اور بلند کہ اونٹ پر بیٹھ کر ان میں سے گذرا جا سکے۔ اسے نہ تو کوئی گذرگاہ ہونا ہے نہ کوئی کلب جہاں لوگ موسیقی کا کوئی پروگرام سننے آتے ہیں اور پروگرام کے بعد اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، نہ ہی میں کوئی مسجد بنانا چاہتا ہوں جہاں لوگ محض نماز پڑھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ میں ایک ایسی عمارت بنانا چاہتا ہوں جسے کوئی فائلوں، حلف ناموں اور درخواست کے پلندوں سے بھرے ہوئے دفتر کے طور پر استعمال نہ کر سکے اور نہ ہی جس پر علی کی لگاتار چلتی ہوئی ہوا چکی کا گمان کیا جا سکے۔

پہاڑی علاقے کے ایک جواں‌سال شاعر کی نظم پڑھنے کے بعد ابا نے کہا تھا:

''اس نظم کی دیواریں ضرورت سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ یہ تو اس خوبصورت مرغی‌خانے کی طرح ہے جو علیک بید نے بنایا تھا۔ مرغی‌خانے کو مرغی‌خانہ ہی نظر آنا چاہئے محل نہیں، یوں ہی محل کو مرغی‌خانے کے طور پر استعمال نہیں ہونا چاہئے۔''

اس طرح ایک دوسرے ادیب کی ایک ضرورت سے زیادہ لمبی کہانی پڑھنے کے بعد جسے مصنف اختتام تک لانے سے قاصر محسوس ہو رہا تھا، ابا نے اس سے کہا تھا:

''تم نے ایک ایسا دروازہ کھول دیا ہے جسے بند کرنا تمہارے بس میں نہیں۔ تم نے نل کھول دیا ہے، مگر اسے بند نہیں کر

سکتے۔ گرہ باندھنے کے وقت تم نے رسی کو ضرورت سے زیادہ بھگو دیا ہے۔"

مجھے وہ بازاری گویے یاد ہیں جو میرے بچپن میں گاؤں آیا کرتے تھے۔ میں اپنی چھت کے کنارے لیٹ جاتا اور اوپر سے گھنٹوں ان کا گانا سنا کرتا۔ ان میں سے کسی کے پاس طنبورہ ہوتا، کسی کے ہاتھ میں سارنگی یا چونگر، مگر زیادہ‌تر یہ لوگ کمز کی سنگت میں گیت گایا کرتے۔ یہ گویے مختلف جگہوں سے آتے اور مختلف اوقات میں آیا کرتے۔ ان کے گیت بھی مختلف ہوتے اور کبھی وہ کوئی گیت دوسری بار نہ سناتے۔ مجھے سب سے زیادہ مزہ اس وقت آتا جب دو تین گویوں میں مقابلہ شروع ہو جاتا۔

ان کے گیت طویل ہوتے تھے اور میں انہیں بھول چکا ہوں۔ لیکن ہر گیت کے آٹھ، چار یا دو مصرعے مجھے یاد رہ گئے ہیں اور غالباً یہی مصرعے ان گیتوں کی جان تھے، سب سے زیادہ شعریت، دانشمندی اور برجستگی کے حامل، نیز اپنے اپنے اعتبار سے سب سے زیادہ مسرت‌بخش یا سب سے زیادہ اندوہ‌گیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ پورے پورے گیتوں میں یہی مصرعے کیوں میرے ذہن میں محفوظ رہ گئے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مصرعے میری شخصیت پر چھائے ہوئے ہیں، اور بسااوقات میں انہیں بار بار گنگناتا ہوں جیسے یہ میرا کوئی پسندیدہ‌ترین اور بیش‌قیمت‌ترین سرمایہ ہوں، بالکل اسی طرح گنگناتا ہوں جس طرح کوئی عاشق اپنی محبوبہ کے نام کا وظیفہ پڑھتا رہتا ہے۔

مجھے دوسرے آوار گیت بھی شروع سے لے کر آخر تک یاد ہیں، مگر ان میں بعض ایسے مصرعے بھی ہیں جو مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں اور پوری نظم میں سب سے اچھے لگتے ہیں۔

اور گیتوں ہی کی بات کیوں کی جائے؟ خود میری اپنی نظموں میں بھی بعض مصرعے مجھے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پسند ہیں۔ یہ مصرعے مجھے دوسروں سے کہیں زیادہ معنویت اور شعریت نیز قوت اظہار کے مالک محسوس ہوتے ہیں۔ میں تو یہاں تک اعتراف کرنے کے لئے تیار ہوں کہ میں نے بعض طویل

نظمیں محض اس لئے لکھی ھیں کہ ان میں وہ چند مصرعے سموسکوں جو مجھے بےحد پسند آئے تھے۔

یہ چند مصرعے! اگر کسی نظم کو پٹکے سے تشبیہہ دی جا سکے تو یہ مصرعے اس پٹکے سے لٹکا ھوا خنجر قرار پائینگے، اگر کسی نظم کو کھیت کہا جا سکے تو ان مصرعوں کو اناج کی بالیاں کہا جائے گا۔ اگر نظم پرند ھے تو یہ مصرعے اس کے پر ھیں اور اگر نظم پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے کسی ھرن کی طرح ھے تو یہ مصرعے اس ھرن کی وادی میں دور تک دیکھتی ھوئی آنکھیں قرار پائینگے۔

ایک بار میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ اگر کسی نظم میں آٹھ مصرعے ایسے ھیں جو بےحد بیش قیمت ھیں تو مزید ۸۰ مصرعے لکھنے کی کیا ضرورت ھے۔ کیوں نہ نظم کو انھیں آٹھ بہترین مصرعوں تک محدود رکھا جائے؟ یہ وجہ ھے کہ میرا ایک پورا مجموعہ ھے جس میں صرف مثمن نظمیں شامل ھیں۔

پہاڑی علاقوں میں جب کسی کے یہاں کوئی مہمان آتا ھے تو میزبان جوش مسرت میں چھری اٹھاتا ھے اور ایک بچھڑا ذبح کر ڈالتا ھے۔ حالانکہ مہمان کو گوشت کے محض ایک ٹکڑے کی ضرورت ھوتی ھے، کوئی بھی مہمان پورا بچھڑا نہیں کھا سکتا۔

''اگر ایک چوزہ کافی ھے تو پورا بچھڑا ذبح کرنے سے کیا فائدہ؟'' یہ سوال ایک بار میں نے اپنے آپ سے کیا تھا۔

اور اسی لئے میرا ارادہ یہ ھے کہ میں جو کتاب لکھنے جا رھا ھوں اس میں ایک بھی ایسی چیز نہیں آنے دونگا جو فالتو محسوس ھو۔ میں صرف انھی اقتباسات کو باقی رھنے دونگا جو اس وقت بھی مجھے پسند آتے جب کتاب دس، بیس گنا زیادہ ضخیم ھوتی۔

لاک زبان کے ایک نوجوان شاعر نے ایک بار اپنی کچھ نظمیں ابوطالب کو سنائیں۔ دس نظمیں سنانے کے بعد جب وہ چلا گیا تو ابوطالب نے مجھ سے کہا:

''اچھا آدمی تھا۔ میرے خیال میں اس میں شاعری کی صلاحیت ھے۔''

"کیا آپ کو اس کی نظمیں پسند آئیں؟"

"ساری نظمیں کمزور تھیں۔ مگر آٹھ مصرعے ایسے تھے جن کی حیثیت کسی ایسے قلعہ کی تھی جسے زبردست جنگ کے بعد فتح کیا گیا ہو۔ اس سے پہلے لاک زبان میں ایسا مثمن کبھی نہیں لکھا گیا۔"

جس طرح گیتوں اور نظموں میں چار مصرعے یا آٹھ مصرعے ایسے ہوتے ہیں جنہیں بھلایا ہی نہیں جا سکتا اسی طرح انسان کی زندگی میں بھی ایسے لمحات اور ایسی ملاقاتیں ہوتی ہیں اور ملک کی تاریخ میں! بھی ایسے واقعات اور کارنامے ہوتے ہیں جن کے لافانی نقوش ذہن پر ثبت ہوکر رہ جاتے ہیں۔ میں انہیں اپنانا اور انہیں اپنی نئی عمارت کی دیواروں میں یعنی اپنی نئی کتاب میں اس طرح شامل کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اس کا حصہ بن کر رہ جائیں۔ میں ان کی جگہ گونجتے ہوئے تشریحی الفاظ کو نہیں دینا چاہتا، زوردار توضیحی الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا، وہ خود ہی اپنے مفہوم کی وضاحت کر دینگے۔

مارچ کا مہینہ ساحلی علاقوں پر ہمیشہ طوفان‌خیز ثابت ہوتا ہے۔ ایک بار مخاچ‌قلعہ میں مارچ میں ایک ایسا ہی طوفان آیا۔ مختلف سمتوں میں سے اٹھنےوالی دو آندھیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ ایک کیسپین سے اٹھی تھی اور دوسری پہاڑوں کی جانب سے آئی تھی۔ ایک آندھی سطح سمندر کی وسعتوں پر بہتی اور زور حاصل کرتی شہر میں طوفان کی طرح داخل ہوئی اور دوسری پہاڑوں سے اس طرح ٹوٹی جیسے بڑی بڑی چٹانیں گرتی ہیں۔ دونوں آندھیاں درندوں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹیں اور دست و گریباں ہو گئیں، اور یوں جنگ چھڑ گئی۔ جب دو دیو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں تو درمیان میں آنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے، اور مخاچ‌قلعہ واقعتاً ان دونوں کے بیچ میں آ گیا تھا۔

چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ چیز جو مضبوطی کے ساتھ بندھی ہوئی نہ تھی یا جس کی جڑیں زمین میں گہری نہ تھیں، فوراً ہی ہوا میں تیرتی نظر آنے لگی۔ کمزور درخت، خالی ڈبے،

مکانوں کے چھپر، پلائی ووڈ کی دکانیں اور اس طرح کی دوسری تمام چیزیں ھوا کے ساتھ اڑتی پھر رھی تھیں۔

لیکن پرانے درخت اور بڑے بڑے مکان بڑے فخر کے ساتھ قدم جمائے کھڑے رھے۔ ھر وہ چیز جو کمزور یا ناپختہ تھی اپنی جگہ سے اکھڑ گئی۔ صرف مضبوط اور پختہ چیزیں باقی رہ گئیں۔

یہی حال ھے واقعات، جذبات اور انسانی افکار کا بھی۔ یہ بھی ممکن ھے کہ وقت کا ھلکا سا جھونکا بھی انہیں اپنے ساتھ بہالے جائے اور یہ بھی ھو سکتا ھے کہ زندگی کے شدیدترین دھماکے بھی انہیں اپنی جگہ سے نہ ھلا پائیں۔

اور مجھے اپنی کتاب کی عمارت تعمیر کرنے کے سلسلے میں اسی طرح کے دیرپا واقعات، خیالات اور جذبات کو کام میں لانا چاھئے۔ اس عمارت کا روائتی آوار انداز میں بنایا جانا ضروری ھے لیکن اس کے باوجود اس کو جدید طرز کا ھونا چاھئے۔ گھر ایسا ھونا چاھئے کہ خاندان کے لوگ اس میں رھتے ھوئے خوشی محسوس کریں اور کوئی مہمان آئے تو وہ بھی اسے پسند کرے۔ گھر ایسا ھونا چاھئے جہاں بچے خوشی محسوس کریں، جوان محبت حاصل کر سکیں اور بوڑھے لوگوں کو سکون مل سکے۔

میرا داغستان میری کتاب ھے۔ سوال یہ ھے کہ میرے ذھن میں اس کا تصور کیا ھے؟ میں اسے کس چیز سے تشبیہہ دوں؟ بلندیوں پر پرواز کرتے ھوئے عقاب سے؟ لیکن عقاب تو انسان کی تخلیق نہیں۔ قدرت اس کی خالق ھے اور ھمارے افکار کا اس کی تخلیق میں کوئی دخل نہیں۔ تو پھر کیا کسی ھوائی جہاز کی؟ لیکن ھوائی جہاز زمین سے بہت زیادہ بلندی پر پرواز کرتا ھے اور جب زمین پر واپس آتا ھے تو اس کو آس پاس کے منظر کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ جب لوگ فضا کی بلندیوں سے زمین پر نظر ڈالتے ھیں اور حقارت کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ھیں تو مجھے غصہ آجاتا ھے۔

جی نہیں! میرے ذھن میں اس کی جو تصویر ھے وہ ایک ایسی مشین کی ھے جو فضا میں ھوائی جہاز کی طرح اڑتی ھے،

زمین پر ریل گاڑی کی طرح دوڑتی ہے اور پانی پر بحری جہاز کی طرح چلتی ہے۔ میں ہواباز بھی ہوں، انجن ڈرائیور بھی اور جہازراں بھی۔ صدیوں پرانا لیکن زندۂجاوید داغستان ہمارے سفر کا نقطہ آغاز ہے، ہمارا ہوائی اڈہ، ہمارا اسٹیشن اور ہماری بندرگاہ ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے ہم فضا میں، زمین پر یا پانی پر سفر شروع کرکے دنیا کے ہر کونے میں جاتے ہیں۔ ان جگہوں پر بھی جہاں میں حقیقت میں ہو آیا ہوں اور ان جگہوں تک بھی جن کا سفر میں نے صرف تخیل میں کیا ہے۔ ہم فضا میں اڑ رہے ہوں، ریل پر چل رہے ہوں یا پانی میں تیر رہے ہوں۔ کھڑکیوں سے ہم ان پہاڑوں کو دیکھ سکتے ہیں جن کی چوٹیوں پر برف جمی ہوئی ہے سرسبز وادیاں، چوڑےچکلے دریا اور ناپیدا کنار سمندر ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ پرجوش موسم بہار، ہلکی خزاں، سخت جاڑا، اور اس سے بھرپور گرمی کے موسم کھلی ہوئی کھڑکیوں سے پیچھے کی طرف بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس گاڑی پر کتنے مسافر میرے ہم‌رکاب ہیں۔ شامیل کے مرید جن کے زخموں پر بندھی ہوئی پٹیاں خون میں ڈوبی ہوئی ہیں، پہاڑی علاقے کے چھاپہ مار اور پھر میرے ہم‌عصر، زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنےوالے عورت و مرد۔ مجھے وہ سارے لوگ گھیرے ہوئے ہیں جن سے میں نے کبھی بھی بات کی ہے، جنہیں میں نے کبھی بھی دیکھا ہے، ملا ہوں اور جنہیں میں نے یاد رکھا ہے۔

میری اس کتاب میں جو کسی ریل گاڑی، کسی ہوائی جہاز یا کسی بحری جہاز کی طرح ہے، جگہ حاصل کرنے کے لئے صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ کوئی نہ کوئی تاثر میرے ذہن پر ثبت ہوکر رہ گیا ہو۔ افراد و واقعات ان چار یا آٹھ مصرعوں کی طرح ہوں جو بازاری گویوں کے طویل گیتوں میں سے مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ انہیں ان آٹھ مصرعوں کی طرح ہونا چاہئے جنہیں دس طویل نظمیں سننے کے بعد ابوطالب نے الگ کر لیا تھا۔ انہیں ان پیڑوں اور مکانوں کی طرح ثابت‌قدم ہونا چاہئے جو اس تند تیز آندھی میں بھی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے جس

نے ہر کمزور اور ناپختہ چیز کو جڑ سے اکھاڑ کر پت‌جھڑ کے پتوں کی طرح ہواؤں میں بکھیر دیا تھا۔

اگر ایسا نہ ہو تو مجھ میں اور کازانیشچی کے مسلم میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا جس کے بارے میں لوگ مندرجہ ذیل کہانی بیان کرتے ہیں۔

مئی میں جب بھیڑیں گرم اور گردآلود استیپ سے پہاڑوں میں واقع سرسبز اور ٹھنڈی چراگاہوں کی طرف لے جائی جاتی ہیں، کازانیشچی گاؤں کے ادیب مسلم نے ادیبوں کی یونین سے درخواست کی کہ اسے بھی اس سفر میں بھیڑوں کو لے جانے کے بارے میں مضمون لکھنے کے لئے بھیجا جائے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ستمبر کی بات ہو جب پچھلی صورت کے برعکس بھیڑوں کو جاڑا شروع ہوتے ہی پہاڑی چراگاہوں سے نسبتاً گرم‌تر استیپ لایا جاتا ہے۔ بہر حال ہم نے اس سفر کا انتظام کر دیا اور مسلم بھیڑوں کے ساتھ چل دیا۔ اس نے بڑی ایمانداری کے ساتھ راستےبھر بھیڑوں اور چرواہوں کا ساتھ دیا۔ جب واپسی کا وقت آیا تو اس نے جن نوٹ‌بکوں میں اپنی یادداشتیں لکھی تھیں ان کی تعداد اتنی ہو گئی تھی کہ ایک گھوڑا اس بوجھ کو ڈھونے کے لئے وقف کرنا پڑا۔ ہوا یہ تھا کہ وہ جو کچھ دیکھتا تھا روزانہ اسے نوٹ‌بک میں درج کر لیتا تھا۔ کوئی بھی واقعہ چاہے وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ رہا ہو اس کی پنسل کی زد سے نہ بچ سکا۔ جب بھی اسے کوئی گھوڑا نظر آتا وہ نوٹ‌بک میں اس کا اندراج کر لیتا، جتنی بار بھی کوئی چرواہا اسے دکھائی دیتا، وہ اپنی نوٹ‌بک میں اتنی بار اسکا ذکر کرتا۔ اسی طرح ہر نظر آنےوالی بھیڑ اسکی نوٹ‌بک میں محفوظ ہو جاتی۔ اب آپ خود تصور کیجئے کہ اس سفر کے دوران کتنے چرواہے اور کتنی بھیڑیں اسے ملی ہونگی۔ بہر حال اس نے کسی بھی چیز کو نظرانداز نہیں کیا۔ اندراج کا یہ طوفان صرف انہی چیزوں تک محدود نہیں رہا جو اسے نظر آئیں، بلکہ سنی‌سنائی باتیں بھی نوٹ‌بک میں جگہ پاتی رہیں۔ اس نے ان لوگوں کا بھی ذکر کیا جو زیادہ تیزرو تھے اور جنہیں آہستہ چلنے کی ہدایت کی گئی‌تھی اور ان لوگوں کا بھی جو بہت زیادہ سست‌رو

تھے اور جن سے تیز قدم بڑھانے کے لئے کہا گیا۔ غرض طے ہونےوالے راستے کے بارے میں اسکی کتاب خود اس راستے سے بھی طویل نکلی، ایک ایسی کتاب بن گئی جس کے پڑھنے کے لئے اتنا ھی وقت درکار تھا جتنا مسلم کو سفر کرنے میں لگا تھا۔ بعد میں ان کے همسفر چرواھوں نے ھمیں بتایا کہ جب وہ لوگ کیمدین سلسلۂ کوہ کی چڑھائی طے کر رہے تھے تو انہیں ایک خچر دکھائی دیا۔ مسلم کے لئے خچر کی تفصیلات درج کرنا ضروری تھا اور یہ اس وقت تک ناممکن تھا جب تک وہ اس کا انگ انگ نہ دیکھ لیتا۔ چنانچہ اس نے چھلانگ لگائی اور اس کا ایک پچھلا پیر پکڑنا چاھا۔ لیکن جانور تو جانور ھوتا ھے، اسے نہ تو یہ خبر تھی کہ مسلم ایک ادیب ھے، اور اس کے ارادے نیک ھیں، اور نہ ھی یہ کہ وہ ایک اھم مشن کی انجامدھی پر نکلا ھے، اس نے گھبراھٹ میں دولتی جھاڑ دی اور بچارے مسلم کا منھ زخمی ھو گیا۔

چرواھوں نے قہقہہ لگاتے ھوئے کہا:

''اب تو بچارے مسلم کو یہ قصہ بھی لکھنا پڑیگا۔،،

اس میں کوئی شک نہیں کہ خچر بدذات قسم کا جانور ھے لیکن اس وقت اس نے جو کچھ کیا وہ غالباً صحیح تھا۔ ایسے لوگوں کو ضرور سزا ملنی چاھئے جو ضرورت سے زیادہ دخل درمعقولات کے عادی ھوں۔ بعد میں مسلم کی تحریریں ادیبوں کی یونین میں بحث کا موضوع بنیں۔ ھم نے اسے چھیڑنے کے لئے کہا:

''اچھا مسلم یہ تو بتاؤ کہ جب تم نے خاری کولو گاؤں کے گدھے کے بچے سے لے کر خچر کے کھر تک ھر اس بات کا ذکر کیا ھے جو تمھیں نظر آئی تو پھر یہ کیسے ھوا کہ تمھاری اس تحریر میں منڈے بکرے کا کوئی ذکر نہیں ملتا؟،،

''ایسی بات تو نہیں، اس کا بھی ذکر موجود ھے۔ البتہ اس کا میں نے مقامی نام لکھا ھے۔ میری تحریر میں آپ کو ''خانکوا،، لکھا نظر آئےگا، اس کے معنی بے سینگ بکرے ھی کے ھیں۔،، ھمیں جواب ملا۔

ھم ھنس دئے۔ مگر بعد میں ھم نے مسلم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ادیب کو اپنے مشاھدے میں آنےوالی ایک ایک

چیز کا ذکر کرنا نہیں چاھئے۔ اسے تو مشاھدے کی پوری دولت میں سے صرف ان چیزوں کا انتخاب کرنا ھوتا ہے جس کی وہ ضرورت محسوس کرے۔ کسی بہت بڑے خیال کو محض ایک جملے میں سمویا جا سکتا ہے۔ شدید سے شدید احساس اور جذبے کے اظہار کے لئے کبھی کبھی صرف ایک لفظ کافی ھوتا ہے اور اسی طرح پوری داستان بیان کرنے کے بجائے محض ایک واقعے کے بیان سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔

ابھی کچھ دنوں پہلے ھم از سر نو تنظیم کے کام میں مشغول تھے۔ اب بھی اکثر ایسا ھی ھوتا ہے کہ اچانک ھم کسی نہ کسی چیز کی تنظیم‌نو کا کام شروع کر دیتے ھیں۔ یہ چھوت مجھے بھی لگ گیا ہے۔ میں اس صنف کی تنظیم نو میں مشغول ھوں جسے میں نے اپنایا ہے۔ میں ایک اکیلی کتاب میں تمام اصناف کو سمیٹ رھا ھوں اور انہیں محض اپنی انتظام کاری کا تابع بنا رھا ھوں۔ ایک طرف میں عملے میں کمی کرتا ھوں تو دوسری طرف اس میں اضافہ کر دیتا ھوں۔ میں اصناف میں الٹ‌پھیر کر دیتا ھوں، کبھی انہیں آپس میں پھینٹ دیتا ھوں، کبھی ایک ھی صنف کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیتا ھوں۔ اور ظاھر ہے جب آپ لگاتار اس طرح کی الٹ‌پھیر میں مشغول ھوں تو اس کی کوئی نہ کوئی شکل خوبصورت بن ھی جائےگی چاہے اس میں محض اتفاق ھی کا ھاتھ کیوں نہ ھو۔

<u>ایک پہاڑی کی کہانی جو مخاچ‌قلعہ آیا تھا</u>۔ کسی سرکاری کام سے ایک پہاڑی مخاچ‌قلعہ آیا۔ اس کے پاس بہت سارا سرمایہ تھا (ظاھر ہے، یہ رقم اس کی اپنی نہ تھی، سرکاری اخراجات کے لئے اسے ملی تھی)۔ اس نے ایک ریستوران میں کھانا کھایا اور شراب پی۔ جس دن وہ شہر پہنچا اس دن اس نے ریستوران میں اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے اس طرح چلا کر سامان خورد و نوش مانگا کہ سارے لوگ سن سکیں، اس نے کہا:

”ویٹر! میرے لئے برانڈی اور لاؤ!“

اور اس کی آواز سن کر لوگ اس کی طرف مڑے تھے، یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کون آدمی ہے جو اتنی قیمتی شراب اس طرح پی رہا ہے، اور کافی دیر تک یہ سوچتے رہے تھے کہ وہ کرتا کیا ہے؟

پھر وہ دن بھی آگیا جب اسے شہر سے روانہ ہونا تھا۔ اس دن اس نے اسی ویٹر سے سامان مانگا لیکن اس بار سرگوشی کے لہجے میں۔ اس نے کہا:

"تمہارے ریستوران میں ایک پلیٹ سویوں کی قیمت کیا ہے؟"

تو بات یہ ہے کہ بیل کی قوت کا اندازہ اس وقت نہیں لگایا جا سکتا جب اس نے جتائی کا کام شروع کیا ہو، بلکہ اس کا صحیح اندازہ کام ختم ہونے پر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے نہیں کہ وہ چراگاہ میں گھاس کیسے چرتا ہے بلکہ اس سے کہ وہ ہل کیسے کھینچتا ہے۔ گھوڑے کی تعریف اس وقت نہیں کرنی چاہئے جب آپ زین پر بیٹھ رہے ہوں بلکہ اس وقت جب آپ گھوڑے سے اتر رہے ہوں۔

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں اپنی کتاب کو اس طرح پھلا رہا ہوں جس طرح انسالتینی لوگ اپنی دھوکنی بین پھلاتے ہیں؟ کہیں میں سیوخ کے لوگوں کی طرح لکڑی کا چولھا تو نہیں بنا رہا ہوں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں بھیڑیئے کے دھوکے میں کوئی کتا مارے دے رہا ہوں جیسا کہ سدا گاؤں کے رہنےوالے ایک بار کر چکے ہیں؟

راستہ شروع ہوتا ہے تو منزل دور نظر آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مجھ میں وہ ہمت، وہ لگن اور وہ استقلال ہے یا نہیں جو منزل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے؟ کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ مجھے بھی اپنا سر کھجا کر ایک پلیٹ سویوں کی قیمت پوچھنا پڑے۔

یاد کی ایک جھلک۔ ایک بار داغستان میں قیامت کا جاڑا پڑا۔ اچانک برف گرنے لگی اور اتنی کہ زمین پر تقریباً ایک میٹر برف جم گئی۔ بھیڑوں اور ان کے بچوں کے لئے چارہ نہ رہا

اور وہ بھوکوں مرنے لگے۔ مجھے علاقائی پارٹی کے دفتر میں بلا کر یہ حکم دیا گیا:

''رسول! ہم چاہتے ہیں کہ آپ چراگاہوں کو جائیں۔ بھیڑوں کو ہر قیمت پر بچانا ہے۔،،

''لیکن میں کیا مدد دے سکتا ہوں؟،،

''یہ سب آپ وہاں پہنچکر سوچیئےگا۔ کوئی راستہ تلاش کیجئے۔ بھیڑوں کو تو بہرحال بچانا ہے۔،،

موسم اچھا ہوتا تو بھی میرے لئے راستہ تلاش کرنا مشکل ہوتا، نہ کہ اس وقت جب برف کا طوفان آیا ہوا ہو۔ لیکن پارٹی کے حکم سے سرتابی کی مجال کسے ہے۔ میں برف میں راستہ تلاش کرتا اور تیز ہواؤں کے جھکڑ سہتا آخر ایک ایسی جگہ پہنچ ہی گیا جہاں بھیڑوں کا ایک گلہ موجود تھا اور وہاں مجھے چرواہوں کے مغموم چہرے نظر آئے۔ ان کے رخساروں اور ان کی مونچھوں پر آنسوؤں کے قطرے جم گئے تھے۔ جمی ہوئی برف کی تہہ توڑ کر سرسبز گھاس تک پہنچنے کی کوشش میں بھیڑوں کے منھ چھل کر لہولہان ہو گئے تھے۔ لیکن وہ برف کی تہہ توڑ نہیں سکی تھیں اور موت کا شکار ہوتی جا رہی تھیں۔ کتوں نے بھی ہواؤں کی زد سے بچنے کے لئے گلے سے بچھڑ کر بھیڑوں کو بھیڑئیوں اور چوروں سے بچانے کی فکر چھوڑ دی تھی۔ ہر طرف مایوسی اور مجبوری کا منظر تھا۔ چرواہوں نے مجھے دیکھتے ہی قہقہہ لگایا، وہ قہقہہ جس میں بلا کی تلخی تھی، اور بولے:

''بس یہاں تمہاری نظموں اور تمہارے گیتوں کی کمی رہ گئی تھی۔ سدا گاؤں کے حمزہ کے بیٹے تم یہاں اپنی نظمیں اور گیت سنانے ہی آئےہو نا؟ اچھا تو ہمیں کوئی ایسا مرثیہ سناؤ جس میں بین ہو تاکہ ہم سب چیخ چیخ کر رو سکیں۔،،

میں نے چرواہوں کے خیمے میں ۳ دن گزارے، پھر اس کا یقین دلایا کہ نہ میں ان کے لئے کچھ کر پایا ہوں، نہ کر سکتا ہوں، اور اس کے بعد ان سے جدا ہو کر مخاچ قلعہ لوٹ آیا۔

''ہاں! تو تم نے بھیڑوں کو بچایا؟،، پارٹی دفتر میں مجھ سے پوچھا گیا۔

''صرف تین میمنوں کو۔''
''کس طرح۔ ہمیں بھی بتاؤ؟''
''بڑی آسانی کے ساتھ۔ چرواہوں نے تین میمنے ذبح کئے اور ہم سب نے کھائے۔ میرے خیال میں یوں ہم نے ان کو ضایع نہیں ہونے دیا۔''
''صحیح فرماتے ہیں'' جواب میں ناراضگی صاف ظاہر تھی۔ ''اچھا تو اب آپ جائیے، اپنی نظموں سے نپٹیئے، ہم یہ کام آپ کی مدد کے بغیر ہی انجام دے لینگے۔ اگر ہم آپ کی تنبیہہ کریں تو غالباً اس سے آپ کی تحریر میں تیزی آئے گی۔''

کہیں میری کتاب کے ساتھ بھی تو یہی نہیں ہوگا؟ میں گلے کو بچانے ہی نکلا تھا نا؟ اور وہاں سے لوٹا تو کس طرح! ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا کہ طلوع ہونےوالا دن آپ کی توقع کے مطابق گزرے۔

یاد کی ایک اور جھلک۔ ادارۂادب میں مجھے اپنے ابتدائی دن یاد ہیں۔ پڑھائی شروع ہو رہی تھی۔ انہیں دنوں میری سال گرہ کی تاریخ آ گئی۔ مجھے کسی نے اس موقع پر مبارکباد نہ دی، کیونکہ کسی کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ آج میری سال گرہ ہے۔ میری جیب میں کچھ پیسے تھے، ابا نے کوٹ خریدنے کے لئے دئے تھے۔

میں نے اپنے آپ سے کہا: ''چلو، رسول! اپنی سال گرہ پر خود ہی تحفہ دے لو، ایک نیا کوٹ خرید لو!'' اور یوں پیسے جیب میں ڈال کر تیشینسکی بازار چل دیا۔

جنگ ابھی ابھی ختم ہوئی تھی اور ان دنوں ماسکو کے بازار بھی عجیب و غریب ہوا کرتے تھے۔ ان کے اپنے قاعدے تھے، اپنے چوربازاری کرنے والے تھے اور اپنے سلیشیاوالے۔ آپ وہاں کوئی بھی چیز خرید سکتے تھے۔ بس، صرف گدھے نہیں بکتے تھے۔

اگر ہم تیشینسکی بازار کو کسی چیز سے تشبیہ دینا چاہیں تو سب سے مناسب تشبیہ چیونٹیوں کا وہ دمکوڑا ہوگا جسے چھیڑ دیا گیا ہو۔ پورے ایک گھنٹے تک میں ان لوگوں

کے درمیان الجھا رہا جو ہر طرح کی چیزیں میری جانب بڑھا دیتے تھے: مردوں کے سوٹ، پتلون، لمبے کوٹ، ٹوپیاں، عورتوں کے لباس، بلاؤز، سوئٹر، سلیپر اور جوتے وغیرہ۔

ان دنوں کابینہ کے کسی وزیر جیسا نظر آنا میری خواہشوں کی معراج تھا۔ چنانچہ مجھے کسی ایسے کوٹ کی تلاش تھی جسے پہنتے ہی میں یوں نظر آنے لگوں جیسے کوئی وزیر ہو۔ جلد ہی مجھے ایک چوربازاری کرنےوالے کے کندھے پر پڑا ایسا کوٹ ایک جگہ نظر آگیا جسے میں خریدنا چاہتا تھا۔ کوٹ کی جاذبیت بڑھانے کے لئے اسی رنگ اور اسی کپڑے کی ٹوپی بھی مل رہی تھی۔

میں نے سب سے پہلے ٹوپی اٹھائی، سر پر پہنی اور آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ واقعی میں وزیر لگ رہا تھا۔ میں نے مول تول شروع کیا۔ جب تک میں نے معمولی سے دام لگائے اس وقت تک بیچنے والا یہی ظاہر کرتا رہا جیسے میری بات سن ہی نہ رہا ہو حالانکہ میں اپنی بات خاصی بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ لیکن جب میں نے دبے دبے لہجے میں ایک اچھی رقم کی پیشکش کی تو اس نے ایک ایک لفظ سن لیا اور ہم نے ہاتھ ملا کر سودا چکا لیا۔ میں نے جیب سے تین روبل اور پانچ روبل کے نوٹ نکالے اور اس خیال سے کہ میں انہیں آسانی کے ساتھ گن سکوں، کوٹ بیچنے والے کو پکڑا دیا۔ ۲۲۵۰ روبل گننے کے بعد میں نے اس کو قیمت ادا کی اور اپنے ہوسٹل کی طرف اپنی اہمیت کے اس احساس کے ساتھ چل پڑا کہ دیکھنےوالے مجھے وزیر ہی سمجھیں۔ ہوسٹل پہنچ کر ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ کوٹ تو میں چوربازاری کرنےوالے کے ہاتھ میں ہی چھوڑ آیا ہوں۔ اور یوں میں نے ۲۲۵۰ روبل میں محض ایک ٹوپی خریدی۔

کابینہ کا وزیر نظر آنے کی خواہش میں میں ایک کوٹ اور اپنی ساری جمع پونجی سے ہاتھ دھو چکا ہوں۔ کہیں یہی واقعہ میری کتاب کے ساتھ بھی نہ پیش آجائے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ کرنا کیا چاہئے لیکن اسے کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ منزل تو سبھی کو نظر آ سکتی

ہے لیکن سب ہی منزل تک پہنچ نہیں سکتے۔ ایسے لوگ موجود ہیں جو اس بھرم میں رہتے ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہے کہ کتاب کس طرح لکھی جانی چاہئے، لیکن درحقیقت کتاب لکھی کیسے جائے یہ انہیں معلوم نہیں۔

ایک عام کہاوت ہے کہ ایک ہی سوئی سے لباس عروسی بھی سیا جاتا ہے اور کفن بھی۔

یہ بھی کہاوت ہے کہ کوئی ایسا دروازہ کبھی نہ کھولو جسے تم بند نہ کر سکتے ہو۔



صلاحیت

جلو! کہ سارے زمانے میں روشنی ہو
جائے۔
(ایک لیمپ پر کھدا ہوا نقش)

شاعر اور سنہری مچھلی کی کہانی۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایک دن کسی ناکام شاعر نے بحیرۂ کیسپین سے ایک سنہری مچھلی پکڑی۔

''شاعر! شاعر! مجھے سمندر میں واپس ڈال دو!،، سنہری مچھلی نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''تم اس کا صلہ کیا دوگی؟،،

''تمہاری ساری دلی خواہشیں پوری کر دونگی۔،،

شاعر بہت خوش ہوا۔ اس نے سنہری مچھلی کو سمندر میں چھوڑ دیا۔ پھر تو یکےبعددیگرے نت‌نئی کامیابیاں اس کے قدم چومنے لگیں۔ اس کے مجموعے دھڑا دھڑ بازار میں آنے لگے۔ اسے شہر میں مکان اور دیہی علاقے میں ایک بنگلہ مل گیا۔ محنتی کارناموں کے لئے شاعر کے سینے پر اعزازات اور تمغہ ابھر آئے۔ شہرت حاصل ہوئی اور اس قدر کہ ہر شخص

اس کے گیت گانے لگا۔ اس نے اعلی عہدے حاصل کئے اور اب دنیا اس کے لئے یوں تھی گویا گرما گرم کباب سے بھری طشتری سامنے رکھی ہو، اچھی طرح سینکے ہوئے کبابوں کی طشتری، پیاز کی ہوائی پڑی ہوئی اور لیمو کا رس چھڑکا ہوا، بس ہاتھ بڑھاؤ اور اس کے مزے لو!

بہت دنوں بعد جب وہ اکادمی اور پارلیمنٹ کا ممبر بن چکا تھا اور حکومت کی طرف سے خطاب پا چکا تھا، ایک دن اس کی بیوی نے بڑی معصومیت کے ساتھ اس سے سوال کیا: ''جان من! تمہیں اتنا موقع ملا تھا تو سنہری مچھلی سے تھوڑی سی صلاحیت کیوں نہ مانگ لی؟،،

اور تب جاکر شاعر کو احساس ہوا کہ اس کی زندگی میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا سمندر کے کنارے پہنچا اور کہنے لگا:

''سنہری مچھلی! سنہری مچھلی! مجھے تھوڑی سی صلاحیت دے دو!،،

سنہری مچھلی نے یہ سن کر جواب دیا:

''میں نے اب تک تمہاری سب فرمائشیں پوری کی ہیں، اور آئندہ بھی تم جو مانگوگے دونگی۔ لیکن شاعری کی صلاحیت ایک ایسی چیز ہے جو میں نہیں دے سکتی۔ بات یہ ہے کہ یہ تو میرے پاس بھی نہیں۔،،

کہنا یہ ہے کہ یا تو انسان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ نہ تو یہ صلاحیت کوئی آپ کو دے سکتا ہے، نہ ہی چھین سکتا ہے۔ یہ صلاحیت تو ماں کے پیٹ سے لے کر آنا پڑتا ہے۔

یوں سنہری مچھلی نے ہمارے شاعر پر احسان کیا، پھر بھی تھوڑے عرصے میں اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ہے تو پہاڑی کوا لیکن مور کے پر لگا لئے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے اس کے مانگے ہوئے پروں کا خوشنما رنگ اڑنے لگا، اس کے اپنے پر بھی زمانے کے ساتھ جھڑتے گئے اور وہ دن بدن بدصورت ہوتا گیا۔

بار بار دعا مانگنے سے دعا کا اثر ختم نہیں ہوتا، اس لئے میں ایک بار پھر کہونگا کہ لکھنے کے لئے صلاحیت ضروری

ہے۔ لیکن اگر یہ صلاحیت سنہری مچھلی کے پاس بھی نہ ہو تو پھر انسان اور کہاں ڈھونڈھنے جائے؟

ابا نے مجھے ایک واقعہ سنایا تھا: ایک دن ان کے پاس کسی دوردراز گاؤں سے ایک پہاڑی آیا اور انہیں اپنی نظمیں سنانے لگا۔ ابا اس نوسکھیئے شاعر کی نظمیں بڑی توجہ سے سنتے رہے، پھر انہوں نے نظموں کی کمزوریوں اور خامیوں کی طرف اشارے کئے اور آخر میں انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر وہ یہ اشعار لکھتے تو کس طرح لکھتے۔

''پیارے حمزہ! اس طرح لکھنے کے لئے تو صلاحیت ضروری ہے۔ ،، پہاڑی شاعر نے کہا۔

''ہے تو!،، ابا نے جواب دیا۔ ''اگر تمہارے پاس تھوڑی سی صلاحیت ہو تو اس میں برائی کیا ہے۔ ،،

سادہلوح پہاڑی ابا کے طنز کو نہ سمجھ سکا، اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا: ''تو بتائیے نا! یہ تھوڑی سی صلاحیت میں کہاں سے لاؤں؟،،

''آج تو یہاں کی دکانوں پر اس کا قحط ہے، میں ابھی ابھی نامراد لوٹا ہوں، تم ایسا کرو کہ بازار دیکھ لو!،،

واقعی یہ بتانا مشکل ہے کہ صلاحیت انسان کو کہاں سے ملتی ہے۔ وہ زمین سے پھوٹتی ہے یا آسمان سے ٹپکتی ہے؟ یا پھر ان دونوں کی مشترکہ دین ہے؟ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ انسان کے اندر کہاں چھپی رہتی ہے، اس کے دل میں، اس کی شریانوں میں یا اس کے ذہن میں؟ کیا ایسا ہے کہ بچہ جنم لیتا ہے تو اس کے ننھے سے دل میں یہ جاگزیں رہتی ہے یا پھر انسان کو زندگی کی دشوارگذار راہوں پر اسے تلاش کرنا پڑتا ہے؟ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ اسے پروان چڑھانے میں زیادہ ہاتھ محبت کا ہوتا ہے یا نفرت کا، خوشی کا ہوتا ہے یا غم کا، قہقہوں کا ہوتا ہے یا آنسوؤں کا؟ یا صلاحیت کی ترقی‌وتوانائی کے لئے یہ ساری ہی چیزیں ضروری ہیں؟ پھر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ صلاحیت ورثے میں ملتی ہے یا ان تمام چیزوں سے حاصل

ہوتی ہے جنہیں انسان دیکھتا ہے، سنتا ہے، پڑھتا ہے، اپنے تجربے میں لاتا ہے اور جن کا درک حاصل کرتا ہے؟

ہم نہیں جانتے کہ یہ مشقت سے حاصل ہوتی ہے یا قدرت کا عطیہ ہے؟ یہ انسان کی آنکھوں کی اس رنگت کی طرح ہے جو پیدائشی چیز ہے یا اس کے رگ‌پٹھوں کی طرح، اس کے کس‌بل کی طرح جو وہ روزانہ کی ورزش کے ذریعے حاصل کرتا ہے؟ یہ سیب کا وہ پیڑ ہے جس کی نشوونما کے لئے کوئی مالی رات دن اپنی ساری قوت وقف کر دیتا ہے یا اس کے اس پھل کی طرح ہے جو ڈال سے ٹوٹ کر سیدھے ایک بچے کے ھاتھ میں آ گرتا ہے؟

صلاحیت ایک سربستہ راز ہے، ایسا راز کہ جب ہم کرۂارض کے بارے میں، اس کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں سب کچھ جان لینگے، جب ھمیں سورج اور ستاروں کے بارے میں، آگ اور پھول کے بارے میں سب کچھ معلوم ھو چکے گا، جب خود انسان کے بارے میں ھماری معلومات مکمل ھو چکینگی تو آخری چیز جس کا ھمیں عرفان حاصل ھوگا، وہ صلاحیت ھوگی، اس کا سرچشمہ، اسکی اصلیت اور اس کا محل وقوع، اور تب جا کر ھم اس راز سے پردہ اٹھا سکینگے کہ ایسا کیوں ہے کہ کسی کو تو یہ دولت ملتی ہے اور کسی کو نہیں۔

دو باصلاحیت آدمیوں کی صلاحیتیں بھی ایک دوسرے سے مشابہہ نہیں ھوتیں، کیوں‌کہ جو صلاحیتیں مشابہہ ھوں وہ صلاحیتیں ھوتی ھی نہیں۔ اسی طرح اس کا انحصار باصلاحیت لوگوں کی ظاھری مشابہت پر بھی نہیں ھوتا۔ میری ملاقات ایسے کئی لوگوں سے ھوئی ہے جنکی شکل ابا سے ملتی جلتی تھی لیکن مجھے ایسا ایک بھی آدمی نہیں ملا جس میں ان کی جیسی صلاحیت رھی ھو۔

صلاحیت ورثے میں بھی نہیں ملتی، کیوں‌کہ اگر ایسا ھوتا تو ھمیں آرٹ کی دنیا پر خاندانوں کی حکمرانی نظر آتی۔ عقلمندوں کے بیٹے اکثر بیوقوف نکلتے ھیں اور ایسا بھی ھوتا ہے کہ کسی بیوقوف کا بیٹا بڑا ھوکر عقلمند ثابت ھو۔

صلاحیت جب کسی انسان کو نوازتی ہے تو اس سے یہ نہیں پوچھتی کہ تم کس ملک اور کس علاقے کے رھنےوالے

ہو اور تمہارے علاقے میں کتنے لوگ رہتے ہیں۔ اس کی آمد اتنی ہی اتفاقی اور غیرمتوقع ہوتی ہے جتنی بجلی کی چمک یا قوس قزح کا ظہور یا کسی ایسے ویران صحرا میں پانی کا برسنا جہاں بارش کی ذرا بھی امید نہ رہی ہو۔

ایک دوست سے محرومی کی کہانی۔ ایک بار میں کچھ لکھپڑھ رہا تھا کہ مجھے ایک نوجوان گھوڑ سوار مکان کی طرف آتا دکھائی دیا۔

''سلام علیکم۔'' اس نے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔''

''رسول میں آپ کو ایک زحمت دینے آیا ہوں۔''

''اندر آجاؤ! اور بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟''

اس نوجوان نے جیب سے کاغذات نکال کر میرے سامنے رکھ دئے۔ سب سے پہلے میری نظر ابا کے ایک دوست کے خط پر پڑی جو اکثر میرے گھر بھی آیا کرتے تھے۔ ہمارے خاندانی دوست نے لکھا تھا: ''ڈیر رسول! حامل رقعہ میرا قریبی عزیز اور اچھا آدمی ہے۔ اس کی مدد کرو تاکہ وہ بھی تمہاری طرح ایک مشہور شاعر بن سکے۔''

اس کے علاوہ گاؤں کی سوویت، پنچائتی فارم اور پارٹی کی مقامی تنظیم کے سفارشی خطوط تھے اور عام کوائف کے بارے میں لکھی ہوئی ایک سند تھی۔

گاؤں کی سوویت نے جو خط لکھا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ فلاں ابن فلاں کاخاب روسو کے مشہور شاعر محمود کا سگا بھتیجا ہے اور اس قابل ہے کہ داغستان کے بلند مرتبت شعرا' کی صف میں شامل کیا جا سکے۔

دوسرے کاغذات سے مجھے معلوم ہوا کہ محمود کا بھتیجا ۲۰ سال کا ہے، ۹ سالہ تعلیم پوری کر چکا ہے اور پوری طرح صحت مند ہے۔

''اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب اپنی تخلیقات دکھاؤ۔ ہو سکتا ہے تم میں صلاحیت ہو اور آگے چل کر مشہور شاعر بن سکو۔ مجھے تمہاری مدد کرنے اور یوں اپنے

مشترکہ دوست کے حکم کی تعمیل کرنے میں خوشی ہوگی۔ ،،
''لیکن میں نے تو کبھی کوئی نظم نہیں لکھی۔ اسی لئے تو مجھے یہاں بھیجا گیا ہے تا کہ آپ مجھے نظم لکھنا سکھائیں...،،
''تو پھر تم کرتے کیا ہو؟،،
''میں پنچائتی فارم میں کام کرتا ہوں، مگر کوئی فائدہ نہیں۔ میرے کام کاجی دنوں کا اندراج ایک کارڈ پر کر لیا جاتا ہے مگر مجھے کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ ہمارا خاندان خاصا بڑا ہے، سو لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس کے بجائے مجھے شاعر بنایا جائے۔ میں جانتا ہوں کہ محمود چچا کو اس سے خاص آمدنی ہوتی تھی، مجھ سے تو بہرحال بہتر تھے۔ سنا ہے آپ کی بھی آمدنی اچھی خاصی ہے۔ ،،
''بھئی، میرا خیال تو یہ ہے، اپنی خواہش اور کوشش کے باوجود میں تمہیں شاعر نہ بنا سکوں گا...،،
''مگر کیوں؟ کیا میں محمود کا بھتیجا نہیں؟ میری اسناد تو دیکھئے۔ گاؤں سوویت اور پارٹی تنظیم دونوں ہی نے میری حمایت کی ہے۔ ،،
''تم اگر محمود کے بیٹے ہوتے تو بھی نہ بنا سکتا۔ تم تو جانتے ہوگے کہ محمود جس باپ کے بیٹے تھے وہ کوئلہ گر تھا، شاعر قطعی نہ تھا۔ ،،
''یہ بے ایمانی ہے۔ یہاں مخاچ قلعہ میں آپ ادیبوں اور شاعروں نے ادب کی ساری دولت آپس میں بانٹ لی ہے۔ کیا میں ایک ذرے کا بھی اہل نہیں؟ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا۔ آخر میں کیا کروں؟ خدا کے لئے میری مدد کیجئے، مجھے کوئی کام دلا دیجئے۔ میری اسناد تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ ،،
محمود کی ہمارے دلوں میں بڑی عزت تھی، چنانچہ ہم نے اس کے بھتیجے کو ادبی فنڈ سے ایک معمولی سی رقم دلا دی۔ اور پھر میری سفارش پر داغستان کے برقی مشین‌ساز کارخانے کے منیجر نے اسے اپنے یہاں ملازمت بھی دے دی۔
لیکن عوامی شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے کی تمنا رکھنے والا یہ نوجوان ان باتوں سے مطمئن نہیں ہوا۔ جلد ہی

اس کے والد اور میرے خاندانی دوست نے بے حد غصے میں مجھے خط لکھا تھا:

''ایک تمہارے والد حمزہ تھے جو میری ہر بات مانتے تھے۔ انہوں نے کبھی میری کوئی درخواست رد نہیں کی، اور ایک تم ہو اسی حمزہ کے بیٹے، جس نے اتنی ذرا سی بات کے لئے انکار کر دیا کہ میرے لڑکے کو شاعر بنا دو۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تمہارے والد تو ایسے نہ تھے۔ میں نے کبھی اپنے کسی دوست سے قطع تعلق کی بات نہیں سوچی۔ مگر اب مجھے کرنا ہی پڑ رہا ہے۔ خدا حافظ۔،،

اور یوں صلاحیت کے پھیر میں یا یوں کہوں کہ عدم صلاحیت کے باعث مجھے اپنے ایک دوست سے ہاتھ دھونا پڑا۔ میرا یہ دوست بڑا پیارا آدمی تھا، لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ کوئی بھی آدمی چاہے وہ ادیبوں کی یونین کا صدر، پارٹی تنظیم کا سکریٹری حتیٰ کہ حکومت کا سربراہ ہی کیوں نہ ہو یہ نہیں کر سکتا کہ لوگوں میں صلاحیت اس طرح تقسیم کرتا پھرے جس طرح ہمارے پہاڑوں میں کھانے کی میز پر رکھے مسلم مینمنے کا بھنا ہوا گوشت ٹکڑوں کی صورت میں تراش کر کھانے والوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

داغستان کی سڑکوں پر اکثر آپ کو سامان سے لدی کوئی بھاری بیل گاڑی کسی پہاڑی راستے پر چڑھتی نظر آئے گی، ایک اسے آگے سے کھینچ رہا ہوگا اور دوسرا پیچھے سے ڈھکیل رہا ہوگا۔

یا ممکن ہے آپ کو کوئی بڑی سی لاری نظر آجائے جو کسی چھوٹی سی ''موسکوچ،، کار کو کسی برف بستہ کھڈ سے باہر نکال رہی ہو۔

یا آپ کی نظر کسی دھیرے دھیرے چلنے والے بھاری ٹرک پر پڑے جو پہاڑ کے تنگ راستے کی وجہ سے یوں چل رہا ہو کہ پیچھے سے آنے والی تیزرفتار کار آگے نہ نکل سکتی ہو۔

مگر صلاحیت بیل گاڑی نہیں کہ اسے آگے سے کھینچنے اور پیچھے سے ڈھکیلنے کی ضرورت پڑے، نہ وہ ''موسکوچ،، ہے جسے

کھڈ سے نکالنا ہے اور نہ ہی وہ کار جو راستے کی رکاوٹ کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔

صلاحیت کو نہ کھینچنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ ڈھکیلنے کی۔ وہ خود اپنا راستہ نکالتی ہے اور ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

لیکن پھر بھی کچھ لوگ ہیں جو یہ توقع رکھتے ہیں کہ کوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اوپر کھینچے یا پیچھے سے دھکہ دے کر آگے بڑھائے۔ اس سلسلے میں ایک چھوٹا سا قصہ ملاحظہ ہو۔

بوڑھی ہو لیکن صلاحیت والی ہو۔ ماسکو کے ادارۂادب میں جن دنوں میں زیرتعلیم تھا، اپنے ہم‌درس روسی شاعروں سے میری دوستی ہو گئی۔ ان لوگوں نے میری نظموں کے ترجمے کئے جو متعدد اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان روسی ترجموں کی بدولت میری نظمیں داغستان کی دوسری قومیتوں تک پہنچ گئیں۔

اس زمانے میں کچھ واھیات قسم کے لوگ بھی تھے جن کی کینہ‌پرور زبانیں زھر اگلنے لگیں: ''رسول حمزاتوف آوار زبان میں شعر لکھ ھی نہیں سکتا۔ یہ اس کے باصلاحیت روسی مترجم ھیں جو اسے مشہور بنانا چاھتے ھیں۔ معلوم ایسا ھوتا ہے کہ وہ روسیوں کے ذوق کے مطابق ھی لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔''

اس سلسلے میں مجھے بیساختہ ایک داغستانی شاعر یاد آ جاتا ہے۔

داغستان میں ایک چھوٹی سی قوم تات آباد ہے۔ اس کے افراد کی تعداد زیادہ سے زیادہ پندرہ ھزار ھوگی۔ لیکن تات زبان کے پانچ یا چار ادیب ایسے ھیں جن سے پورا داغستان واقف ہے۔ مخاچ‌قلعہ سے ان کی کتابیں ان کی اپنی زبان میں شایع ھوتی ھیں، پھر روسی میں ان کے ترجمے ھوتے ھیں۔ میں جو کہانی سنانے جا رھا ھوں وہ بھی ایک تات شاعر سے ھی متعلق ہے، اب یہ کوئی ضروری نہیں کہ آپ اس کا نام بھی جانیں۔

ادارۂادب میں تعلیم پوری کرنے کے بعد میں مخاچ‌قلعہ لوٹ آیا۔ ابھی مجھے یہاں آئے چند ھی دن ھوئے تھے کہ اس تات

شاعر نے مجھے مدعو کیا۔ دعوت کا اہتمام کھلے میدان میں تھا۔ سامنے کیسپین ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور پیچھے پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے تات زبان میں اپنی نظمیں سنائیں، ساتھ ساتھ اپنے ہر شعر کا لفظی ترجمہ روسی میں کرتا گیا۔

چونکہ میں مہمان تھا اور وہ میزبان، چونکہ وہ یہ سوچ سکتا تھا کہ ماسکو میں تعلیم پانے کے بعد مجھ میں گھمنڈ پیدا ہو گیا ہے، چونکہ ہر شاعر کی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ وہ تنقید سے زیادہ تعریف پسند کرتا ہے، چونکہ میری تنقید سے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا اور آخری بات یہ ہے کہ چونکہ اس سے پہلے وہ میرے ایک ایک مصرعہ اور ایک ایک شعر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا چکا تھا، اس لئے میں بھی بے حیائی کے ساتھ اس کے ایک ایک شعر کی تعریف کرتا رہا۔

اس کی کئی نظمیں مجھے واقعی پسند آئیں اور میں نے خلوص دل کے ساتھ ان کی تعریف کی۔ لیکن کچھ ایسی نظمیں بھی تھیں جو مجھے قطعی پسند نہ آئیں، میں ان کی بھی تعریف کرتا رہا۔ میرے منہ سے جیسے ہی جھوٹی تعریف کے بول نکلتے میں خیال ہی خیال میں کیسپین کی لہروں کی طرف ہاتھ بڑھاتا، حتیٰ کہ گھٹنوں کے بل جھک جاتا اور یہ التجا کرتا: ''اس جھوٹ کے لئے مجھے معاف کرنا،،۔ پھر اسی طرح پہاڑوں کی سفید چوٹیوں کی طرف رخ کرتا دوبارہ گھٹنوں کے بل جھک جاتا اور ان سے بھی جھوٹی تعریف کےلئے معافی مانگتا۔

ایک دوسرے پر اپنی نظمیں برسا کر اور ایک دوسرے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر ہم تھوڑی دیر کے لئے چپ سے ہو گئے۔ میں لہروں کی آواز میں گم ہو گیا اور میرا دوست کچھ سوچنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں کے بیچ یہ بات‌چیت ہوئی۔

''رسول! میں تم سے ایک اہم معاملہ میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے وعدہ کرو کہ یہ باتیں تم اپنے ہی تک رکھوگے!،،

میں نے وعدہ کرلیا۔

''تم تو جانتے ہی ہو کہ ہماری تات قوم بہت چھوٹی ہے۔،، میرے دوست نے گفتگو شروع کی۔ ''اس قوم میں میری

اور میری شاعری کی کافی گنجائش نہیں ہے۔ تم نے ٹھیک ھی کیا جو ماسکو میں اپنے سامعین ڈھونڈھ لئے۔ میں بھی یہی کرنا چاھتا ھوں، ماسکو میں بسنا چاھتا ھوں مگر مشکل یہ ہے کہ وھاں میرا کوئی نہیں، نہ دوست ھیں، نہ رشتےدار، نہ شناسا، نہ ھی ٹھہرنے کی کوئی جگہ۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر میں اپنی نئی کتاب سے ملنےوالا معاوضہ لے کر ماسکو چلا جاؤں تو کیا مجھے ٹھہرنے کے لئے کوئی جگہ مل جائےگی؟،،

''کیوں نہیں! جیب میں پیسے ھوں تو ھر وقت کوئی کمرہ کرائے پر مل سکتا ہے۔،،

''تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ پوچھنا یہ ہے کہ کیا وھاں مجھے کوئی عورت مل جائےگی، جسے بیوی بنا سکوں؟ مجھے بیوی چاھئے، بوڑھی ھو، گناہ کی طرح بدصورت ھو، مگر صلاحیت والی ھو۔ میرا مقصد تو صرف یہ ہے کہ وہ میرے اشعار کا روسی میں ترجمہ کردے۔ ایک بار مجھے موقع مل جائے پھر میں سب کچھ ٹھیک کر لونگا۔ اگر ایسا نہ ھوا تو میری صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ جائینگی اور میری شاعری اپنی قوم کے تنگ و تاریک کنویں میں گھٹ کر رہ جائےگی۔،،

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ۲۰ سال کی عمر، گٹھا ھوا جسم، قفقاز کے علاقے کا زندگی اور شباب سے بھرپور نوجوان۔ بڑے بڑے ھاتھ انگلیوں تک بالوں سے بھرے، سینے کے بال اتنے سخت جیسے کانٹے ھوں، گندمی رنگ کے تنومند چھرے پر جھیلوں جیسی گہری اور نیلے رنگ کی آنکھیں اور سر ساھی جیسا تھا۔ موٹے ھونٹ، چمکتے ھوئے سفید دانت، شہتیروں کی طرح بھاری اور ٹھوس پیر، پورا بدن رگ‌پٹھوں سے بھرا ھوا، فطرت کا ایک اچھوتا شاھکار۔ ایسے سجیلے جوان کو لکھوکھا انسانوں کے اس شہر میں بیوی ملنے میں کیا قباحت ھوگی، اور وہ بھی جنگ کے صرف تین سال بعد۔ یہ سوچ کر میں نے اس سے کہا:

''بس کسی سڑک کے بیچوں‌بیچ کھڑے ھوکر سیٹی بجاؤ۔ ھر طرح کی بیویاں تمہاری طرف دوڑتی ھوئی آئینگی۔،،

میرا دوست بچوں کی طرح کھکھلا پڑا۔ وہ اٹھا اور قلابازی کھاتا سمندر کی طرف دوڑا۔ سمندر میں کودنے سے پہلے اس نے میری طرف مڑ کر پوچھا:

''تمھاری کیا رائے ہے، ماسکو ٹرین سے جاؤں یا ہوائی جہاز سے؟''

چھ ماہ بعد اپنی ہیٹ پر جمی ہوئی برف صاف کرتا ہوا میں چوتھی منزل پر واقع ''ینگ گارڈ'' اشاعت گھر کے دفتر میں جانے کے لئے سیڑھیاں طے کر رہا تھا کہ ادھر سے وہی تات شاعر آتا نظر آیا جس نے اس دن کیسپین کے کنارے میری دعوت کی تھی، بغل میں ایک بیگ دبائے ہوئے جو خاصا بڑا تھا۔ سب سے پہلے جس چیز پر میری نظر پڑی وہ یہ تھی کہ عام ادیبوں کی طرح بیگ ہاتھ میں لٹکانے کے بجائے وہ کسی محاسب فروش یا خزانچی کی طرح اسے بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ ان چھ مہینوں میں اس کے یہاں نمایاں تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ اس کی کانٹے جیسی لٹیں بڑھ گئی تھیں اور بیچ میں بڑی صفائی کے ساتھ مانگ نکلی ہوئی تھی۔ چھنگلی کا ناخن کافی بڑھا ہوا تھا اور اتنا نوکیلا تھا جیسے سنگین کی نوک ہو۔ ایک دوسری انگلی میں انگوٹھی تھی جس پر کوئی قیمتی پتھر جڑا ہوا تھا۔ گلے میں ٹائی کی جگہ بھونرے کے پروں جیسی کوئی چیز ٹنگی ہوئی تھی۔ بڑی آن بان اور بڑی تڑک بھڑک تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے صاحب سلامت کی۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میری ٹائی درست کی جو یقیناً میری لاپرواہی کا شکار تھی، میں نے اس زحمت کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

احمد نے مجھے اپنی بیوی سے ملایا۔

''آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی تین انگلیاں بڑھا دیں۔

ہمارے یہاں داغستان میں عورتوں کے ہاتھ کا بوسہ لینے کا رواج نہیں، اس لئے میں نے انگلیوں کو ذرا سا دبا دینے پر اکتفا کی، مگر اس نے ایسی چیخ ماری جیسے میں نے اس کے ہاتھ کی ساری ہڈیاں توڑ دی ہوں۔

''معاف کیجئے! میں پہاڑوں کا رہنےوالا گنوار آدمی ہوں... آپ کو تکلیف دینا میرا مقصد نہ تھا...''

''اب تو آپ کو تھوڑی بہت تہذیب سیکھ ہی لینی چاہئے۔'' اس نے بڑے غصے میں کہا اور آئینے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بڑی دیر تک آئینے میں منھ بناتی رہی، غالباً اس کوشش میں تھی کہ شاید اس طرح اس کا چہرہ کچھ بہتر لگنے لگے۔

جی ہاں۔ وہ بوڑھی بھی تھی، بدصورت بھی، اور چہرے پر اتنا پاؤڈر تھوپے ہوئی تھی کہ اس کی مدد سے اوسط درجے کے ایک کمرے میں سفیدی ہو سکتی تھی۔ مجھے اس وقت ابوطالب بےطرح یاد آئے، کاش وہ ساتھ ہوتے، ہمیں اس عورت کے بارے میں مناسب اور چست جملہ مل جاتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ لومڑی اور اس کی دم سے زیادہ چالاک کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ لیکن اس روپہلی لومڑی سے زیادہ بیوقوف کون ہو سکتا ہے جس کی کھال اس چڑیل کے کالر میں لگی ہوئی تھی۔ وہ ذرا دیر کو رک کر ایک رسالہ خریدنے لگی اور یوں احمد کو اور مجھے تنہائی کا موقع مل گیا۔

''کہو دوست! کیا حال ہے، کیسی گذر رہی ہے؟''

''مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں پھنسا ہوں اور مجھے چکی میں جوت دیا گیا ہے۔ میری بیوی میری بھی دیکھبھال کرتی ہے اور میرے کام کی بھی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کتنی پڑھیلکھی اور کتنی چاق و چوبند ہے۔ وہ بلوک اور مایاکافسکی کی دوست رہ چکی ہے اور سرگئی ایسینن کے ساتھ بھی اس کی یاداللہ تھی۔ وہ پیرس میں رہ چکی ہے اور بڑی خوبصورت انگریزی بولتی ہے۔ ہمارے پاس چار کمروں کا اپنا مکان ہے۔ بچے کوئی نہیں، بس جاپانی نسل کا ایک کتا ہے توشیک، جو بلی کے بچے کے برابر ہے۔''

''واقعی! تم خوش قسمت نکلے، وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ اب بتاؤ کدھر کا ارادہ ہے؟''

''بات یہ ہے کہ میں نے بچوں کے رسالے ''موورزیلکا'' کو کچھ نظمیں دی تھیں، ان لوگوں نے کہا کہ یہ نظمیں بچوں کے لئے بھاری پڑینگی۔ میں نے سوچا کہ انہیں ایک ایسے رسالے

کو دوں جو پنچائتی فارم کے نوجوان کارکنوں کے لئے نکلتا ہے۔ چنانچہ جب میں نے ان لوگوں سے گفتگو کی انہیں یہ نظمیں پسند آئیں، بس وہ لوگ اتنا چاہتے ہیں کہ میں ان میں ایک مصرعے کا اضافہ کردوں جس میں ''کولخوز،، کا لفظ آجائے۔ آج شام ہی کو میں یہ کام کر لونگا اور پھر نظمیں ان لوگوں کے حوالے کر دونگا... رسول! زندہ رہنے اور کام کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ میری بیوی کہتی ہے کہ بچوں کو پیروں سے چلنا سیکھنا ہے تو انہیں گھٹنیوں چلنا ہی پڑتا ہے۔ وقت آنے پر میں اپنا اصل کام انجام دینے لگونگا۔ ،،

اسی درمیان اس کی بیوی لوٹ آئی اور اس نے میرے دوست کو اس طرح پکارا جس میں محبت بھی تھی اور تقاضہ بھی، اس نے کہا: ''الیوشا! چلو۔ توشیک کو کھانا دینے کے بعد ہم لوگوں کو ''کروکودیل،، اور ''رابوتنتسا،، رسالوں کے دفاتر بھی جانا ہے۔ ،،

اس کے بعد عرصے تک احمد سے میری ملاقات نہ ہو پائی۔ ایک دن مجھے اس کا خط ملا جس میں فرمائش کی گئی تھی کہ میں اس کے لئے بلخاری انداز کی ایک صراحی بنوا دوں جس پر یہ الفاظ نقش ہوں: ''میری پیاری بیوی کے لئے،،۔ میں نے صراحی بننے کا آرڈر دے دیا اور یہ سوچا کہ شاید اس کی بیوی نے اس کے لئے جو کچھ کیا ہے اس پر اسے احسان مند ہونا ہی چاہئے۔ اب اس کی نظموں کے ترجمے کبھی ''مورزیلکا،، میں چھپتے، تو کبھی ''پائنیر،، اور ''کروکودیل،، میں۔ البتہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ نظمیں مخاچ‌قلعہ سے اس کی اپنی زبان تات میں شایع ہوئی ہوں۔ کئی بار ہم نے اس سے درخواست کی کہ ہمیں اپنی تخلیقات بھیجے مگر کبھی اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

اس ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے سے ۱۵ برس تک نہ مل سکے۔ اس بار ہماری ملاقات ماسکو میں داغستانی فنون لطیفہ کے ایک میلے میں ہوئی جس میں ہمارے چالیس شعراء نے شرکت کی تھی۔ مختلف زبانوں میں ہماری نظمیں ستونوں‌والے ہال میں،

کریملن تھیٹر میں، ایک موٹر ساز کارخانے میں اور کانتیمیرووسکایا کارڈز دستے میں سنی گئیں۔

میلے کے آخری پروگرام کے دوران میرا تات دوست بڑی خاموشی کے ساتھ اسٹیج کے پیچھے چلا آیا تاکہ ہم سے بات کر سکے۔

"رسول!"، اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔ "مجھے اپنے ساتھ داغستان واپس لے چلو۔ میں ایک کردیوک (دنبے کی چکی جیسی دم) حاصل کرنے کا خواھشمند تھا مگر اس کے بدلے اپنی دبلی پتلی دم سے بھی محروم ھو گیا ھوں۔"

اور یوں وہ داغستان واپس آگیا۔ لیکن کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے نہ وہ اپنے پاندور سے نغمہ پیدا کر سکا اور نہ ھی اس پر گیت گا سکا۔ اب وہ ایک ایسی صراحی کی طرح تھا جس میں شگاف پڑ گیا ھو اور جس سے ساری شراب بہہ گئی ھو۔ آپ شگاف بند کرنے کی لاکھ کوششیں کریں شراب کا رسنا بند نہیں ھوتا اور ساری شراب بہہ جاتی ھے۔

مختصراً یوں کہا جائے کہ کوئی مترجم یہ نہیں کرسکتا کہ عدم‌صلاحیت کے باوجود کسی کی صلاحیت بڑھا دے۔ بعض لوگ کہتے ھیں کہ سلیمان استالسکی کو ایفندی کاپیئف نے جنم دیا۔ دوسروں کا کہنا ھے کہ ایفندی کاپیئف سلیمان استالسکی کی پیداوار تھے۔ لیکن واقعہ یہ ھے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ صاحب صلاحیت تھے۔ ایفندی کی صلاحیت نے ایفندی کو بنایا اور سلیمان کی صلاحیت نے سلیمان کو۔

میں ایزیا سے کہہ دونگی۔ اب میں جو کہانی بیان کرنے جا رھا ھوں، اس کے لئے مناسب ترین عنوان میرے خیال میں یہی ھے۔

آوار ٹیچرز کالج میں جو لوگ میرے ساتھ پڑھتے تھے ان میں آج کے مشھور داغستانی ادیب محمد سلیموف بھی شامل تھے۔ بچپن سے ھی ان میں گوناگوں صلاحیتیں تھیں۔ وہ بڑی اچھی تصویریں بناتے، بڑے اچھے عوامی رقاص تھے اور شعر کہتے تھے۔ انہیں پشکن کی طویل نظم "ایوگینی اونیگن"، دیوانگی کی حد تک پسند تھی۔ یہ کتاب ھر وقت ان کے ھاتھ میں رھتی اور تقریباً پوری نظم انھوں نے رٹ لی تھی۔ طالب‌علمی کے دور

میں بھی وہ آوار میں اسے ترجمہ کرنے کا خواب دیکھا کرتے۔ پھر جب انہیں محاذ جنگ پر جانا پڑا تو وہاں بھی وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

جنگ ختم ہوئی تو وہ ماسکو کے ایک فوجی اسپتال میں داخل تھے۔ گولیوں اور بم کے ٹکڑوں نے ان کا جسم چھلنی کر دیا تھا۔ اسپتال ھی میں ان کی ملاقات ماسکو کی ایک لڑکی سے ہوئی جس کا نام والیا تھا۔ زخم ٹھیک ھو گئے تو انہوں نے والیا سے شادی کرلی اور ماسکو میں ھی بس گئے۔

میں جب تعلیم کی غرض سے ماسکو آیا تو میں نے اطلاعاتی بیورو کی مدد سے ان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جس طرح میں ان کی کمی محسوس کرتا رھا تھا اسی طرح انہیں بھی میری کمی محسوس ہوتی رھی تھی۔ چنانچہ ھم دونوں ایک دوسرے سے خاصے جذباتی انداز میں دوستانہ محبت کا اظہار کرتے رہے۔ والیا نے ھماری اس جذباتیت کا برا نہیں مانا۔ وہ بھی ھمارے ساتھ خاصی دیر تک بیٹھی۔ ھم تیز شراب پیتے رہے۔ محمد نے مجھے جنگ کے قصے سنائے اور میں انہیں داغستان کی حالت بتاتا رھا، پہاڑوں اور اپنے آبائی گاؤں کا ان سے تذکرہ کرتا رھا۔ میں نے انہیں نظمیں سنائیں، اپنی بھی اور داغستان کے دوسرے نوجوان شاعروں کی بھی۔ پھر میں نے محمد سے پوچھا کہ اب ان کا ارادہ کیا ہے۔

''میں نے اس مسئلہ پر بہت سوچا۔ مگر والیا کی ایک پھوپھی ھیں اور ان کے ایک عزیز ھیں ایزیا اور یہ ایزیا ماسکو میں خاصے اھم آدمی ھیں۔ چنانچہ جب والیا کی پھوپھی نے میری پریشانی دیکھی تو انہوں نے کہا: 'محمد! تم کیوں دماغ کھپا رہے ھو؟ میں ایزیا سے کہونگی اور سارا کام چٹکی بجاتے ھو جائے گا۔' اور ھوا بھی یہی، ایزیا نے میرے لئے ایک ملازمت کھوج دی، یہ جگہ سائنسوں کی اکادمی میں مل گئی ہے اور اس وقت میں وھیں کام کررھا ھوں۔''

''مگر تمہاری مصوری کا کیا حال ہے؟''

''جنگ نے گولیوں کے ذریعے میرے پورے جسم پر نقش و نگار بنا دئے ھیں اور میرے خیال میں یہی بہت کافی ہے۔''

"اور تمہاری شاعری؟"

"رسول! وہ سب تو بچپن کی بات تھی۔ اب میں ایک سنجیدہ اور باشعور انسان ہوں، اب مجھے مردوں کا کام کرنا چاہئے۔"

"اچھا تو "ایوگینی اونیگن" کا کیا بنا؟"

انہوں نے نظر ملائی تو یوں لگا جیسے سارا درد نظروں میں سمٹ آیا ہو۔ ظاہر ہے میں نے ان کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔

"تو تم داغستان کیوں نہیں آ جاتے؟"

"سوال یہ ہے کہ والیا کا کیا ہوگا؟"

"اسے بھی اپنے ساتھ لاؤ!"

"گاؤں کے علاوہ میرا کوئی اور مکان نہیں۔ میں وہاں والیا کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ والیا اور اماں ایک دوسرے سے باتیں بھی نہیں کر سکتیں۔ کیا تمہاری رائے یہ ہوگی کہ ہم اپنے ساتھ ایک مترجم بھی لے کر جائیں تاکہ والیا اماں کی بات سمجھ سکے اور اماں والیا کی؟"

محمد کو تکلیف پہنچانےوالے اس موضوع کو بدلنے کے لئے میں نے محمد، والیا اور "ایوگینی اونیگن" کا جام‌صحت تجویز کیا۔

دوسری بار جب میں محمد سے ملنے گیا تو والیا نے بتایا کہ وہ کافی بدل گئے ہیں۔ اب وہ کئی کئی دن، فرصت کے ایک ایک لمحے میں، کھانا، سونا اور آرام کرنا سب کچھ بھول کر صرف لکھتے جاتے ہیں، پھاڑتے جاتے ہیں اور یہ چکر خاصی دیر تک چلتا رہتا ہے۔

والیا کی پھوپھی نے کچھ دنوں ان کا یہ حال دیکھا، پھر یہ جاننا چاہا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں اور ایسا کیوں ہے کہ اپنا لکھا آپ ہی میٹتے بھی جاتے ہیں۔

"بات یہ ہے کہ میں شاعر بننا چاہتا ہوں، "ایوگینی اونیگن" کا ترجمہ کرنا چاہتا ہوں۔" محمد نے جواب دیا۔

"تو اس میں پریشان ہونے اور خود کو ھلکان کرنے کی کیا بات ہے؟ میں ایزیا سے کہونگی اور وہ چٹکی بجاتے سب کچھ کر دے گا۔"

''نہیں، پیاری پھوپھی! مجھے شاعر نہ ایزیا بنا سکتے ہیں، نہ ان کے چیف اور نہ ہی ان کی بیوی۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ تنہا میں ہی کر سکتا ہوں۔''

اس کے کچھ ہی دن بعد محمد نے مجھے ''ایوگینی اونیگن'' کے پہلے باب کا آوار زبان میں ترجمہ سنایا۔ تین سال بعد یہ عظیم بیانیہ نظم پوری کی پوری آوار زبان میں چھپ گئی اور آوار قوم کے سارے افراد کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔

کس کی تصویر چھاپی جائے؟ لوگ کہتے ہیں کہ اگر بیوی تیز ہو تو وہ دنیا میں اپنی جگہ بنانے میں شوہر کی بڑی مدد کر سکتی ہے۔ جی ہاں! میں بھی ایک ایسی بیوی سے واقف ہوں۔ ہمارے ایک شاعر بھی، جو داغستان میں خاصے مشہور ہیں ایک ایسی ہی بیوی کے شوہر ہیں۔ ادیبوں کی یونین، سارے اشاعت گھر اور اخبارات کے دفاتر ان خاتون کے نام سے کانپتے ہیں۔ میں بھی ان سے خاصا ڈرا ڈرا سا تھا اور ان سے بچنے کےلئے میں نے اپنے دفتر میں ان کے شوہر کی تصویر ٹانگ رکھی تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ انہیں اس سے خوشی ہوگی اور میرے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار رہینگے۔ مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ میرے دفتر میں ان کے شوہر کی ٹنگی ہوئی تصویر کے ذریعے یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک آدھ کوپک زیادہ مل جائے۔

ایک بار ان خاتون نے مطالبہ کیا کہ اشاعت گھر کو کسی تاخیر کے بغیر ان کے شوہر کی نظموں کا مجموعہ شایع کرنا چاہئے۔ منیجر نے بڑی نرمی کے ساتھ انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ سال کا اشاعتی منصوبہ طے ہو چکا ہے اور اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ پھر کاغذ کی بھی کمی ہے، بہر حال اگلے سال کچھ نہ کچھ کیا جا سکتا ہے...

''بےشرم کہیں کے! شرم نہیں آتی تم کو!'' عورت غصے میں چیخی۔ ''تم ڈرتے ہو کہ اگر میرے شوہر کا مجموعہ چھپ گیا تو لوگوں کو معلوم ہو جائےگا کہ وہ تم سے بہتر شاعر ہے اور اسی لئے کاغذ کی قلت اور منصوبوں وغیرہ کی

من گھڑت سنا رہے ہو ۔ مگر میں تمہارے چکمے میں نہیں آ سکتی، مجھے دھوکہ دینا بہت مشکل ہے ۔ تمہیں میرے شوہر کا مجموعہ چھاپنا پڑے گا ۔ ،،

اور یہ کہتی وہ اشاعت گھر سے بڑے غصے میں باہر نکل گئی ۔

دو گھنٹے بعد منیجر کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی، علاقائی پارٹی کمیٹی کے سکریٹری بول رہے تھے :

''خدا کے لئے کسی طرح اس عورت کو یہاں آنے سے روکو ! میں میز پر لگا شیشہ کتنی بار بدلواؤں؟ ابھی ابھی اس نے مکے مار کر نیا شیشہ پھر توڑ دیا ۔ ،،

آپ جانتے ہیں ہوا کیا؟ لیو تالستائی کی کتاب ''حاجی مراد،، اور حمزہ سداسا کی بچوں کی ایک کتاب کی اشاعت کا پروگرام منسوخ کرنا پڑا اور ان دونوں کتابوں کی جگہ اس کے شوہر کا مجموعہ چھاپا گیا ۔

کیا آپ سمجھتے ہیں ہمیں نجات مل گئی ہوگی؟ جی نہیں ! اب ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ بات یہ تھی کہ مجموعے میں شاعر کی تصویر شامل نہ تھی ۔

''بدبختو ! میں جانتی ہوں تم لوگوں نے تصویر محض اس لئے شایع نہیں کی کہ کہیں لوگ یہ نہ دیکھ لیں کہ میرا شوہر تم سب سے زیادہ خوبصورت ہے ۔ ،،

''جی نہیں! بات یہ ہے کہ ہم اس کا فیصلہ نہ کر سکے کہ تصویر شایع کس کی ہو، آپ کے شوہر کی یا آپ کی ۔ ،، منیجر نے جواب دیا ۔

عورت نے مسکراتے ہوئے کہا : ''کون جانے؟ میں نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی شاعر ہی نہ بن پاتا ۔ ،،

ابوطالب اور حاتمت کی کہانی ۔ ابوطالب نے کام کا آغاز چرواہے کی حیثیت سے کیا تھا ۔ پھر بعد میں انہوں نے برتنوں کی مرمت کا کام شروع کردیا، لیکن چرواہے کی بانسری ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹی ۔ وہ اپنے نئے کام کے سلسلے میں گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے اور جب بھی فرصت ملتی بانسری سے اپنا جی

بہلایا کرتے۔ انہیں دنوں کسی گاؤں میں ان کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، کچھ لوگ کہتے ہیں یہ کولی نامی گاؤں کا واقعہ ہے اور کچھ اسے کوسوخی گاؤں کا قصہ بتاتے ہیں۔ ہوا یہ کہ حاتمت نام کی ایک دوشیزہ اپنا ٹوٹا گگرا لے کر ان کے پاس آئی۔

ابوطالب نے گگرے کی مرمت میں خاصا وقت لگایا۔ کبھی وہ اسے ایک طرف رکھ کر تمباکو پینے لگتے، کبھی بانسری پر کوئی دھن بجانے لگتے، اور کبھی حاتمت کو ادھر ادھر کے قصے سنانے لگتے جن میں کچھ سچے ہوتے کچھ جھوٹے۔

حاتمت چاہتی تھی کہ یہ کام جلدازجلد پورا ہو جائے، چنانچہ اس نے کہا:

''کم سے کم اتنا تو ہو ہی سکتا ہے کہ تم سگریٹ کچھ کم لمبی بناؤ!،،

''حاتمت! یہ نہیں ہو سکتا، میں تو اب ایک گز لمبی سگریٹ بناؤں گا...،،

آخر حاتمت نے جب بہت اصرار کیا اور وہ ناراض ہونے لگی تو ابوطالب نے گگرا ٹھیک کر دیا۔ گگرا نیا جیسے چمک رہا تھا۔ ظاہر ہے ابوطالب نے اس کی مرمت میں کافی محنت کی تھی۔ لیکن حاتمت نے جیسے ہی گگرے میں پانی بھرا وہ پھر ٹپکنے لگا۔ وہ غصے میں روتی دھوتی پھر ابوطالب کے پاس آئی۔

''یہ دیکھو! ایک تو تم نے مرمت میں اتنا وقت لگایا، پھر بھی اس کا ٹپکنا بند نہیں ہوا اور اب تو یہ پہلے سے زیادہ ٹپک رہا ہے۔،،

''خدا کرے بہادر اور خوبصورت نوجوان ہر دن تیرے گگرے پر پتھر برساتے رہیں! حاتمت! خفا نہ ہو! میں نے جان بوجھ کر ایک سوراخ چھوڑ دیا تھا تاکہ تم پھر آؤ! اور میں دوبارہ تمہارے درشن کر سکوں۔،،

''خدا کرے جو پتھر برسنے ہیں وہ میرے گگرے پر نہیں، تیرے سر پر برسیں۔،، یہ کہتی حاتمت اپنی راہ چل دی اور ابوطالب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

ابوطالب فراق میں کڑھتے رہے۔ ان کے دل میں حاتمت کی محبت کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ درد جتنا بڑھتا جاتا ان کی تڑپ میں

بھی اتنی ہی شدت آتی جاتی۔ درد و کرب کے اس عالم میں انہوں نے ایک نظم لکھی، حاتمت اور اپنی محبت کے بارے میں۔ پھر ایک اور نظم لکھی، پھر دسویں اور بیسویں کی نوبت آئی اور یوں برتنوں کی مرمت کرنے والے ابوطالب ایک مشہور شاعر بن گئے۔

حاتمت نے اسی زمانے میں حاجی نامی ایک نوجوان سے شادی کرلی۔ بعد میں اس نے طلاق لے کر ایک دوسرے نوجوان موسی سے شادی کی۔

ایک دن مشہور شاعر ابوطالب بازار سے گذر رہے تھے کہ کسی نے انہیں آواز دی:

''اے، ابوطالب! کیا اب تم میرے گگرے کی مرمت نہیں کروگے؟،،

ابوطالب نے مڑکر دیکھا۔ حاتمت کھڑی تھی، بوڑھی، کمزور اور بیمار۔

''شاید اب تمہیں غرور ہو گیا ہوگا۔ ہونا بھی چاہئے! سوویت کے رکن ہو اور حکومت کا اعزاز تمہارے سینے کی زینت ہے۔ اور پھر تم نے برتنوں کی مرمت کا کام بھی چھوڑ دیا ہوگا؟ مگر یہ نہ بھولو کہ یہ میں تھی جس نے تمہیں شاعر بنا دیا۔ اگر میں اس دن اپنا گگرا ٹھیک کرانے تمہارے پاس نہ آتی تو تم آج بھی بازار کی کسی دکان پر بیٹھے لوگوں کے برتنوں کی مرمت کر رہے ہوتے۔،،

''حاتمت! اگر واقعی تم میں اتنی طاقت ہے اور تم لوگوں کو واقعتاً شاعر بنا سکتی ہو تو پھر تم نے اپنے پہلے شوہر حاجی کو شاعر کیوں نہیں بنا لیا؟ اسی طرح ایسا کیوں ہے کہ تمہارے نئے شوہر موسی کا ایک شعر بھی لوگوں نے آج تک نہیں سنا؟،،

ابوطالب یہ کہکر آگے بڑھ گئے۔ حاتمت حیران پریشان کھڑی سوچتی رہی کہ جواب کیا دے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے ہوش و حواس رخصت ہو گئے۔ آخر بارش کی ایک بوند اس پر پڑی اور تب جاکر وہ ہوش میں آئی۔

بات یہ ہے کہ انسان کو شاعر بنا دینے کی قدرت کسی میں نہیں ہوتی، بس وہ خود ہی اپنے آپ کو شاعر بنا سکتا ہے۔

ابا نے ایک بار یہ قصہ سنایا کہ جس زمانے میں میری ابتدائی نظمیں شایع ہوئی تھیں ان کے ایک دوست نے جو اپنی بزرگی کی وجہ سے داغستان‌بھر میں مشہور تھے اور جن کا بڑا احترام کیا جاتا تھا، ان سے کہا تھا:

"اس وقت محبت میں مبتلا ہو جانا رسول کے لئے بےحد مفید ہوگا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ محبت اس کو خوشی دے یا غم، اور نہ ہی اس سے کہ محبت کی یہ آگ دوسری طرف بھی لگی ہو۔ بلکہ بہتر تو یہ ہوگا کہ اس کی محبت ناکام رہے اور اس کے لئے محض سوز و گداز اور درد و تڑپ کی باعث ہو، کیوں‌کہ اس طرح کی محبت پلک جھپکتے اسے عظیم شاعر بنا دےگی۔"

انہوں نے تو ایک ایسی نوجوان اور خوبصورت لڑکی تلاش بھی کرلی تھی جو مجھے محبت میں ناکامی کی اذیت میں مبتلا کرتی اور یوں مجھے شاعر بنا دیتی۔

لیکن ابا نے اپنے دوست سے کہا:

"دنیا میں ہزارہا نوجوان محبت کرتے ہیں۔ کیا وہ سب شاعر بن جاتے ہیں؟ شدید محبت کےلئے بھی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالباً محبت کے لئے صلاحیت اس سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے جتنی صلاحیت کے لئے محبت کو حاصل ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ محبت صلاحیت کو پروان چڑھاتی ہے، مگر اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ یہی حال نفرت کا بھی ہے، یعنی اس جذبے کا جو محبت کی ضد ہے۔"

"مگر محبت کے مغنی محمود کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"محمود جس طرح کے شاعر بنے اس طرح کا شاعر بنانے میں یقیناً ان کی محبوبہ کا ہاتھ تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ ان کی محبوبہ کا وجود ہوتا یا نہ ہوتا محمود ایک عظیم شاعر ضروری بنتے۔ ان کی متجسس اور باغی روح اظہار کا کوئی نہ کوئی ذریعہ نکال لیتی بالکل اسی طرح جس طرح گھاس کے نازک پودے

تاریک، دم گھٹا دینے والی سخت زمین کو توڑ کر سورج کی طرف سر اٹھانے کا راستہ نکال لیتے ھیں۔ آپ نے دیکھا ھوگا کہ سخت چٹان کے نیچے سے بھی گھاس کے پودے ابھر آتے ھیں۔ ''

اس بات سے مشکل ھی سے اختلاف کیا جا سکتا ھے کہ جس طرح خشک لکڑی آگ کی غذا ھے اسی طرح انسانی جذبات کی شدت صلاحیت کو ھوا دیتی ھے، وہ چاھے محبت کے جذبات ھوں چاھے نفرت کے۔ اور شاعری میٹھی مسکراھٹوں اور تلخ آنسوؤں کی دین ھوتی ھے۔ لیکن میں جو بات کہنی چاھتا ھوں وہ ان دو مثالوں سے اچھی طرح واضح ھو جاتی ھے۔

دنیا میں کونسا غم اس ماں کے غم کا مقابلہ کر سکتا ھے جو اپنے بیٹے سے ھاتھ دھو بیٹھی ھو؟ تجہیز و تکفین کے لئے ایک دنیا جمع ھے لیکن ماں خاموش ھے، البتہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک دریا رواں ھے۔ اس میں اتنی قدرت نہیں کہ وہ الفاظ میں اپنے غم کو سموسکے اور اس طرح اظہار کر سکے کہ دوسروں کی آنکھیں بھی برس پڑیں۔

پھر پیشہ‌ور بکائیاں وھاں پہنچتی ھیں۔ ان کی آنکھیں خشک ھیں کیونکہ غم ان کا نہیں کسی اور کا ھے۔ پھر بھی جیسے ھی وہ اپنے ھیبتناک فن کا مظاھرہ شروع کرتی ھیں اردگرد کے لوگ رونا شروع کر دیتے ھیں۔

میں نے ان کے فن کو ھیبتناک کہا ھے کیونکہ اس میں بیرحمی کا بڑا دخل ھے۔ غالباً اسی لئے اسلام میں کہا گیا ھے کہ پیشہ‌ور بکائیاں بھی ریاکاروں، دغابازوں اور افتراپردازوں کے ساتھ دوسری دنیا میں جہنم میں جلائی جائینگی۔ لیکن ایسے فن کا کیا کیا جا سکتا ھے جس کا واحد مقصد لوگوں کو رلانا ھو؟

اس کے برعکس ان والدین کی مسرت کا مقابلہ کونسی مسرت کرسکتی ھے جن کا بیٹا جوان ھو چکا ھو اور اس کی شادی کا وقت آ گیا ھو؟ شادی کا موقع یقیناً خوشی کا موقع ھوتا ھے۔ اس موقع پر لوگ ناچتے بھی ھیں اور گاتے بجاتے بھی ھیں۔ دولھا کے ماں‌باپ کی مسرت کا مقابلہ یقیناً دوسروں کی مسرت نہیں کر سکتی لیکن کیا وہ اپنی اس مسرت کا اظہار ان الفاظ میں یا کسی

ایسے گیت کی شکل میں کر سکتے ہیں جس سے جمع ہونےوالے سارے لوگ مزہ لے سکیں اور یہ محسوس کر سکیں کہ یہ شادی ان کی نہ ہونے کے باوجود ایسی لگتی ہے جیسے انہیں کی ہو؟

ظاہر ہے یہ ان کے بس میں نہیں، اسی لئے والدین گاؤں گاؤں کی خاک چھان کر ایسے گانےوالوں کو جمع کرتے ہیں جو شادی کی تقریب میں جان ڈال دیں۔ گانےوالے آتے ہیں کل انہوں نے کسی اور کی شادی میں گیت گائے تھے اور جب کل آئےگا تو وہ کہیں اور یہی گیت گا رہے ہونگے۔ ان کے لئے ساری شادیاں برابر ہیں۔ مگر یہ ان کی صلاحیت ہے جو لوگوں کے دل خوش کرتی ہے اور انہیں ہنسنے ہنسانے کا موقع دیتی ہے۔

تو غالباً زندگی کا مجموعی تجربہ فن کو پروان چڑھاتا ہے؟ کیا ایسا ہے کہ فن کی صورت میں صلاحیت کا ہر اظہار پیچیدہ مقدرات اور عظیم‌الشان کارناموں کے وسیع اور ہمہ‌گیر ادراک کا نتیجہ ہے؟

اگر یہ صحیح ہے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ چودہ سال کا ایک آوار لڑکا جو پیدائشی اندھا ہو اپنے پاندور کی موسیقی کے ذریعے آوارستان کے دیہاتوں میں کھلبلی مچا دیتا ہے؟

اسی طرح ایک اور لڑکا محمد رجبوف جو بچپن سے بیمار اور چلنے پھرنے سے معذور ہے اپنی ماں کے بارے میں ایک ایسا گیت لکھ دیتا ہے جسے پورا آوارستان دھراتا ہے؟ اس گیت کے لئے موسیقی احمد سربیلوف نے تیار کی تھی جن کے پیر مفلوج ہیں۔ کبھی میں نے ان کے بارے میں لکھا تھا:

تمہارے ساز میں گو آٹھ تار ہیں لیکن
ہر ایک تار سے، صدھا دھنیں نکلتی ہیں...

صلاحیت رکھنےوالا اندھا آدمی اس آدمی سے کہیں زیادہ دیکھتا ہے جس کے پاس آنکھیں تو ہوں، مگر صلاحیت سے محروم ہو۔ کہا جاتا ہے کہ بیوقوف دنیا کی خاک چھاننے کے بعد جو کچھ دیکھتا ہے، عقلمند اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اس سے کہیں زیادہ دیکھ لیتا ہے۔

اس سے بڑی بات یہ ہے کہ نابینا محمد بازار میں کھڑے ہوکر بھیک مانگا کرتا تھا مگر دن بھر کی بھیک کا حساب کرنے میں اس سے کبھی کوئی چوک نہیں ہوئی۔

اپنی نوٹ بک سے۔ اگر صلاحیت کا انحصار صرف بینائی پر ہے تو یہ کیسے ہوا کہ لیزغین شاعر کوچخورسکی اس کے بعد بھی گیت لکھتا رہا جب خان نے اس کی دونوں آنکھیں نکلوا لی تھیں؟ اگر صلاحیت کا تعلق دولت سے ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ لیزغین شاعر اتیم امین جو یتیم اور نادار تھا شہرت کے بام عروج تک پہنچا؟ اگر صلاحیت کا راز تعلیم ہے تو مجھے بتائیے کہ سلیمان استالسکی کو عوامی شاعر کی حیثیت سے اس قدر شہرت کیسے حاصل ہوگئی؟ وہ تو دستخط بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جب انہیں دستخط کرنا ہوتے تو وہ اپنی انگلی دوات میں ڈبو کر مطلوبہ جگہ پر اس کا نشان ثبت کردیتے۔ اگر صلاحیت وسیع مطالعہ اور علم و فضل کی دین ہے تو ایسا کیوں ہے کہ میرے واقف کاروں میں بہت سے عالم اور انتہائی پڑھے لکھے لوگ ہیں مگر ایک مصرعہ بھی اچھا نہیں لکھ سکتے؟

پہاڑوں میں دلچسپ مقابلوں کا بڑا رواج تھا۔ ان میں ایک طرف متعلم ہوتے یعنی وہ لوگ جو آوار لکھنا اور پڑھنا جانتے، دوسری طرف چرواہے، ناخواندہ لوگ جنہیں اپنے پیشے کے علاوہ کسی اور بات کی خبر نہ ہوتی۔ دونوں فریقوں میں شاعری کا مقابلہ ہوتا تو عام طور پر میدان چرواہوں کے ہی ہاتھ رہتا۔ تعلیم یافتہ مغنیوں کے نپے تلے سر ان گانوں کے سامنے ٹھہر نہ پاتے جو ہوا کی طرح آزاد تھے اور ہوا ہی کی طرح پہاڑوں کی سرسبز ڈھلوانوں پر ڈولتے پھرتے تھے۔

لیکن ایسے شعراء جن میں متعلم اور چرواہوں دونوں کی خصوصیات جمع ہوتیں ان دونوں گروہوں کو شکست دے دیتے۔ اگر محمود یا میرے والد حمزہ ان مقابلوں میں شریک ہوتے تو مقابلہ ان دونوں کے درمیان ہوتا دوسرے مغنیوں سے نہیں۔ دوسرے مغنی اس میدان میں میلوں پیچھے رہ جاتے۔

یا ہو سکتا ہے صلاحیت ذہانت کی دین ہو؟ لیکن ماسکو میں اور دوسرے ملکوں میں میں انتہائی ذہین لوگوں سے مل چکا ہوں۔ یہ ایسے لوگ تھے کہ اگر اچانک ان کی ذہانت اور دانشوری شاعری، ناول یا کہانی میں ڈھل جاتی تو فن کے نادر شاہکار جنم لے لیتے۔ لیکن کوئی ایسی چیز ہے جو ان کی شاندار عقل و دانش کو قلم کی نب سے پھسل کر کاغذ پر پھیلنے نہیں دیتی۔ اور یوں ان کی دانشمندی یا تو ہواؤں میں بکھر کر رہ جاتی ہے یا ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتی ہے۔

اس صورت کو دیکھتے ہوئے خیال آتا ہے کہ صلاحیت کا سرچشمہ غالباً کام ہے، محنت کا گاڑھا پسینہ ہے؟ کتنی بار میں نے یہ سنا ہے کہ صلاحیت بجائےخود کوئی چیز نہیں، بلکہ یہ تو ایک ایسی چیز ہے جو صبر آزما محنت کے ذریعے جنم لیتی ہے۔ اب رہی میری بات تو میں کسی شاخ پر آرام و سکون سے بیٹھی بلبل کے نغموں کو بھاری بوجھ ڈھونے والے گدھے کی چیخ پکار پر فوقیت دیتا ہوں۔

گانا وہ نہیں گاتا جو کوئی بھاری گاڑی کھینچ رہا ہوتا ہے، گانا وہ گاتا ہے جو اس گاڑی پر آرام سے بیٹھا ہوتا ہے۔

اوہ، میرے معبود! یہ دنیا بھی کتنی متضاد ہے۔ اگر گانا اس انسان کی کاہلی اور آرام‌طلبی کی دین ہے جو گاڑی پر بیٹھا ہوا ہے تو غالباً سارے ہی فنون لطیفہ کاہلی، فرصت اور آرام‌طلبی کا نتیجہ ہیں، مادی خوشحالی اور بےفکری کی دین ہیں؟

لیکن کیا ایسا نہیں ہے کہ تنگ و تاریک جھونپڑوں میں جنم لینےوالے گیت صاحبانِ ثروت کے عشرت کدوں میں بھی گونجتے ہیں؟ نوابوں اور امیروں کے بارے میں جتنی بھی کہانیاں لکھی گئی ہیں وہ غریبوں نے لکھی ہیں۔ شامخال نے ارچی کزاک کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا تھا۔ لیکن ارچی کزاک نے جلاوطنی میں بھی شاعری جاری رکھی۔ اور آج کومیک شامخال کے بارے میں ہماری جتنی بھی معلومات ہیں وہ ارچی کزاک کی نظموں سے اخذ کی گئی ہیں۔

جواں‌سال جارجیائی شاہزادے دیوید گورامی‌شویلی کو کوہستان کے باشندے اٹھا لے گئے تھے اور وہاں انہوں نے اونتسوکول کے ایک کھڈ میں اسے قید کر دیا تھا۔ اسی غلیظ کھڈ میں اپنے خوبصورت جارجیا کی یاد میں تڑپتے ہوئے اس شاہزادے نے نظمیں لکھنا شروع کیا۔

عائشہ جو حنزہ کے نواب کی بیٹی تھی ایک خوبصورت اور جواں‌سال چرواہے سے محبت کرنے لگی۔ باپ کو خبر ملی تو اس نے عائشہ کو گھر سے باہر نکال دیا۔ جاڑوں کی اس رات میں جب قیامت کی سردی پڑ رہی تھی اور راستوں پر گھٹنوں گھٹنوں برف جمی ہوئی تھی اور سرد ہوا کے تیز جھونکے اس کے معمولی لباس کو چھید کر اس کے بدن میں تیر کی طرح چبھ رہے تھے، عائشہ نے اپنا پہلا گیت لکھا۔

اور یوں ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ غالباً صلاحیت انسان کے دکھوں، اس کی اذیتوں اور اس کی غربت کی دین ہے؟ غالباً ایسا ہے کہ بدنصیبیاں اور رنج و غم ہی بہترین نغموں کے جنم‌داتا ہیں؟ شاعری تو کیا ہے اور کس چیز کی خواہاں ہے؟ تو نے بترائی کو اپنی قربت سے اس وقت نوازا جب وہ بوڑھا، مریض اور بھوکا انسان اپنے ٹھنڈے چولھے کے پاس بیٹھا تھا۔ تو نے محمود پر اس وقت نوازش کی جب وہ کارپیتھیا کی خندقوں میں شدید سردی سے جما جا رہا تھا اور اس کی محبوبہ جو اس کے لئے سورج بھی تھی اور دھرتی بھی، جو اس کے لئے سرمایہ‌حیات تھی کسی دوسرے انسان کے ساتھ بیاہ دی گئی تھی۔ تو نے ابوطالب پر اپنے دروازے اس وقت کھولے جب وہ عصا اور تھیلا لئے گاؤں گاؤں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا اور حاتمت نے اس کی محبت ٹھکرا کر کسی اور سے شادی کر لی تھی۔ تو نے اس وقت الداریلاف کی دلداری کی جب اس نے اپنے قاتلوں کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ نوش کر لیا۔ ظالم نائب زنتی نے انخیل مارین کے ہونٹ سلوا دئے تھے اور اسی وقت اس نے اپنا خوبصورت ترین گیت گایا۔ وہ گیت جس نے نائب سے زندگی بھر کے لئے اس کا سکون چھین لیا اور اس کی آنکھوں سے ہمیشہ کے لئے نیند اڑا دی۔

صلاحیت تو ہی بتا دے کہ تیرا راز کس چیز میں پوشیدہ ہے؟ تو ضمیر ہے، عزت ہے، حوصلہ ہے یا پھر خوف؟ ڈرپوک آدمی بھی جب رات کو کسی سڑک سے گذر رہا ہوتا ہے تو گاتا گاتا ہے اور اس طرح اپنے آپ میں ایک جرأت محسوس کرنے لگتا ہے۔

تو خوش‌قسمتی ہے یا بدقسمتی، انعام ہے یا سزا؟ تو وہ حسن ہے جس کی تخلیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس کے لئے دکھ جھیلیں یا وہ درد و کرب جو حسن کو جنم دیتا ہے؟ یا تیرا وجود زمانوں اور واقعات کا نتیجہ ہو؟ پتھر پر پتھر رگڑا جاتا ہے تو چنگاری جنم لیتی ہے۔ جنگ دنیا کی آبادی میں اضافہ تو نہیں کرتی البتہ سورماؤں کی تعداد ضرور بڑھا دیتی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ صلاحیت کیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح یہ نہیں کہہ سکتا کہ شاعری کیا ہے۔ لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ گھر واپس آتے ہوئے یا کسی بیرونی ملک میں، نیند کے دوران (گویا اپنی چادر اوڑھتے ہوئے) یا سبز گھاس پر قدم رکھتے ہوئے (جیسے جاندار سبزہ میرے اندر داخل ہو کر میری رگوں میں دوڑتا پھرتا ہو) کھانا کھاتے ہوئے، موسیقی سنتے ہوئے، اپنے خاندان کے ساتھ یا دوستوں کے ہنگامہ‌پرور حلقے میں بیٹھے ہوئے، کسی بچے کو گود میں یوں اٹھائے ہوئے جیسے اسے زندگی کی طویل راہوں پر قدم رکھنے کی مبارکباد دے رہا ہوں یا اپنے کسی دوست کے جنازے کو کندھا دے کر اسے اس کی ابدی آرام گاہ میں پہنچاتے ہوئے، یا پھر اپنی محبوبہ کے دیدار کا لطف لیتے ہوئے، ایک عجیب و غریب، بے بس کر دینے‌والی، پراسرار اور طاقت‌ور چیز مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہ خوشگوار ہو یا غم‌انگیز، بہر حال یہ ہمیشہ مجھے عمل پر ابھارتی ہے، مجھے بولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور یہ چیز کچھ اس طرح میرے پاس آتی ہے کہ نہ میں اسے بلاتا ہوں اور نہ ہی یہ اپنے آنے کی اطلاع دیتی ہے۔

یہ آتی ہے اور اس کے ساتھ محمود ہوتا ہے، اپنا چرکیسائی کوٹ پہنے، ہاتھ میں پاندور لئے، اپنی پرجوش محبت کے ساتھ

جس کے گیت وہ زندگی بھر گاتا رہا مگر محبت کا یہ سرچشمہ بدستور جاری رہا، میرے والد ہوتے ہیں، اپنی غمناک اور پاکیزہ مسکراہٹ کے ساتھ، الداریلاف ہوتا ہے، اپنے ہاتھوں میں زہر کا پیالہ لئے، مارین ہوتی ہے، جس کے ان لبوں سے جنہیں ظالم نائب کے حکم پر سی دیا گیا تھا خون ٹپکتا ہوتا ہے، اور ان سب کے پیچھے، دور بہت دور قدآور شاعروں اور ادیبوں کے چہرے چمکتے ہوئے ہیں، دانتے، تالستائی، شیلر، بلوک، گوئٹے، بالزاک اور دوستوئیفسکی کے چہرے... اور کبھی کبھی مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ دور دھند میں ایک کرن کی چھوٹ سے خود خدا کا چہرہ بھی جگمگا رہا ہے۔

''تم کون ہو؟''، میں اس چیز سے سوال کرتا ہوں۔

''میں تمہاری صلاحیت ہوں، تمہاری شاعری ہوں۔''

''تم کہاں سے آ رہی ہو؟''

''میں ہر جگہ حاضر و ناظر ہوں۔''

''تمہاری عمر کیا ہے؟ کیا تم میری ہمسن ہو؟''

''نہیں۔ میری عمر ایک لمحہ بھی ہے اور ایک ہزار صدیاں بھی۔ مجھ میں بچوں کی سادگی، کڑیل جوان کی جذباتیت اور بوڑھے انسان کی دانشمندی ساری چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ زمان و مکان کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوتا۔ میں ایسی آگ ہوں جسے کوئی چیز بجھا نہیں سکتی۔ میں ایسا گیت ہوں جسے کوئی اختتام تک نہیں لا سکتا۔ میں ایسی پرواز ہوں جسے کوئی مکمل نہیں کر سکتا۔ میں تم سے بہت دور ہوں، مگر تمہارے اندر رہتی ہوں۔ میرا حامل ہونا سرمایۂ مسرت وانبساط ہے، مگر انتہائی کربناک بھی۔ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو مجھ سے آسان ہو یا مجھ سے مشکل ہو۔

''اگر میرا وجود ہے تو وائلن کے تاروں کی لرزش ٹھوس چٹانوں کے پرخچے اڑا سکتی ہے۔ اگر میرا وجود ہے تو زورنا کی دھنیں سن کر اڑنے بھینسے پہاڑ کی کھوہ میں ناچنے لگینگے۔ اگر میں موجود ہوتی ہوں تو قاتل کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ جاتا ہے اور واحد بوسہ محبت کرنے والوں کو گھلا کر رکھ دیتا ہے۔

''جب آندی گاؤں کے پاتی سے اس کا کوٹ چھینا گیا تھا تو اس وقت میں وہاں موجود تھی۔ ہاں، میں وہاں بھی تھی جب مریم کو اغوا کرکے گھوڑے کی زین سے لٹکی ہوئی فتراک میں باندھا گیا تھا۔ اور جب جون آف آرک نے اپنی تلوار بے نیام کی تھی اور اپنی فوجوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا تھا تو میں وہاں بھی حاضر تھی۔ جب ایک آدمی نے پنکھ ایجاد کئے تھے اور گرجا گھر کے مینار سے چھلانگ لگائی تھی تو میں اس کے ساتھ تھی۔ جب میگیلان اور کولمبس سفر پر روانہ ہوئے تھے تو میں وہاں موجود تھی اور جب فنکار ''سستین میدونا،، کو جنم دے رہا تھا تو میں وہاں حاضر تھی۔

''ہر زمانہ اور ہر دیس میرا میدان عمل ہے۔ میرے کردار انسان ہیں۔ انسان کے پاس ذہن بھی ہے اور روح بھی۔ ہر براعظم میں انسان کو یہ چیزیں ملی ہیں تاکہ وہ محبت اور نفرت کر سکے، بہادر یا بزدل، نیک یا بدباطن، بے لوث یا مفادپرست بن سکے اور سچ بول سکے یا افتراپردازی کر سکے۔ انسانوں کے ذہن اور ان کی روحیں یہ میرا میدان جنگ ہیں، میری فتوحات اور میری شکستوں کا محاذ ہیں، میرے کارناموں کے آئینہ دار ہیں۔،،

''اگر ایسا ہے تو مجھے صاف صاف بتا دو کہ میرا وجود کس لئے ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں بھی اس برف کی طرح ہوں جو آنے والے کل کے ساتھ پگھل جائے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں ایک ایسے گھڑے میں پانی بھرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس کے پیندے میں شگاف ہو چکا ہے؟ کیا تمہاری آتش لازوال کی کوئی چنگاری میری روح میں بھی داخل ہو پائی ہے یا تمہارا کوئی جلتا ہوا اور مست کن قطرہ میرے لبوں تک پہنچ پایا ہے؟،،

میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، غم کے بھی اور خوشی کے بھی۔ میرے پاس آنسوؤں کا ایک اور خزانہ بھی ہے، یہ پوشیدہ آنسو ہیں، جو میری پلکوں میں اس طرح چھپے ہوئے ہیں جس طرح ڈرپوک پرندے شکاری کی آہٹ سنتے روپوش ہو

جاتے ہیں۔ اور یہ پوشیدہ آنسو بھی محبت کے آنسو ہیں یا غم کے آنسو، ناکامیوں کے آنسو ہیں یا مسرتوں کے آنسو۔ میرے سر کے بال دو رنگوں کے ہیں، سفید اور سیاہ۔ اور خود میرا اپنا وجود یوں ہے کہ ایک قدم جوانی کے دائرے میں ہے، دوسرا بڑھاپے کے دائرے میں۔ جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ایک مسلسل جنگ چھڑی ہوئی ہے، اور میری روح ان کے لئے میدان جنگ ہے۔

محبت میری ایک ایسا شجر ہے
کہ دو شاخیں ہیں جس کی
ایک سوکھی
دوسری پتوں میں ڈوبی
محبت میری اک شاہیں ہے
دو پروالا شاہیں، جس کا اک پر
اسے اوپر اٹھاتا دوسرا نیچے گراتا ہے

میرے سینے میں ہیں دو زخم
جن میں ایک سے ہردم لہو رستا ہی رہتا ہے
ولیکن دوسرا اب مندمل ہونے پہ آیا ہے۔
غرض یہ زندگی کا طور ہے، دستور ہستی ہے
خوشی آتی ہے پہلے پھر الم کا سیل آتا ہے

زندگی کی اپنی حدیں ہوتی ہیں، وہ ہزار گزراں سہی، ہمارے خواب اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ لامحدود ہیں۔ میں ابھی سڑک ہی پر ہوتا ہوں کہ میرے خواب میرے گھر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ میں محبوبہ سے ملاقات کے لئے نکلتا ہوں اور ابھی راستے ہی میں ہوتا ہوں کہ میرا تصور محبوبہ سے ہم‌آغوش ہو چکا ہوتا ہے۔ میں وقت اور لمحات کی قید میں ہوں لیکن میرا تصور ان سے آزاد ہے، وہ بہت پہلے اس سرحد کو پار کر جاتا ہے جہاں زندگی ایک لازوال اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے۔ میرا تصور صدیوں کا فاصلہ طے کر لیتا ہے۔

پہیلی جو شامیل کو بجھائی گئی- ایک رسی جس میں تین گرہیں باندھی گئی تھیں شامیل کے ھاتھ میں دی گئی- رسی کے کونے پر دو گرہیں بہت پاس پاس بندھی ہوئی تھیں اور تیسری گرہ رسی کے دوسرے کونے پر تھی-

شامیل نے رسی پر ایک نظر ڈالی، گرہوں کو دیکھا اور کہا:

''پہلی گرہ میرا وجود ہے، دوسری گرہ میری موت کی علامت، تیسری اور دونوں سے بہت دور بندھی ہوئی گرہ اس جگہ کی علامت ہے جہاں میرے خواب اور میرے خیالات ایک دوسرے سے ملتے ہیں، یہ اس نصب العین کی علامت ہے جسے حاصل کرنا میں نے زندگی کا مقصد بنایا تھا-،،

میں اپنے خوابوں میں جس کھیت میں ھل چلاتا ہوں وہ میرے حقیقی کھیت کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑا ہے- سوال یہ ہے کہ صلاحیت کس کا ساتھ دے، میرا یا میرے خوابوں کا جو اب تک میری دسترس سے بہت دور رہے ہیں-

ھاں! تو وہ آگ ہے جسے کوئی چیز بجھا نہیں سکتی- تو وہ گیت ہے جسے اختتام تک پہنچانا کسی انسان کے بس میں نہیں- تو ایک ایسی پرواز ہے جو کبھی مکمل نہ ہو سکے گی-

میں تو صرف اتنا پوچھنا چاھتا ہوں کہ کیا میں تیرے صدیوں پرانے گیت میں ایک انوکھے نغمے کا اضافہ کر پاؤں گا، اس نغمے کا جو میرا ہوگا، ایک آوار نغمہ ہوگا؟ میرا خیال ہے اس وقت پورے گیت کی قدروقیمت بڑھ جائیگی-

کیا میں اس قابل ہو سکونگا کہ داغستان کی چوٹیوں پر ایک معمولی سی آگ روشن کر پاؤں، اور یہ آگ تیرے لازوال شعلوں ھی کا ایک حصہ ہوگی؟ کیا ایسا ہو سکے گا کہ میں ایک لمحہ کے لئے ھی سہی، ایک چٹان سے دوسری چٹان تک ھی سہی تیری دائمی پرواز کو وسعت دے سکوں؟

میں سدا کا رہنےوالا ہوں اور آوار زبان میں اس کے معنی ''آگ،، کے ہوتے ہیں-

ایک بار کسی دوسرے گاؤں کے ایک آدمی نے مجھ سے پوچھا تھا:

''بیٹا! تم کہاں کے رہنےوالے ہو؟''

''سدا کا۔'' میں نے جواب دیا تھا اور اس جواب کو سن کر اس نے کہا تھا:

''اچھا تو مجھے اپنے کچھ اشعار سناؤ! میں تمہیں بتا دونگا کہ یہ آگ کی پیداوار ہیں یا سرد راکھ کی۔''

شکوک و شبہات نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ کیا ایسا ہے کہ میں اس وقت اپنی کوٹ پہن رہا ہوں جب جاڑا گذر گیا ہے اور گذرتے ہوئے بادلوں کے پیچھے سے سورج نکل آیا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اصطبل میں اس وقت تالا لگانے کھڑا ہوا ہوں جب بیل چوری ہو چکا ہے۔ کہیں یہ تو نہیں کہ میں وہی باتیں دھرا رہا ہوں جنہیں لوگ سیکڑوں بار سن چکے ہیں؟ کیا میں انہیں مہمانوں کو اپنے یہاں مدعو کر رہا ہوں جو کسی اور مہمان نواز انسان کے یہاں کھانا کھا کر اٹھے ہیں؟ کیا واقعی میرے لئے یہ کتاب لکھنا ضروری ہے؟

''اگر تمہارے لئے اس کا لکھنا ضروری نہیں تو ہرگز نہ لکھو۔''

''کیا میں لکھنے سے بچ سکتا ہوں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ایسا مریض جسے شدت کا درد ہو کراہنے سے باز رہ جائے؟ کیا کوئی آدمی خوشی میں مسکرائے بغیر رہ سکتا ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے کہ چاندنی رات کی پرسکون فضا ہو اور بلبل اپنا نغمہ نہ سنائے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ گرم اور مرطوب زمین کے نیچے گھاس کا بیج پھوٹنے کے بعد اپنی قوتِ‌نمو روک دے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ جب موسم بہار میں سورج کی شعاعوں نے کلیوں کو گرم کر دیا ہو تو پھول کھلنے سے انکار کر دیں؟ کیا پہاڑی چشمے یہ کر سکتے ہیں کہ برف پگھلنے کے بعد جب پانی کی تیز دھاریں اپنی رو میں پتھروں کو بہاتی ہوئی چلی آ رہی ہوں تو وہ سمندر کی طرف جانے سے انکار کر دیں؟ کیا یہ بات آگ کے بس میں ہے کہ لکڑیاں سوکھی ہوئی

ہوں اور انہیں چاروں طرف سے شعلوں نے گھیر لیا ہو اور وہ جلتے رہنے سے باز رہ جائے؟

بچپن میں جلتی ہوئی آگ کو دیکھنا میرا من پسند مشغلہ تھا۔ وہ چاہے چرواہوں کی جلائی ہوئی آگ ہو یا دریا کے کنارے اور پہاڑ کے دامن میں جلتی ہوئی آگ، پڑوس کی چوٹی پر لپکتے ہوئے شعلے ہوں یا چولھے میں دھکتے ہوئے انگارے۔ مجھے معلوم ہے کہ آگ کا جلا دینا تو آسان ہے لیکن اسے جاڑے کی سرد اور طویل راتوں میں صبح ہونے تک برقرار رکھنا کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل میں آگ لگی ہے۔ آخر میں کیا کروں کہ یہ آگ ختم نہ ہونے پائے، وقت سے پہلے بجھنے نہ پائے بلکہ اس وقت تک برقرار رہے جب تک اس کی گرمی دوسروں تک نہ پہنچ جائے یا اندھیری رات میں سفر کرنے والوں کو اس سے روشنی نہ مل جائے؟ میں اپنی صلاحیت کو برقرار رکھنے اور اسے مزید ہوا دینے کے لئے کیا کروں؟

ابا کی یادداشت سے۔ ایک بار کوئی پہاڑی ابا سے ملنے آیا۔

"میں نے لکھنے کی کوشش کی،" اس نے کہا۔ "اور مجھے یقین ہے کہ میں قافیہ‌بندی بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ حقیقتاً اشعار لکھے کیسے جائیں۔"

اور اس کا جواب ابا نے یوں دیا:

"وائلن کے تار چھیڑ دینا ہی کافی نہیں، یہ بھی جاننا چاہئے کہ اسے بجایا کیسے جاتا ہے۔ محض اتنا ہی کافی نہیں کہ آپ کے پاس کھیت ہے، آپ کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ اسے کیسے جوتا جاتا ہے اور بیج کیسے بوئے جاتے ہیں۔"

"تو پھر مجھے نظمیں لکھنے کے لئے کرنا کیا چاہئے؟"

"کرنا کیا چاہئے، بس یہ کہ کام شروع کر دو!"



کام اور کاوش

جیسے یہ بھرم ہو کہ ہمارا کام دقت طلب نہیں، وہ کوباچی آکر دیکھے کہ ہم کیسے محنت کرتے ہیں۔ (کوباچی کی دستکاری کے ایک نمونے پر نقش تحریر)

میں اپنی شاعری کا بندۂ بےدام ہوں، دن بھر جھکائے سر،
پسینہ پونچھتا رہتا ہوں محنت کا
مجھے تو سر اٹھانے کی اجازت بھی نہیں ملتی،
نہیں ہے روز و شب میں ایک پل بھی فرصت کا
میں رکشے کی طرح ہر لمحہ بس چلتا ہی رہتا ہوں
ازل سے تاابد یہ بوجھ ڈھونا میری قسمت ہے
فزوں ہوتا ہی جاتا ہے یہ بار شاعری
ہر دم معاذاللہ! کیا ایذا رساں قید مشقت ہے!

بات بہت پہلے کی ہے، مگر مجھے اس طرح یاد ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ میں اس پر ایک نظم بھی لکھ چکا ہوں

لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ یہ واقعہ آپ کو بھی سناؤں۔

داغستان کے شاعر حمزہ کے ایک گمنام بیٹے کی حیثیت سے میں اپنے گاؤں سے مخاچ قلعہ آیا اور پھر وہاں سے ماسکو گیا۔ سال پر سال گذرتے رہے۔ میں نے ادارۂادب کی تعلیم پوری کی، میری نظموں کے دس مجموعے شایع ہوئے جن میں سے ایک پر مجھے ریاستی انعام بھی ملا، میری شادی بھی ہو گئی، مختصر یہ کہ میں شاعر رسول حمزاتوف بن گیا۔ اور تب میرے دل میں اپنے آبائی گاؤں واپس ہونے کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگا۔

میں دن دن بھر ان جگہوں کے چکر لگاتا جن میں میرا بچپن گذرا تھا، اپنی چٹانوں کو دیکھتا اور ان غاروں کے ارد گرد گھومتا جن سے میرے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ میں لوگوں سے باتیں کرتا، پہاڑ سے بہنےوالے جھرنوں کے نغمے سنتا، گھنٹوں قبرستان میں گم سم بیٹھا رہتا اور پھر میدانوں میں گھومتا۔

میں نے امریکہ میں نئی کاروں کی آزمائش دیکھی تھی، یہ نئی کاریں ایک مخصوص راستے پر چلائی جا رہی تھیں۔ ادیب کے لئے بھی اس کی جائے پیدائش کو ایک ایسا ہی راستہ ہونا چاہئے جہاں اس کی صلاحیتیں آزمائی جائیں۔

ایک دن کچھ عورتیں دن بھر گیہوں کے کھیت صاف کرنے کے بعد گھر لوٹ رہی تھیں۔ تھکی ماندی، دھول میں اٹی، گھاس کے دھاردار ڈنٹھلوں سے کٹے ہوئے ہاتھ لئے یہ عورتیں تھوڑی دیر سستانے کے لئے راستے میں بیٹھ گئیں۔ میں نے انہیں دیکھا اور ان کی طرف چل پڑا۔

میں نہیں جانتا کہ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ میری باتیں کرنے لگیں یا پہلے ہی سے میرے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ بہرحال میرے کانوں میں اچانک ایک عورت کی آواز آئی، وہ گھاس کے ایک گچھے سے ماتھے کا پسینہ پونچھتی ہوئی کہہ رہی تھی:

''اگر تم لوگ مجھ سے پوچھو کہ میری سب سے بڑی خواہش کیا ہے تو میں کہونگی کہ مجھے رسول حمزاتوف جیسا بےفکردل اور اسی جیسی آرام‌دہ زندگی مل جائے۔''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ رسول کے پاس دل کی جگہ پنیر کا کوئی ٹکڑا ہے جس میں کبھی درد نہیں ہوتا؟'' ایک دوسری عورت نے جو میری رشتےدار تھی، میری حمایت میں کہا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ مگر اسے کھیت کی صفائی تو نہیں کرنی پڑتی۔ پنچائتیفارم کا گھنٹہ بجتے ہی اسے کام پر بھی نہیں جانا پڑتا اور نہ ہی اسے اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے کہ گھنٹہ بجے تو وہ کھانا کھائے۔ اسے پتہ بھی نہیں کہ کام کی مدت کے مطابق اجرت کی ادائیگی کا مطلب کیا ہے، کام کا حساب کیسے لگایا جاتا ہے اور ہمیں ملتا کیا ہے۔ اس کا کام تو بس اتنا ہے کہ وہ مزے مزے کے گیت لکھے۔ اسے فکر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اس کے دل میں درد اور تڑپ بھی ہو تو کیوں؟ نہیں اس سے زیادہ آرام‌دہ اور آسان زندگی کیا ہو سکتی ہے جس کی میں تمنا کروں!''

پیاری خاتون! میں تمہیں کس طرح اپنے کام کی نوعیت سمجھاؤں، میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میری محنت بےحد اذیت‌رساں ہے اور اس محنت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا؟

غم‌زدہ سا میں گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کے معمر بزرگ حسب‌دستور چوپال میں جمع تھے اور بڑے اطمینان کے ساتھ کھیتوں کے بارے میں، آنےوالی فصل کے بارے میں، پہاڑوں اور چراگاہوں کے بارے میں، بیماریوں اور جڑی‌بوٹیوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور گاؤں کی داستان پارینہ دہرا رہے تھے۔ میں بھی ان لوگوں کے پاس جا پہنچا، صاحب‌سلامت کے بعد ایک ٹھنڈے پتھر پر بیٹھ گیا۔

ایک بزرگ کے ہاتھ میں اخبار کا تازہ شمارہ تھا جس میں میری کئی نظمیں چھپی تھیں۔ گفتگو کا رخ ان کی طرف مڑ گیا۔ گھوڑے کی تعریف کی جائے تو شہسوار کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں بھی اپنے گاؤں‌والوں کی زبانی اپنی تعریف سننے کے لئے تیار ہو گیا۔ مخاچ‌قلعہ اور ماسکو میں میں اس طرح کا عادی بن چکا تھا۔ لیکن ان بزرگ سے جن کے ہاتھ میں اخبار تھا مجھے کچھ اور ہی بات سننی پڑی۔ انہوں نے کہا:

''تمہارے والد حمزہ بھی شاعری کرتے رہے اور تم بھی

شاعری کر رہے ہو ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کام کب شروع کروگے؟ یا تم یہ چاہتے ہو کہ زندگی کے جتنے دن تمہیں ملے ہیں انہیں یوں ہی گذار دو، اور کبھی کوئی ایسی چیز نہ اٹھاؤ جس کا وزن روٹی سے زیادہ ہو؟،،

”شعر کہنا میرا کام ہے ۔ ،، گفتگو کے اس رخ سے مجھے تعجب تو بہت ہوا تھا، مگر میں نے حتی الامکان پوری خاکساری کے ساتھ جواب دیا۔

”اگر شاعری بھی کام ہے تو بےکاری کس چیز کا نام ہے؟ اگر گیت گانا کام ہے تو پھر لطف اور تفریح کسے کہینگے؟،،

”جی ہاں۔ جو لوگ گاتے ہیں ان کے لئے تو گیت یقیناً لطف کا باعث ہے، مگر جو گیت لکھتا ہے اس کےلئے یہ کام ہے۔ کام اور ایسا کام کہ جس میں نہ آرام کا سوال ہے، نہ سونے کا اور نہ ہی فرصت کا۔ آپ کےلئے جو حیثیت کھیت رکھتا ہے، میرے لئے وہی حیثیت کاغذ کی ہے۔ حروف اور الفاظ بیج کی حیثیت رکھتے ہیں اور نظم اناج کی بالی کی۔ ،،

”الفاظ بڑے خوبصورت ہیں ۔ لیکن کھیت میرے مکان کی چھت پر نہیں آ جاتے۔ مجھے کام کرنے کےلئے باہر کھیتوں میں جانا پڑتا ہے ۔ اور تمہارے گیت تمہارے پاس آ جاتے ہیں، چاہے تم اپنے بستر میں ہی کیوں نہ ہو ۔ تمہاری ہر نظم اس مہمان کی طرح ہے جو تمہارے دروازے پر دستک دے رہا ہو اور یوں تمہاری ہر نظم ایک خاص دن کی، ایک تہوار کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ ہمارے کھیت ہماری روزانہ زندگی کی طرح ہیں ۔ ،،

یہ تھا وہ انداز جو بزرگوں نے اس موضوع پر بات‌چیت کے سلسلہ میں اختیار کیا ۔

”میرے گیت بھی میری زندگی ہیں ۔ ،، میں نے جواب دیا ۔

”اگر ایسا ہے تو تمہاری زندگی تہواروں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوگی۔ جہاں تک ہم جانتے ہیں شعر گوئی کے لئے صلاحیت ضروری ہے ۔ اگر تمہارے پاس صلاحیت ہے تو اچھی شاعری کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، البتہ صلاحیت نہ ہو تو ضرور مشکل پیش آتی ہے اور شعر کہنا خاصا مشکل بن جاتا ہے ۔

لیکن ایسی صورت میں آپ کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو پاتا۔ ،،

''یہاں آپ غلطی کر رہے ہیں۔ کم صلاحیت والا آدمی شاعری اور فنون لطیفہ کو معمولی کام سمجھتا ہے، وہ ایک گیت سے دوسرے گیت کی طرف بھاگتا رہتا ہے اور جیسا کہ ہم کہتے ہیں وہ بکواس کرتا ہے۔ آرٹ اس کے لئے محض روزی کا ذریعہ ہوگا۔ جس کے پاس حقیقی معنوں میں صلاحیت ہوگی وہ تخلیق کے بارے میں ذمہ داری بھی محسوس کرے گا۔ با صلاحیت انسان کے لئے اس کی شاعری ایک ایسا کام ہے جو اہم بھی ہے اور مشکل بھی۔ ایسا تو نہیں ہے کہ جو چیز بھی گائی جائے وہ گیت بن جائے، اسی طرح سنائی جانے والی ہر بات کہانی بھی نہیں ہو جاتی۔ ،،

''اچھا اگر یوں ہے تو تم ہمیں بتاؤ کہ تم کام کیسے کرتے ہو؟ تمہارے کام میں دقت طلب بات کیا ہے؟،،

میرے اردگرد معمر کسان بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں اپنے کام کی نوعیت سمجھانی چاہی، لیکن جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ میں انہیں وہ سب کچھ سمجھانے میں ناکام ہوں جسے میں بڑی صاف اور آسان سی بات سمجھتا تھا۔ میں نے کچھ بے ربط سے جملے کہے، کچھ ہکلایا اور پھر خاموش ہو گیا۔ ان بزرگوں نے اس دن میرے چھکے چھڑا دئے۔ میں انہیں یہ نہ سمجھا پایا کہ شعر کہنا مشکل کیوں ہے اور یہ شعر گوئی ہے کس طرح کا کام؟

اس بات کو ایک عرصہ گذر چکا ہے۔ لیکن آج بھی اگر کوئی پوچھ لے تو میرے لئے یہ بتانا مشکل ہو جائے گا کہ میرا کام ہے کیا، یہ دقت طلب کیوں ہے اور یہ کام ان کاموں سے مختلف کس طرح ہے جو دوسرے لوگ کرتے ہیں؟

وہ جگہ کہاں ہے جہاں میں کام کرتا ہوں؟ یقیناً وہ جگہ میری میز ہے مگر یہ جگہ کوئی پہاڑی راستہ بھی ہو سکتا ہے جس پر میں ٹہل رہا ہوں اور ٹہلتے ٹہلتے اپنی نظم کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں، آوازیں اور الفاظ میرے ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں مگر میں انہیں نظرانداز کر دیتا ہوں۔ یہ جگہ

کوئی ایسی ٹرین بھی ہو سکتی ہے جو مجھے کسی اور ملک میں لے جا رہی ہو، کیونکہ اکثر ایسی ہی حالت میں کسی نئی نظم کے تانے بانے ذہن میں آ سکتے ہیں۔ یہ جگہ ہوائی جہاز بھی ہو سکتا ہے کوئی بس بھی، ماسکو کا لال چوک بھی، کسی دریا کا کنارا بھی اور کوئی جنگل بھی اور یہی نہیں حکومت کے کسی اعلی افسر کے یہاں انتظار کا کمرہ۔ بات یوں ہے کہ میرے لئے کام کی جگہ اور وہ کھیت جسے میں جوتتا اور کاٹتا ہوں روئے زمین کا کوئی بھی گوشہ اور کوئی بھی کونہ ہو سکتا ہے۔

میں کام کس وقت کرتا ہوں؟ صبح کو یا شام کو؟ میرا کام کا دن کتنے گھنٹوں پر مشتمل ہے؟ ۶ گھنٹے، ۸ گھنٹے ۱۲ گھنٹے یا اس سے بھی زائد؟ اگر اس سے بھی زائد ہے تو میں ہڑتال کیوں نہیں کرتا اور یہ مطالبہ کیوں نہیں کرتا کہ مجھ سے ایک دن میں صرف ۸ گھنٹے کام لیا جائے؟

اور یہی اصل مسئلہ ہے۔ میں ہر وقت کام کرتا ہوں اور جہاں تک میری یادداشت کام دیتی ہے عرصۂدراز سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔ میں کھانا کھا رہا ہوں یا تھیٹر میں ہوں، جلسوں میں ہوں یا شکار کھیل رہا ہوں، کسی دعوت میں شریک ہوں یا کسی جنازے کو کاندھا دے رہا ہوں، کار میں بیٹھا ہوں یا کسی شادی میں شریک ہوں، کام کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حد یہ ہے کہ سوتے ہوئے بھی مصرعے، استعارے، خیالات اور جذبات ہی نہیں، کبھی کبھی پوری پوری نظمیں میرے ذہن میں آ جاتی ہیں۔ اور یوں میرے کام کی مدت اس وقت بھی ختم نہیں ہوتی جب میں محوخواب ہوتا ہوں۔ واقعتاً اب مجھے ہڑتال کر ہی دینی چاہئے۔

اور اب، میرا کام ہے کس طرح کا؟ یہ سوال تمام سوالوں سے زیادہ مشکل ہے اور اس کا جواب دینا مشکل‌تر۔ کبھی تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام بھی دوسرے کاموں کی طرح ہے، اور کبھی میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ میرا کام دوسروں سے مختلف ہے اور کسی دوسرے پیشے سے اس کا مقابلہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میرے اردگرد سارے ہی لوگ کام میں پوری طرح مصروف ہیں اور میں قطعی بے کار ہوں۔ پھر کچھ ایسی گھڑیاں بھی آتی ہیں جب مجھے لگتا ہے کہ تنہا میں ہی ہوں جو کام کر رہا ہوں اور دوسرے جتنے بھی لوگ ہیں وہ میرے مقابلے میں قطعی بےکار ہیں۔ چڑیوں کا کام بہت آسان ہے۔ وہ ساری زندگی میں ایک ہی گیت الاپتی رہتی ہیں، وہ گیت جو انہوں نے اپنے والدین سے سیکھا تھا۔ اسی طرح پہاڑی جھرنے ہیں جو ہزارہا سال سے ایک ہی راگ الاپتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن مجھے... زندگی کی مختصر سی مدت میں اتنے گیت لکھنے ہیں جو برسہابرس تک کام آ سکیں۔

جس شخص نے پہلی بار زمین کے ایک چھوٹے سے حصے پر ہل چلایا ہوگا اس کے لئے یہ کام شاید بڑا مشکل رہا ہوگا۔ اور اسے بھی اتنی ہی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جس نے پہلی بار گیت لکھا ہوگا۔

لیکن جب ایک ہزار لوگ زمین کے اسی حصے پر ہل چلا چکے ہوں تو ان کے بعد ہل چلانےوالے کا کام زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے قطعی برخلاف جب ایک ہزار لوگ اپنی نظمیں لکھ چکے ہوں تو بعد میں آنےوالے شاعر کے لئے نظم لکھنا اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

اور اس لئے میں ہل چلانےوالے سے کہونگا:

ایک طرح سے میرا کام تمہارے کام ہی کی طرح ہے۔ اس لئے مجھے بےکار نہ سمجھو اور یہ نہ سوچو کہ میری زندگی مسرت، دل‌لگی اور فرصت کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ تمہاری ہی طرح میں نے بھی پلک جھپکائے بغیر اپنے کھیت کی فکر میں لمبی لمبی راتیں گذاری ہیں۔ جس طرح تم بوائی کے لئے بہترین بیجوں کا انتخاب کرتے ہو اسی طرح میں بھی اپنے مصرعوں کے لئے الفاظ کے بےپناہ خزانے سے بہترین لفظ چنتا ہوں۔ ہزارہا الفاظ کے خزانے سے مجھے کوئی ایک لفظ چننا ہوتا ہے۔ میرے پاس بھی زمین کا ایک قطعہ ہے اور میں بھی اس وقت مسرت محسوس کرتا ہوں جب زمین سے ننھے ننھے پودے پھوٹتے ہیں

اور تمہاری ہی طرح اپنی محنت کے پھلوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ مجھے بھی اپنے ڈھنگ سے کاشت اور نرائی کا کام انجام دینا پڑتا ہے اور میرے کھیت میں بھی خس و خاشاک ہوتے ہیں جنہیں صاف کرنا پڑتا ہے۔ مشین کے ذریعے بھی اچھے اور برے بیجوں کا الگ کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ مگر اچھے اور موزوں الفاظ کا غیر ضروری الفاظ سے الگ کرنا اس سے بھی کہیں زیادہ مشکل عمل ہے۔

تم کو اپنا کھیت طوفان باد و باراں سے، پالے اور خشک ہواؤں سے بچانا پڑتا ہے۔ مجھے ایسے گیت جنم دینے ہوتے ہیں جو ان سب سے کہیں زیادہ تندخو اور تباہ کن دشمن یعنی وقت کا مقابلہ کر سیکں۔ میں ایسے گیت لکھنا چاہتا ہوں جو صدیوں تک زندہ رہ سکیں۔

مجھے بھی ایک طرح کے کیڑے مکوڑوں، ٹڈیوں اور پودوں کو کترنےوالے جانوروں کا دھڑکا لگا رہتا ہے جو میری کھیتی کو تہس نہس کر سکتے ہیں اور اسے تباہ کر سکتے ہیں یا پھر اس طرح خراب کر سکتے ہیں کہ میرا اناج کھانے کے قابل نہ رہ جائے۔ پھر میرے یہاں کترنےوالے جانور آپ کے چوہوں اور گلہریوں سے بڑے بھی ہیں اور زیادہ نقصان‌دہ بھی اور ان کا مقابلہ کرنا کبھی کبھی مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔

انگیٹھی میں آگ جلی ہو، گرم رہے اندر کا کمرہ
لیکن گر دیوار میں باقی رہ جائے معمولی رخنہ
سرد ہوا رخنے سے ہو کر کمرے کے اندر آئے گی
بجھ جائے گی گرم انگیٹھی، ٹھنڈ سے ہر شے جم جائے گی

میری پیاری نظموں کا بھی حال کچھ ایسا ہو سکتا ہے
اس میں بھی معمولی رخنہ، راہ میں کانٹے بو سکتا ہے
لفظوں کے کٹھ جوڑ میں کوئی چول اگر ڈھیلی رہ جائے
نظموں کا اشعار محل بھی ایک ہی دھارے میں بہہ جائے

پھر مجھے اپنے باغ کے پھل لوگوں میں بانٹنے ہوتے ہیں، داغستان کے لوگوں میں بھی اور دوسرے ملکوں کے لوگوں میں بھی تاکہ وہ اس کا ذائقہ چکھیں اور یہ جان سکیں کہ میرے پھل میٹھے ہیں تو کتنے اور کڑوے ہیں تو کتنے، اور پھر ان کا اپنا مزہ کیا ہے کیونکہ انہیں ذائقہ کے لحاظ سے دوسرے پھلوں سے ہر طور پر مختلف ہونا چاہئے۔

مجھے یاد ہے بچپن میں ابا مجھے گٹھا باندھنا سکھایا کرتے تھے۔ میں ایک گھٹنے پر اپنا سارا بوجھ ڈال کر زور سے رسی کھینچا کرتا تھا تاکہ گرہ مضبوط بندھے۔ ایسے موقعوں پر ابا تنبیہ کرتے:

''رسول! احتیاط سے کام لو! بالیوں کا دم نہ گھٹ جائے!،،

اور اب جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نظم مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی، اور میری لگاتار کوشش کے باوجود کوئی مصرعہ نظم کا جزو نہیں بن پاتا تو میں اپنی پوری طاقت سے کام لیتے ہوئے اسے نظم میں گٹھانے کا جتن کرتا ہوں اور ایسے ہر موقع پر مجھے ابا کے یہ الفاظ یاد آ جاتے ہیں: ''رسول! احتیاط سے کام لو! بالیوں کا دم نہ گھٹ جائے!،،

ایسا نہیں ہوتا کہ ہر سال ایک ہی جیسی فصل پیدا ہو۔ کسی سال اتنا اناج پیدا ہو جاتا ہے کہ سنبھال کر رکھنے کے لئے بھی جگہ نہیں رہ جاتی، پھر اس کے بعد دو تین سال اس طرح گذر سکتے ہیں کہ اناج پیدا ہی نہ ہو۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرے کام کی رفتار بھی ایک جیسی نہیں رہتی۔ میں کھاد ڈالتا ہوں، ہل چلاتا ہوں، بہترین بیج بوتا ہوں لیکن اناج پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے ترجموں کا سہارا لینا پڑتا ہے، گویا دوسرے ملکوں سے، آسٹریلیا یا کناڈا سے غلہ حاصل کر رہا ہوں۔ شاعری کی لو مدھم پڑ جائے اور نظم میرے دل کی گہرائیوں سے نکل کر کاغذ پر لکھی تحریر کا روپ اختیار کرنے سے انکار کر دے تو دنیا کا کوئی بھی تیل اس کی لو بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ایسے میں ہو بھی کیا سکتا ہے؟ اگر ہر کام اور ہر کوشش کامیاب رہے تو ہر شخص خوش رہے گا۔ اگر ہر سال

کھیتوں میں اچھی فصل پیدا ہوتی رہے تو کوئی بھوکا نہ رہے گا۔ اگر کاغذ پر لکھے جانےوالے سارے الفاظ نظم کا روپ لینے لگیں تو لوگ نثر میں باتیں کرنا چھوڑ دیں اور صرف گایا کریں۔ لیکن نظم لکھنا کوئی آسان کام تو نہیں...

مجھے داغستان، جارجیا، آرمینیا اور بلغاریہ میں شراب ساز کارخانے اور پلسن کا بیئرساز کارخانہ دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میرا اپنا تاثر یہ رہا ہے کہ شاعروں اور شراب بنانےوالوں میں بہت سی چیزیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی اپنی باریکیاں اور اپنے راز ہوتے ہیں۔ شراب ہی کی طرح شاعر کی روح میں، نظموں کا بھی خمیر تیار ہوتا ہے اور شراب ہی کی طرح نظموں کی تخلیق میں بھی وہ منزل آتی ہے جب وہ پوری طرح تیار ہو جاتی ہیں۔ ایک اچھی نظم میں بھی وہ پراسرار قوت ہوتی ہے جو نشے جیسی کیفیت طاری کر دیتی ہے اور دل کو ایک عجیب مسرت و طمانیت سے بھر دیتی ہے۔ یہ وہ پہلو ہے جو شراب اور شاعری کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیتا ہے۔

کبھی گاؤں میں ایک لاری داخل ہوتی ہے جس پر شراب کے پیپے رکھے ہوتے ہیں۔ یہ لاری مقامی شراب کی دکان تک شراب پہنچاتی ہے۔ ایک پیپہ اس گاؤں میں اتارتی ہے تو دوسرا دوسرے گاؤں میں۔ بوٹنا کسک سے پہاڑی دیہاتوں تک شراب اسی طرح پہنچائی جاتی ہے۔

لاری دیکھتے ہی نوجوان گاؤں کے کونے کونے سے شراب کی دکان کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ انداز میں لاپرواہی اور رفتار میں سستی ہوتی ہے، لیکن دل میں طوفان امڈ رہا ہوتا ہے۔ اور وہ پیپے کے اردگرد یوں جمع ہو جاتے ہیں جیسے بھیڑیں کسی نمک کے ڈھیلے کو گھیر لیتی ہیں۔

شراب صراحیوں میں ڈھالی جاتی ہے، چکھی جاتی ہے اور بھرنا گواری کی سی کیفیت پورے ماحول پر چھا جاتی ہے۔

''یہ شراب ہے؟ ارے، یہ تو نرا پانی ہے!،،

''یوں لگتا ہے جیسے شراب نہیں دریا سے پانی بھر لیا گیا ہو!،،

''ایسی شراب تو بس دکاندار ہی کو پینے دو!''
''آپ لوگ مجھ پر کیوں ناراض ہو رہے ہیں'' بےچارہ دکاندار کہتا ہے۔ ''لاری آپ کے سامنے آئی، پیپے آپ کے سامنے اتارے گئے بلکہ خود آپ لوگوں نے اس میں میرا ہاتھ بٹایا۔ اب اگر شراب گھٹیا ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ پیپے میں جو شراب آئی تھی وہ میں آپ کے ہاتھ فروخت کر رہا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو یہ شراب پسند نہیں تو ہرگز مت خریدیئے!''

بات یہ ہے کہ شہر کے شراب کے گودام میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو مختلف مقامات کے لئے شراب بھیجنے سے پہلے ہر پیپے سے تھوڑی شراب نکال لیتے ہیں اور اسکی کمی پوری کرنے کےلئے اتنا ہی پانی پیپوں میں ڈال دیتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ ''علاقائی گوداموں کے لوگ ایسی بھی پاکر اپنے کو خوش قسمت تصور کرینگے۔'' پھر جب علاقوں کے گوداموں سے دیہاتوں کو شراب کے پیپے روانہ کئے جاتے ہیں تو ان گوداموں کے نوکر بھی یہی عمل دھراتے ہیں: ''دیہاتیوں کے لئے ایسی بھی اچھی رہےگی'' وہ سوچتے ہیں۔ پھر راستے میں ڈرائیور اور شراب کے پیپے چڑھانےوالے مزدور بھی راستے کی تکان دور کرنے کے لئے، فاصلے کا احساس مٹانے کے لئے شراب سے جی بہلاتے ہیں اور ہونےوالی کمی کسی پہاڑی چشمے یا جھرنے کے صاف شفاف پانی سے پوری کرتے ہیں۔ اور یوں جو چیز سامنے آتی ہے اسے آپ چاہیں تو پانی سے خراب کی ہوئی شراب کہہ لیں یا وہ پانی جس کو شراب ملاکر خراب کر دیا گیا ہو۔

بہت ساری نظموں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں شاعری زیادہ ہے یا لفاظی۔ اس طرح کی نظمیں ان شاعروں کی ہوتی ہیں جو تن‌آسانی کے قائل ہوتے ہیں اور محنت سے جی چراتے ہیں۔ بےقرار جھرنا مشکل ہی سے سمندر تک پہنچ پاتا ہے۔ سست اور کاہل‌الوجود زائر شاید ہی مکہ پہنچ پاتا ہو۔ جب کسی ایک گھوڑے پر دو سوار بیٹھے ہوں تو انہیں ایک دوسرے سے مل کر بیٹھنا ہوتا ہے۔ صلاحیت اور کاوش بھی ایک ہی گھوڑے پر سوار ہیں۔

ابوطالب کا کہنا ہے کہ کسی نظم میں صلاحیت اور کاوش کو اسی طرح ایک ساتھ ہونا چاہئے جیسے خنجر اور نیام۔

میری نوٹ بک سے۔ ایک زمانہ تھا جب میرا زیادہ وقت گھر کے بجائے سڑکوں پر گذرتا تھا۔ میں ان دنوں اسکول میں پڑھتا تھا اور شاعری بھی کرنے لگا تھا۔ لیکن شاعری، مطالعہ اور اسکول کی پڑھائی کے لئے جتنے صبر و تحمل کی ضرورت تھی، میرا دامن اس سے خالی تھا۔ اسکول سے ملنےوالے کام کرتے ہوئے مجھ سے زیادہ دیر بیٹھا نہ جاتا، کبھی پیچ و تاب کھاتا، کبھی کسمساتا، کبھی اٹھ کھڑا ہوتا اور موقع ملتے ہی باہر نکل جاتا۔ آج بھی مجھ میں صبر و تحمل اور انہماک کی کمی ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے ابا نے مجھے تاکید کی کہ میں بیٹھ کر اپنا کام پورا کروں۔ اب مجھے یاد نہیں کہ مجھے اسکول کا کام کرنا تھا یا کوئی نظم لکھنی تھی۔ بہرحال ابا ایک لمحے کے لئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا اور فوراً گھر کی چھت پر پہنچ گیا۔ ابا نے مجھے چھت پر دیکھا اور اماں سے پکار کر کہا:

''کھونٹی پر جو رسی لٹک رہی ہے ذرا اسے ادھر تو لانا!''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''رسول کو کرسی سے جکڑنا ہے، اس کے بغیر بات نہیں بنے گی۔'' اس کے بعد ابا نے بڑی خاموشی کے ساتھ مجھے کرسی سے جکڑ دیا، پھر اپنی انگلیوں سے میری پیشانی تھپتھپائی اور بولے: ''تمہارے دماغ میں جو کچھ ہے اسے اس پر منتقل کر دو!'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے سامنے رکھی کاپی کی طرف اشارہ کیا۔

کاش آج بھی کوئی تھوڑی دیر کے لئے ہم ادیبوں کو کسی کرسی سے جکڑ دیتا۔

دماغ لاکھ کام کرتا رہے، اگر اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ حرکت میں نہیں آتے تو دماغ کی مشقت اسی طرح ہے جیسے کسی ہوا چکی کے بازؤں کی حرکت۔ بازوں لاکھ چکر لگاتے رہیں اگر اناج نہ پیستے ہوں تو ان چکروں سے کوئی فائدہ نہیں۔

شانگری، اس کے بیٹے اور ۵ روبلوں کی کہانی - کچھ دنوں پہلے کی بات ہے، حنزہ میں شانگری نام کا ایک آدمی تھا جو امیر بھی تھا اور جس کی عزت بھی بہت تھی - اس کے ایک ہی بیٹا تھا، بڑا کاہل اور متلون‌مزاج - شانگری چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بھی گاؤں کے دوسرے لوگوں کی طرح کام کرے اور صحیح معنوں میں انسان بنے - مگر بیٹا کام کی طرف توجہ دینے پر تیار ہی نہ ہوتا تھا - ادھر باپ کے اعزا اور دوست اسے طرح طرح کے تحفوں سے نوازتے رہتے، کوئی گھوڑا دے رہا ہے، کوئی کوٹ لئے چلا آ رہا ہے، کسی نے پیسے دے دئے، کسی نے بالکل نیا اور چمچماتا خنجر حوالے کر دیا -

پھر ایک دن شانگری بیمار پڑا اور مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی - ایک دن سارے عزیز اور دوست اس کے ارد گرد جمع ہوئے -

''ہمیں بتاؤ کہ تمہاری صحت‌یابی کےلئے کیا کیا جائے؟،، ان سب نے پوچھا -

''میں اچھا ہو سکتا ہوں تو صرف ایک چیز سے، مگر وہ تم میں سے کسی کے بس میں نہیں - ،،

''ہمیں بتاؤ تو! ہم اپنا پورا زور لگا دینگے!،، جواب ملا -

''میں اچھا اسی وقت ہو سکتا ہوں جب میرا بیٹا پانچ روبل کما کر لائے اور مجھ سے کہے: 'ابا! یہ آپ کے ہیں، آپ انہیں رکھ لیجئے'- ،،

دو دن بعد اس کا بیٹا اس کے پاس آیا اور پانچ روبل کا ایک نوٹ دیتے ہوئے بولا:

''ابا! آپ یہ رکھ لیجئے - میں نے کوئی‌سو کی آوار گھاٹی میں لٹھے بہا کر یہ پیسے کمائے ہیں - ،،

باپ نے نوٹ کو دیکھا، بیٹے پر نظر ڈالی اور نوٹ آتش‌دان میں جھونک دیا - بیٹا دم بخود کھڑا رہا، اس کا چہرہ اتر گیا تھا جیسے کسی نے اسے طمانچے لگائے ہوں -

بات یہ تھی کہ یہ نوٹ اس کے ایک چچا نے شانگری کی خواہش کے بارے میں سن کر بطور امداد دیا تھا -

پھر کئی دن بیت گئے۔ ایک دن بیٹا پانچ روبل کا نوٹ لئے دوبارہ باپ کے پاس پہنچا:

''گونیب میں نئی سڑک کی تعمیر ہو رہی ہے، میں نے مزدوری کرکے یہ رقم کمائی ہے۔''

باپ نے اب کے بھی نوٹ کو اور پھر بیٹے کو دیکھا اور نوٹ کو توڑمروڑ کر کھڑکی سے نیچے پھینک دیا۔

بیٹا دم سادھے کھڑا رہا۔ یہ نوٹ اسے باپ کے گوتسالی والے دوست نے دیا تھا۔

کچھ دنوں بعد بیٹا پھر باپ کے پاس آیا، ھاتھ میں پانچ روبل کا نوٹ لئے۔ اس بار باپ نے بیٹے کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ ھاتھ سے نوٹ لے کر اس کے دو ٹکڑے کر دئے۔ بیٹے نے باز کی طرح جھپٹ کر نوٹ کے ٹکڑے باپ سے چھین لئے اور ان کو جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

''کیا میں نے پتروسک میں اصطبلوں کی صفائی کرکے یہ نوٹ اسی لئے حاصل کیا تھا کہ آپ ردی کاغذ کی طرح اسے پھاڑ کر پھینک دیں؟'' وہ چلا اٹھا۔ ''ذرا میرے ھاتھوں میں پڑے ان گھٹوں کو تو دیکھئے!''

''ھاں! اب مجھے یقین آگیا کہ یہ پیسے خود تم نے کمائے تھے۔''

شانگری میں جان آگئی اور وہ دھیرے دھیرے اچھا ھونے لگا اور ایک دن اپنے پیروں پر کھڑا ھو گیا۔

جی ھاں! قدروقیمت کی حامل وھی چیز ھوتی ہے جسے خود آپ نے کمایا ھو، جو خود آپ کی محنت کا نتیجہ ھو۔

غالباً شاعری پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ اگر آپ نے کسی نظم پر جی‌جان لگا دیا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف قابل قدر ھوگا۔ لیکن اگر سرسری طور پر ذھن میں کوئی خیال آیا اور آپ نے اسے الفاظ میں ڈھال دیا تو یہ حقیقتاً نظم نہیں بن سکے گا۔

اکثر میں نے دیکھا ہے
اپنے زرگر ھمسائے کو

کیسے وہ کازاب پہ کس کر
اک پل میں بتلا دیتا ہے
اس زیور میں سونا کتنا
تانبا کتنا ہے

میرے پڑھنے والو! تم قدروں کے پارکھ ہو
میرے پاس تمہاری یہ کازاب نہ ہوتی
تو میں کیسے کہہ پاتا
میری نظموں میں سونے اور تانبے کا
میل ہے کتنا
تانبا کتنا
سونا کتنا

اگر آپ لذیذ مچھلی کھانا چاہتے ہیں تو جھیل پر جا کر پانی میں بنسی ڈالئے اور اپنے آپ مچھلی کا شکار کیجئے۔ عقاب ہوا کے خلاف اڑتا ہے مچھلی رو کے خلاف تیرتی ہے۔ شاعر اسی وقت لکھتا ہے جب گہرے جذبات نے اس کے دل میں ہل‌چل مچا دی ہو، چاہے ان جذبات میں غم اور اذیت کا پلڑا خوشی اور مسرت کے مقابلے میں بھاری ہو۔ اس سلسلے میں ابوطالب نے مجھے ایک کہانی سنائی تھی۔

بلخار کے کمھاروں، ان کے بنائے برتنوں اور ان ناکارہ لڑکوں کی کہانی جنہوں نے انہیں خریدا تھا۔ کمھاروں نے اپنے برتن بڑے بڑے جھابوں میں سجائے اور پھر ان کو اپنے گدھوں اور خچروں کی پیٹھوں پر یوں لادا کہ برتن دونوں طرف برابر سے جھول گئے۔ اس اہتمام کے بعد وہ مٹی کے برتن بیچنے شہر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں انہیں گاؤں کے شرارتی لڑکوں کا ایک گروہ ملا۔

''کمھارو! کہیں دور جا رہے ہو؟''
''برتن بیچنے بازار جا رہے ہیں۔''
''ان برتنوں کی قیمت کیا ہے؟''

''چھوٹے برتنوں کی قیمت ۲۰ کوپک ہے اور بڑے برتنوں کی ۵ کوپک۔ ''

''یہ کیوں؟''

''اس لئے کہ چھوٹے برتن بنانا زیادہ مشکل کام ہے۔ ''

لڑکوں نے سارے برتن خرید لئے۔ کمھاروں نے گدھوں اور خچروں کا رخ گھر کی طرف موڑتے ہوئے لڑکوں سے کہا:

''تمہیں یہ برتن پسند آئینگے۔ یہ بڑے مضبوط بنے ہیں، اتنے مضبوط کہ تمہارے پوتوں کے کام بھی آ سکتے ہیں۔ ''

یہ کہکر کمھار پہاڑوں کی طرف چل پڑے۔ ایک چوٹی پر پہنچ کر انہوں نے دم لینے کا ارادہ کیا۔ وہاں سے انہوں نے نیچے اس راستے پر نظر دوڑائی جس سے گذرکر وہ یہاں تک پہنچے تھے۔ اور تب انہوں نے دیکھا کہ گاؤں کے وہ لڑکے جنہوں نے ان کے خوبصورت برتن خریدے تھے کس طرح کے کھیل میں مصروف ہیں۔ انہوں نے کھائی کے سرے پر ایک ایک کرکے وہ برتن رکھ دئے جو انہوں نے خریدے تھے اور پھر ۲۰ — ۲۰ قدم پیچھے ہٹ گئے اور پتھر اٹھاکر انہیں اپنا نشانہ بنانے لگے۔ غالباً مقابلہ یہ ہو رہا تھا کہ کون کتنے برتن توڑتا ہے۔ برتن ٹوٹتے تو آواز سی ہوتی اور پھر ان کے ٹھیکرے نیچے کھائی میں بکھر جاتے لڑکوں کو اس میں بڑا مزا آ رہا تھا۔

یہ دیکھ کر سب کمھار ایک ساتھ چیخ پڑے: ''بدمعاشو! بند کرو یہ کھیل۔ ہم نے اپنے بہترین برتن تمہارے ہاتھ بیچے تھے اور تم نے ان کا کیا حشر کیا۔ لعنت ہو تم سب پر'' کمھار اپنے خنجر چمکاتے دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

''ناراض کیوں ہو رہے ہو؟ تم لوگوں نے برتن بیچ دئے، ہم نے پیسے دے کر خرید لئے، اب یہ برتن ہماری ملکیت ہیں۔ ہم ان کا جو چاہیں کریں، تمہیں اس سے کیا مطلب۔ یہ ہماری مرضی ہے، ہم انہیں توڑ دیں، گھر لے جائیں یا کالے چور کو دے دیں۔ ''

''برتنوں کی فکر ہمیں نہ ہوگی تو پھر کسے ہوگی۔ ہم نے برتن بنانے سے پہلے مٹی تیار کی اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا

پھر ہم نے جی جان لگا کر اس مٹی کو برتنوں کی شکل دی تا کہ لوگ دیکھیں اور ہمارے فن کی داد دیں۔ ہم نے سمجھا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر خوش ہونگے انہیں حسن ومسرت کا احساس ہوگا۔ جب ہم نے تم لوگوں کے ھاتھ برتن بیچے تھے تو ہم نے کچھ اس طرح سوچا تھا کہ تم کسی کوزے میں مہمان کو بوزا پلاؤگے، کسی مٹکے میں پہاڑی چشمے کا ٹھنڈا پانی جمع کروگے اور کسی گملے میں ایسا پیڑ لگاؤگے جس میں خوبصورت اور رنگارنگ پھول کھلینگے۔ اور بدمعاشو! تم نے انہیں ریزہ ریزہ کر دیا۔ اس کھائی میں برتنوں کے ٹکڑے نہیں بکھرے ھیں، تم لوگوں نے ھمارے کام، ھماری محنت اور ھمارے خوابوں کی دھجیاں بکھیر دی ھیں۔ تم نے ھمارے برتنوں پر اسی طرح پتھر چلائے ھیں جس طرح بیوقوف بچے کسی خوبصورت اور خوش الحان چڑیا پر پتھر چلاتے ھیں۔ ''

کمھاروں نے سارے ایسے برتن جمع کئے جو ٹوٹے نہیں تھے اور اپنے گھر کی طرف روانہ ھو گئے۔

کمھاروں کو جو اذیت پہنچی اس کا اندازہ تو وھی کر سکتا ھے، جس نے کام کیا ھو، جی‌جان لگا کر محنت کی ھو اور محنت کا نتیجہ سامنے آیا ھو تو اس پر پورا اطمینان محسوس کیا ھو۔

ابوطالب کی سنائی ھوئی کہانی یہاں ختم ھو گئی۔

نہ جانے کیسے یہ کہانی اس دن میرے ذھن میں ابھر آئی جس دن میں نے وطن سے بہت دور جاپان میں لڑکیوں کو موتیوں کی تلاش میں سمندر میں غوطے لگاتے دیکھا۔ گٹھے ھوئے اور خوبصورت جسموں‌والی یہ لڑکیاں سمندر کی تہہ تک جاتیں، ان کے پھیپھڑے پھٹنے کے قریب ھو جاتے۔ وہ جلدی جلدی کچھ سیپیاں چنتیں، کمر سے لٹکے ھوئے تھیلوں میں بھرتیں اور واپس آ جاتیں۔ ھزارھا سیپیاں توڑنے کے بعد کہیں جا کر ان کی قسمت جاگتی اور گوھر مراد ھاتھ آتا۔ اب آپ ھی سوچئے کہ اصلی موتیوں کا کوئی ھار بنانے کے لئے کتنی بار غوطہ لگانا پڑتا ھوگا، کتنی ھزار سیپیاں توڑنی پڑتی ھونگی؟

کیا روزانہ کی گفتگو میں استعمال ہونےوالے الفاظ کو پرو کر گیت کی ایک مالا تیار کرنا کوئی آسان بات ہے؟ سارے عام الفاظ، واقعات، احساسات اور زندگی کے تجربے بھی ایک سمندر کی طرح ھیں جس کی گہرائیوں میں فراخ دلی کے ساتھ قدرت نے سیپیاں بکھیر دی ھیں۔ لیکن موتی چننےوالے کو سمندر کی پراسرار گہرائیوں میں لگاتار تلاش جاری رکھنے کے لئے کتنی ھمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس کے لئے اسے اپنی ساری صلاحیت، اپنا سارا صبروتحمل، اپنی صحت اور اپنا استقلال وقف کر دینا پڑتا ہے۔ اس میں قسمت کا بھی ھاتھ ھوتا ہے۔ غوطہ‌خوروں کا صبر و استقلال، چاندی کی کھدائی میں نیلو بھرنےوالے کوباچی کے سناروں کا صبر و استقلال بھی صلاحیت سے ھی تعلق رکھتا ہے، یہ صلاحیت بھی ہے اور جفا کشی بھی۔

میں کوباچی نگر میں جاتا ھوں
مانگ کر ذوق و شوق لاتا ھوں
اور یوں اپنی پیاری نظموں کو
جاوداں، جاوداں بناتا ھوں

ضابطے جنہیں ہر پہاڑی جانتا ہے۔

لڑکی کی شادی اس وقت تک نہ کرو جب تک وہ بالغ نہ ھو جائے۔

جوتے تب تک نہ اتارو جب تک دریا کے کنارے نہ پہنچ جاؤ!

چولہے پر برتن تب تک نہ چڑھاؤ جب تک شکار نہ مار لو!

روپہلی لومڑی کا مالک وہ نہیں جس نے اسے دیکھا ھو، وہ ہے جس نے اسے پکڑا ھو۔

یاد کی ایک جھلک۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں جو کہانی سنانے جا رھا ھوں وہ کبھی آپ کو نہ سناتا، کیونکہ اس سے میرے بارے میں آپ جو رائے قائم کرینگے وہ کچھ بہت زیادہ اچھی نہ

ہوگی۔ مگر اب جو ہونا ہے ہو، کہانی شروع ہو گئی تو زبان روکنے کا سوال ہی کہاں رہ جاتا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں یہ بات ٹھیک ہی کہی جاتی ہے کہ ''پانی کمر تک پہنچ چکا ہو تو گردن تک پہنچ جانے میں کیا حرج ہے،، اور پھر یہ کہ ''جب تھیلا کھول دیا گیا تو اس کا سارا سامان باہر نکال لو!،،

بات یہ ہے کہ یہ کتاب بہت پہلے ہی مکمل ہو چکی ہوتی، اگر یہ احمقانہ حادثہ نہ پیش آ گیا ہوتا جو میں بیان کرنے جا رہا ہوں۔

میری عادت ہے کہ اگر کتاب شروع کر دوں تو اس کا مسودہ اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں۔ یوں میرے مسودے میرے ساتھ مختلف ملکوں کا لمبا لمبا دورہ کر چکے ہیں۔ اور اس کی وجہ بھی ہے۔ کوئی نہ کوئی صبح ایسی ضرور ہوتی ہے جب مجھے کوئی اور کام نہیں ہوتا، اور جب بھی ایسا ہوتا ہے میں اپنے کمرے میں مسودہ لے کر بیٹھ جاتا ہوں، اسے باربار پڑھتا ہوں اور ایک آدھ صفحے کا اضافہ کر دیتا ہوں۔ چنانچہ اس کتاب نے بھی میرے ساتھ ساتھ سمندروں اور خشکی‌وتری کے بڑے بڑے سفر کر چکی ہے۔

ایک بار برسلز کی واپسی پر میں ''موسکوا،، ہوٹل میں اترا جہاں آٹھویں منزل پر مجھے ایک کمرہ مل گیا۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی بتا دوں کہ ''موسکوا،، میرے لئے محض ایک ہوٹل نہیں بلکہ دوسرا گھر ہے۔ جب سے میں ادیب بنا ہوں اور کاروباری مصروفیت کی بنا پر راجدھانی آنے لگا ہوں تب سے گنا جائے تو میں نے اپنی نصف‌زندگی اس ہوٹل ہی میں گذاری ہے۔

یہاں کے سارے کلرک، خادم اور خادمائیں مجھ سے اچھی طرح واقف ہیں اور میں بھی انہیں خوب پہچانتا ہوں۔ میں ہمیشہ ''موسکوا،، میں ٹھہرتا ہوں یہ بات ماسکو میں میرے دوستوں کو بھی معلوم ہے اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کےلئے محض یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ ''رسول ماسکو آ گیا ہے،، وہ اسے ایک کھلی دعوت سمجھتے ہیں کہ جب بھی فرصت ہو مجھ سے ملنے آ جائیں۔

ابھی میں ہاتھ منھ بھی نہیں دھو پاتا کہ فون کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں، دروازے پر دستکوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور دیکھتے دیکھتے کمرہ اس طرح بھر جاتا ہے کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں رہ جاتی۔ ہوٹل کا کمرہ گاؤں کا مکان نہیں ہوتا مگر ہم پہاڑی اپنی صدیوں پرانی روائت کے مطابق اپنے کسی مہمان سے اس کا نام تین دن تک نہیں پوچھتے اور چونکہ اس کمرے میں کوئی بھی اتنے دنوں تک نہیں ٹھہرتا اس لئے آنے والوں میں بہت سے ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کے نام تک میں نہیں جان پاتا۔

چنانچہ برسلز کی واپسی پر بھی حسب معمول میں "موسکوا" میں ٹھہرا ہوا تھا اور حسب معمول میرے کمرے میں دوستوں کی بھیڑ جمع تھی۔ بعض لوگ میری واپسی کا خیرمقدم کرنے آئے تھے، بعض داغستان کےلئے رخصت کرنے اور بعضوں کے آنے کا کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ اسی طرح بعض لوگوں کو میں نے مدعو کیا تھا اور بعض بن بلائے مہمان بنے ہوئے تھے۔

بعض لوگوں کی ہم نے تعریفیں کیں اور جوش وخروش کے ساتھ ان کے جام صحت پئے۔ کچھ لوگوں کو ہم نے زور زور سے تنقید کا نشانہ بنایا اور اس لئے ان کی صحت کے جام پینا اور بھی زیادہ ضروری بن گیا۔ باتیں بھی جاری تھیں اور شغل مےنوشی بھی، ہم ہنستے اور قہقہے لگاتے رہے، گاتے اور ان سب کے ساتھ شراب کے جام بھی چڑھاتے رہے۔ سگریٹوں کا دھواں کمرے میں اس قدر بھر گیا تھا جیسے کسی پلنگ یا کسی میز کے نیچے سیلی لکڑی سلگ رہی ہو۔

ابوطالب کا کہنا ہے کہ تین حالتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔

اول تو جب سارے ہی مہمان جمع ہو چکے ہوں، کسی آخری مہمان کے آنے کے انتظار کی کیفیت نے۔

دوم بیوی کی سجائی ہوئی کھانے سے بھری میز پر بیٹھ کر اس بیٹے کے انتظار کی کیفیت نے جسے ووڈکا لینے کے لئے بھیجا ہو اور وہ آ ہی نہ رہا ہو۔

اور آخری کیفیت اس آخری مہمان کے جانے کے انتظار کی کیفیت ہے جو سارے مہمانوں کے چلے جانے کے بعد بھی جما ہوا ہو۔ پوری شام یہ مہمان خاموش رہا ہے، پھر اس نے رخصت لی، میں اس کے ساتھ دروازے تک آیا اور وہاں اس نے باتوں کا سلسلہ شروع کر دیا جو ختم ہونے ہی کو نہ آ رہی ہیں گویا وہ اب تک کی خاموشی کا بدلہ لے رہا ہو۔

آپ تھکے ہوئے ہوں، آنکھیں نیند سے بوجھل ہوں مگر اس کی بکواس سننی ہی پڑے گی۔ آپ اس کی ہر بات پر صاد کرتے چلے جا رہے ہیں تاکہ اختلاف سے کوئی بحث پھر نہ چل پڑے۔ مگر یہ اتفاق رائے بھی اس کے لئے مزید گفتگو کا اشارہ بنتا جا رہا ہے۔

تو اس شام مجھے بھی پالا ایک ایسے ہی مہمان سے پڑ گیا تھا، اسی شام جس کا ذکر چھڑ گیا ہے اور جو میرے لئے انتہائی اندوہناک ثابت ہوئی۔ سب لوگ چلے گئے مگر وہ رکا رہا، چپکا رہا، سگریٹ پر سگریٹ پیتا رہا اور ان کو پردوں پر، کرسیوں کی پشت پر، میرے سوٹ کیس پر اور میز پر رکھے کاغذات پر رگڑرگڑ کر بجھاتا رہا۔

پہلے اس نے میری تعریف کی، میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ پھر اس نے اپنی تعریف شروع کر دی، میں اس سے بھی اتفاق کرتا رہا۔ پھر وہ اپنی بیوی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہا۔ مجھے اس سے بھی اتفاق کرنا ہی تھا۔ آخر وہ مجھے گالیاں دینے لگا، برا بھلا کہنے لگا، اس کے بعد بھی میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ ''اب یہ سلسلہ خود اس کی ذات تک پہنچے گا، پھر بیوی کا نمبر آ جائے گا،، میں نے خوف سے سوچا، مگر ٹھیک اس وقت جب اسے منطق کے مطابق اپنی ذات کے بارے میں انکشافات کرنے تھے، اس پر اچانک غضب کی نیند ٹوٹ پڑی اور وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ مگر اس عالم میں بھی اسے میرا اتنا خیال تھا کہ چلتے چلتے میری تشفی کے لئے اگلے روز آنے کا وعدہ کر گیا۔

ایک کہاوت ہے کہ مہمان کو یوں تو جدھر سے دیکھو وہ خوبصورت نظر آتا ہے لیکن کبھی کبھی سب سے خوبصورت

منظر وہ ہوتا ہے جب اس کی پشت آپ کی طرف ہو۔ یہ کہاوت مجھے اس وقت جتنی سچی محسوس ہوئی پہلے اتنی سچی کبھی نہیں معلوم ہوئی تھی۔ رخصت ہوتے ہوئے مہمان کی پشت مجھے بےحد خوبصورتی لگ رہی تھی۔ ''چلو۔ طوفان گذر گیا،، میں نے خود سے کہا ''اب میں کچھ دیر اطمینان سے سو سکونگا،،۔ میں نے جلدی جلدی دروازہ بند کیا، بستر میں گھس گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔ نیند پرسکون تھی اس طرح جیسے باہر جھڑی لگی ہو اور آپ لحاف اوڑھ کر سو رہے ہوں۔ سوتے ہوئے میں خواب دیکھتا رہا کہ میں آگ کے قریب لحاف اوڑھے لیٹا ہوں اور آگ کے گرد کچھ چرواہے بیٹھے تاپ رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً وہ الاؤ میں لکڑیاں ڈالتے جاتے ہیں، لکڑیوں کا دھواں میری آنکھوں میں لگ رہا ہے اور میری ناک میں سوزش سی ہونے لگی ہے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ڈبل روٹی تیار کرنےوالی کسی فیکٹری میں جا پہنچا ہوں، تنور دھک رہا ہے اور جلتے ہوئے آٹے کی مہک پوری فضا میں بکھری ہوئی ہے۔ منظر پھر بدل گیا، اب میں نے دیکھا کہ اتوار کو اپنے دوستوں کے ساتھ میں تفریح کے لئے دیہی علاقے میں ہوں اور ہم لوگ خوشبودار کباب تل رہے ہیں۔

میری آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں اور آنکھ کھل گئی۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھا مگر دھواں اتنا بھرا ہوا تھا کہ مجھے کچھ نظر نہ آ سکا۔ پھر مجھے دوسرے کونے میں دروازے کے قریب یوں لگا جیسے شعلہ سا لپک رہا ہو۔ میں تیزی سے آگے بڑھا، اندھیرے میں میرا سوٹ کیس جل رہا تھا۔

یہ وہ سوٹ کیس تھا جس پر دنیا کے بعض بہترین ہوٹلوں کی پرچیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ میرے ساتھ لاتعداد ملکوں کا چکر لگا چکا تھا اور لاتعداد کسٹم آفسوں سے گذر چکا تھا، پوری سلامتی کے ساتھ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں کبھی ایسی کوئی چیز رہی ہو جسے کسٹم‌والے باہر نہ جانے دیتے لیکن آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کسٹم‌والوں کےلئے ووڈکا کی بوتل یا ضرورت سے زائد سگریٹ کا کوئی پیکٹ بھی (بیوی کے لئے خریدے گئے کسی خوبصورت بلاؤز کی بات تو دور رہی) جو

آپ دوستوں کے لئے لے جا رہے ہوں اعتراض کا باعث بن جاتا ہے اور آپ عتاب کا شکار ہو سکتے ہیں۔

تو میرا وہ سوٹ کیس جو لاتعداد کسٹم آفسوں سے بخیر وخوبی گذر چکا تھا ''موسکوا،، ہوٹل کے ایک پرسکون کمرے میں اپنی موت سے دوچار ہوا۔

میں نے جلدی جلدی اس کے جلتے ہوئے حصے اٹھائے اور غسل کرنے کے ٹب میں ڈال کر نل کھول دیا۔ دھویں کا ایک نیا بادل اٹھا۔ اب تک میرے ہاتھ جل چکے تھے اور شاید جلن کے آثار میرے چہرے سے بھی ظاہر ہونے لگے تھے۔ لیکن اب بھی وہ کرسی دھک رہی تھی جس پر سوٹ کیس رکھا ہوا تھا، قالین سے شعلے نکل رہے تھے، اور پردہ بھی جل رہا تھا۔ میں نے لپک کر فون اٹھایا تاکہ ہوٹل کے عملے کو اطلاع دوں۔

''میں جل رہا ہوں،، فون پر چلاتے ہوئے میں نے کہا ''فوراً آؤ!،،

فون پر جس لڑکی نے یہ آواز سنی، اس نے سوچا کہ رسول کو اگر کوئی چیز جلا سکتی ہے تو وہ ہے محبت کی آگ اور اس وقت اس محبت کا رخ خود اسی کی طرف ہے، اس لئے اس نے مادرانہ پیار کے ساتھ ڈانٹ بتائی:

''میں جانتی ہوں، رسول! بس تم سو جاؤ! صبح تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔،،

اف، عورت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ میں نے مذاق میں کہہ دیا کہ میں جل رہا ہوں اور وہ یقین کرکے میری مدد کو آ گئیں۔ اور آج جب زندگی میں پہلی بار میرا سابقہ سچ مچ کے شعلوں سے پڑا ہے تو کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔

بہرحال میں ایک آگ بجھانے والے نڈر سپاہی کی طرح تن تنہا شعلوں سے نپٹتا رہا۔ آخر میں نے ان شعلوں پر قابو پا ہی لیا جو قالین، کرسی، پردے اور یہی نہیں بلکہ لکڑی کے فرش کو بھی اپنی زد میں لے چکے تھے اور فرش تو کوئلے میں بدلنے لگا تھا۔ جی ہاں، میں نے آگ بجھا تو دی مگر بجھتے بجھتے بھی وہ مجھے بہت کچھ نقصان پہنچا گئی۔

میرا خیال ہے کہ آگ کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ میرے مہمان نے جن پر نشہ خاصا چڑھ چکا تھا سگریٹ کا کوئی جلتا ہوا ٹکڑا میرے سوٹ کیس میں ڈال دیا۔ میری قمیصیں جلیں، ایک سوٹ جلا اور وہ تحفے اس آگ کی نذر ہوئے جو میں برسلز سے لایا تھا۔ ہوٹل والوں کو قالین سے لے کر پردے تک سب کچھ بدلنا پڑا اور اس پر خاصی رقم خرچ ہوئی۔ اب رہا میں تو مجھے اسپتال لے جایا گیا، وہاں سے میں نے اپنی بیوی کو فون کیا کہ بعض خاص وجوہ سے مجھے روک لیا گیا ہے اور چونکہ میں نے وجہ کے بارے میں پہلے سے کچھ سوچا نہ تھا اسلئے مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ دوبارہ فون کرکے وجہ بتاؤنگا۔ جی ہاں، یہ سارا ہنگامہ سگریٹ کے ایک ٹکڑے کی وجہ سے ہوا۔

لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ یہ ساری چیزیں اس نقصان کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں جس سے مجھے زبردست دھچکا لگا۔ بات یہ تھی کہ اسی سوٹ کیس میں میرا ایک مسودہ بھی تھا جس پر میں پچھلے دو برسوں سے مسلسل کام کر رہا تھا۔

کانٹے سے نکل جانے والی مچھلی ہی سب سے بڑی مچھلی محسوس ہوتی ہے، دل اسی شکار کے لئے باربار مچلتا ہے جس پر نشانہ نہ لگا ہو، اور جی اسی عورت کے لئے تڑپتا ہے جو تمہیں چھوڑ کر چلی گئی ہو۔

میرے مسودے کے بہت سے صفحات اس آگ کی نذر ہو گئے اور مجھے باربار محسوس ہوتا ہے کہ وہی سب سے بہتر صفحات تھے۔

کانٹے سے نکل جانے والی مچھلی کبھی بھی میری ملکیت نہیں رہی تھی، اسی طرح جو شکار میری زد پر نہ آ سکا وہ بھی میرا نہیں تھا، یا جو عورت مجھے چھوڑ کر چلی گئی اس کے بارے میں بھی یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ وہ میری تھی۔ لیکن آگ میں جلنے والے وہ صفحات میرے اپنے تھے۔ میری تخلیق تھے، میری رات دن کی محنت کا نتیجہ تھے اور اسی لئے ان کے تلف ہونے کا مجھے اس قدر غم ہوا اور اسی لئے میرا یہ خیال ہے کہ وہ میری سب سے اچھی کتاب کے صفحات تھے۔

اچانک مجھے غم کا شدید احساس ہوا، اتنا ہی شدید جتنا فصل کٹ جانے کے بعد سنسان اور ویران کھیت غمگین دکھائی دیتا ہے یا ساری فصل کٹ جانے کے بعد کھیت کی وسعت میں بچ جانےوالا کوئی اکیلا پودا ہوتا ہے۔

جلے ہوئے صفحات کا ہر لفظ مجھے ایک موتی نظر آ رہا تھا اور ہر سطر بیش‌قیمت موتیوں کی ایک مالا محسوس ہو رہی تھی۔

میں کچھ اس قدر بدمزہ ہو گیا تھا کہ پورے دو سال تک یہ صفحات دوبارہ نہ لکھ سکا اور جب لکھنے بیٹھا، تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ان ہی چیزوں کے بارے میں دوبارہ لکھ تو سکتا ہوں لیکن جلے ہوئے صفحات‌والی بات دوبارہ کبھی پیدا نہ کر پاؤں‌گا۔

یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ ماں‌باپ اپنے انتہائی پیارے بچے سے محروم ہو جائیں۔ ان کے یہاں یقیناً آئندہ بھی بچے پیدا ہونگے اور وہ ان سے بھی اسی طرح پیار کرینگے، لیکن یہ دوسرے بچے ہونگے وہ بچہ نہ ہوگا جس سے وہ محروم ہو چکے ہیں اور جس کی کمی وہ زندگی‌بھر محسوس کرتے رہینگے۔

لوگ کہتے ہیں شاعری پانی کی بےرنگی سے نفرت کرتی ہے۔ شعر آگ کی طرح ہوتے ہیں اور شاعری کی تخلیق جلنے کی طرح ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظموں کو پانی کی طرح بےرنگ نہیں ہونا چاہئے مگر خدا انہیں اس طرح کی آگ سے ہمیشہ دور رکھے جو ہوٹل کے اس کمرے میں میرے مسودے کا مقدر بنی۔

ابوطالب کے مکان میں چوری کا قصہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کیسے ہوا یا اس کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا یا ایسا کیوں تھا کہ اس دن ابوطالب کے گھر میں کوئی نہ تھا۔ بہرحال واقعہ یہ ہے کہ ان کے مکان میں چوری ہو گئی۔ ان کی بیٹی کی سونے کی گھڑی، سونے کی ایک انگوٹھی، کچھ بالیاں اور بعض دوسری بیش‌قیمت چیزیں چوروں کے ہاتھ لگیں۔ اس کے علاوہ فر کے کوٹ، جوتے، کپڑے اور کچھ نقدی بھی

گئی۔ ابوطالب کی بیوی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا اور ان کی بیٹی پلنگ پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور ابوطالب خاموشی کے ساتھ بازو کے کمرے میں چلے گئے اور فرش پر بیٹھ کر زورنا بجانے لگے۔

زورنا کی آواز سن کر ان کی بیوی دوڑتی آئیں:

''تمہارے دل میں ذرا بھی درد نہیں رہا ہے۔ یہ زورنا بجانے کا وقت ہے؟ بھاگ کر کسی پولیس والے کو بلاؤ۔ سرکاری وکیل کے پاس جاؤ۔''

''لیکن قسمت نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔ میری نظمیں جوں کی توں موجود ہیں۔ یہ رہے میرے مسودے، چوروں نے ایک نظم پر بھی ہاتھ نہیں ڈالا۔ پھر رونے کی کیا ضرورت؟''

''تمہاری نظموں کی ضرورت ہی کس کو ہے؟ اور وہ بھی لاک زبان میں؟''

''بہت سی چیزیں تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ جنہیں شاعر کہا جاتا ہے ان میں بھی بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی گاڑی صرف چوری کے سہارے چلتی ہے، وہ دوسروں کی نظمیں چرانے کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ خدا کا شکر ہے، میری نظمیں بچ گئیں۔ میں نے پورے سال ان پر محنت کی ہے اگر ایک بھی چوری چلی جاتی تو زبردست نقصان ہوتا۔ پھر چور میرا زورنا بھی چھوڑ گئے، تو میں کیوں نہ خوشی کا اظہار کروں اور زورنا بجاؤں؟''

بیوی اور بیٹی کے بین وبکا سے بے نیاز ابوطالب مزے سے بیٹھے زورنا بجاتے رہے۔

کہانی جو ایفندی کاپیئف نے سنائی۔ گرمیوں کا وہ بڑا خوشگوار دن تھا۔ سلیمان استالسکی اپنے مکان کی چھت پر لیٹے آسمان کی بلندیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پوری فضا چڑیوں کی چہکار سے گونج رہی تھی، اور بہتے ہوئے پہاڑی چشموں کی آواز ماحول میں رس گھول رہی تھی۔ ایسی حالت میں جو بھی انہیں دیکھتا وہ یہی سمجھتا کہ سلیمان آرام کر رہے ہیں۔

ان کی بیوی نے بھی یہی سمجھا۔ انہوں نے زینے پر آکر آواز دی :

''خنکالیاں تیار ہو گئیں۔ میں نے کھانا نکال دیا ہے آکر کھالو!،،

سلیمان نے نہ ان کی طرف مڑ کر دیکھا نہ کوئی جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد آئینہ نے پھر آواز دی :

''خنکالیاں ٹھنڈی ہو رہی ہیں۔ سارا مزہ چوپٹ ہو جائے گا۔،،

سلیمان پر اب بھی کوئی اثر نہ ہوا۔

بیوی نے سمجھا کہ ان کا موڈ نیچے آنے کا نہیں، سو وہ کھانا لے کر اوپر آ گئیں اور ان کی طرف کھانا بڑھاتے ہوئے بولیں :

''تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ دیکھو، میں نے کتنی اچھی خنکالیاں پکائی ہیں۔ لو! ان کا مزہ تو لو!،،

سلیمان غصے میں اٹھ کر کھڑے ہوئے اور محبت کرنے والی بیوی پر برس پڑے :

''تم مجھے کبھی کام نہیں کرنے دیتیں۔ بیچ میں ٹانگ ضرور اڑاتی ہو۔،،

''لیکن تم تو صرف لیٹے تھے۔ کام تو کر نہیں رہے تھے۔ میں نے سوچا...،،

''تمہیں کیا معلوم میں کام کر رہا تھا، اب کبھی ایسے میں ٹانگ مت اڑانا۔،،

اور واقعہ بھی یہی تھا۔ اس دن سلیمان نے ایک نئی نظم لکھی۔

تو آپ جانیں، شاعر اس وقت بھی کام کرتا رہتا ہے جب وہ اپنی چھت پر لیٹا آسمان کی وسعتوں کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

رفیق زندگی پر لکھ رہا تھا نظم اک شاعر
''مری انجم، مری مہ پارہ، میری صبح جاں پرور
تو آ جائے تو رس گھل جائے میری زندگانی میں
بچھڑ جائے تو جینا تلخ، جیسے زہر کا نشتر،،

اچانک آ گئی کمرے میں ''اس کی صبح جاں پرور''
اسے دیکھا تو غصہ آ گیا مصروف شاعر کو
وہ بولا ''وقت تم برباد کرنے کو پھر آ پہنچیں
خدا کے واسطے جاؤ! مجھے کچھ کام کرنے دو!''

ابا نے یہ قصہ سنایا تھا۔ محبت کے مغنی محمود ایک بار کسی معزز آدمی کے یہاں مدعو تھے۔ دوسرے مہمان بھی موجود تھے۔ محمود آدھی رات تک اپنا کلام سناتے رہے۔ پھر سب لوگ سونے کے لئے اٹھ گئے۔ محمود کو مہمان‌خانے میں سب سے اچھا کمرہ دیا گیا۔ میزبان نے سونے سے پہلے اس کمرے میں ایک تسلا اور پانی سے بھرا ایک گھڑا لا کر رکھا تاکہ محمود صبح کو وضو کر سکیں اور شب بخیر کہہ کر سونے چلے گئے۔

صبح ہوئی تو اس خیال سے کہ محمود کی آنکھ ممکن ہے نہ کھلی ہو اور ان کی نماز نہ قضا ہو جائے، ان کے میزبان نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ شاعر ساری رات نہیں سوئے تھے محمود رات بھر نظم لکھتے رہے تھے اور اس وقت بھی غالیچے پر بیٹھے لکھ رہے تھے اور زیر لب یہ مصرعے گنگنا رہے تھے:

ہاں خیالوں کی پرستش نہیں بس میں میرے
مجھ کو اس فرض سے فرصت کی اجازت دے دو
میرا مسجود نہیں کوئی محبت کے سوا
بس مجھے اس کی عبادت کی اجازت دے دو

''محمود! صبح کی نماز کا وقت ہو گیا، لکھنا بند کر دو، نماز کا وقت نکل جائے گا۔''
''میری نظم ہی میری نماز ہے''، محمود نے جواب دیا۔
دیکھا آپ نے، شاعر اس وقت بھی کام کرتا ہے، جب دوسرے عبادت میں مشغول ہوتے ہیں۔

اپنی نوٹ بک سے۔ اور اب میں آپ کو ایک آوار شاعر کا قصہ سنا رہا ہوں۔ میں اس کا نام نہیں بتاؤنگا کیونکہ میں یہ نہیں چاہتا کہ لوگ اس پر انگلیاں اٹھائیں اور اس کا مضحکہ اڑائیں، کیونکہ قصہ واقعی مضحکہ‌خیز ہے۔

شاعر کی شادی ہو رہی تھی۔ رسمیں ختم ہوئیں تو مہمان رخصت ہونے لگے۔ آخر نوعروس جوڑا اکیلا رہ گیا اور وقت آیا کہ وہ حجلۂ عروسی میں چلا جائے جسے زندگی کی اس خوبصورت‌ترین رات کے لئے خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ دولہن سجے ہوئے بستر پر لیٹی ہوئی دولھا کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن دولھا نے بستر عروس کی طرف جانے کے بجائے کرسی کھینچی اور میز پر بیٹھ کر ایک نظم لکھنے لگا۔ ساری رات وہ نظم لکھتا رہا، ایک طویل نظم اپنی محبت کے بارے میں، اپنی دولہن کے بارے میں اور زندگی کی اس خوبصورت‌ترین رات کے بارے میں۔

کیا ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں کہ شاعر شب زفاف میں بھی کام کرتا ہے؟ اگر میں اس آوار شاعر کی طرح لکھتا ہوتا تو میرے شعری مجموعوں کی تعداد آج کے مقابلے میں ۵۰ گنا زیادہ ہوتی، مگر مجھے یقین ہے کہ ان میں خلوص کی پرچھائیں بھی نظر نہ آتی۔

اگر کوئی شخص اس وقت بھی لکھنے میں مصروف رہے جب اس کی نئی دولہن ہم‌آغوش ہونے کےلئے تڑپ رہی ہو، اگر وہ اپنی محبوبہ کی موجودگی میں بھی قلم و کاغذ کو ایک طرف نہ رکھ سکے تو وہ شاعر نہیں نقال اور فریبی ہے۔ اس کا تخلیقی سرمایہ دوسروں کے مقابلے میں ۱۰، ۲۰ گنا زیادہ ہو سکتا ہے لیکن اس میں خلوص کی بو بھی نہ ہوگی۔

انسان کو کام یقیناً کرنا چاہئے۔ ایک بار ایک بےحد عقل‌مند آدمی ایک پیڑ کے نیچے منھ کھول کر لیٹ گیا اور یہ انتظار کرتا رہا کہ سیب آپ‌ہی‌آپ اس کے منھ میں ٹپک پڑینگے۔ لیکن ایک بھی سیب اس کے منھ میں نہ آیا۔

مگر کام اور جفاکشی سے زیادہ، یہی نہیں بلکہ صلاحیت سے بھی زیادہ ضروری چیز شاعر کے لئے خلوص ہے، خلوص تمام انسانوں سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔

کہاوت ہے کہ بہادر گھوڑے کی پشت پر ہوتا ہے یا زمین کے نیچے قبر میں۔

ایک اور کہاوت ہے کہ ''روئے زمین پر سب سے زیادہ بدصورت اور بھیانک منظر کون‌سا ہوتا ہے؟،،

''ڈر اور خوف سے لرزتا ہوا مرد۔ ،،

''اور اس سے بھی زیادہ؟،،

''ڈر اور خوف سے لرزتا ہوا مرد۔ ،،



صداقت اور جرأت

''امام اس کو بناؤ جو سب میں عاقل ہو''
صلاح یہ سر مجلس کسی بزرگ نے دی
اک اور مردخدا نے کہی یہ ہوش کی بات
''جری جو سب سے زیادہ ہو، ہے امام وہی''

جلوس‌مسند شاہ زمن پہ آساں ہے
مگر حکومت‌اقلیم شاعری مشکل
کہ اس کو چاہئیں ان ساری خوبیوں کے سوا
ہزار خوبیاں ایسی کہ کانپ اٹھتا ہے دل

آوار قوم کی ایک مقبول داستان۔ برسہا برس سے سچ اور جھوٹ شانہ بہ شانہ مصروف سفر ہیں اور برسہابرس سے ہی ان میں یہ تکرار جاری ہے کہ دونوں میں سے کون زیادہ مضبوط، زیادہ ضروری اور زیادہ سودمند ہے۔ جھوٹ کا دعوی ہے ''میں ہوں'' اور سچ کہتا ہے ''میں''۔ اور یہ تکرار کبھی ختم نہ ہو پائی۔

ایک دن دونوں نے طے کیا کہ دنیا میں چلیں اور لوگوں سے اس کا فیصلہ کرائیں ۔ جھوٹ اچھلتا کودتا، ٹیڑھے میڑھے راستوں پر دوڑتا، ایک ایک کونے اور ایک ایک گوشے میں جھانکتا، تاکتا، ایک ایک سوراخ میں سر ڈالتا اور ایک ایک موڑ پر مڑتا ہوا آگے بڑھا ۔ سچ نے سیدھی اور چوڑی چکلی شاہراہیں اپنائیں جن پر وہ شاہانہ آن بان کے ساتھ چلتا رہا ۔ جھوٹ کے قہقہے فضا میں گونج رہے تھے لیکن سچ افسردہ کچھ سوچتا ہوا چل رہا تھا ۔

دونوں بہت سارے شہروں اور دیہاتوں سے گذرے، اور لاتعداد شاہراہیں ان کے قدموں کی آہٹیں سنتی رہیں ۔ وہ بادشاہوں سے ملے، شاعروں سے بھی، نوابوں، تاجروں اور قسمت کا حال بتانےوالوں سے بھی اور عام انسانوں سے بھی ۔ جہاں بھی جھوٹ کے قدم گئے لوگ زیادہ مطمئن اور پرسکون نظر آنے لگے ۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھ سے آنکھ ملاتے، ہنستے، قہقہے لگاتے اور جھوٹ بولتے ۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان سے جھوٹ بولا جا رہا ہے اور وہ بھی جی کھول کر جھوٹ بول رہے ہیں ۔ اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مسرور اور مطمئن محسوس کرتے ۔ نہ انہیں ایک دوسرے کو دھوکہ دینے پر شرم محسوس ہوتی اور نہ جھوٹ بولنے پر ۔

اور جب سچ کے قدم پہنچتے تو لوگوں کے چہرے بجھ جاتے، وہ ایک دوسرے سے آنکھیں چرانے لگتے اور ان کے سر زمین پر جھک جاتے ۔ جہاں بھی سچ کے قدم پہنچے لوگوں نے اس کے لئے تلواریں کھینچ لیں، زخم خوردہ زخموں کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے، خریدار تاجر کے خلاف، عام انسان نواب کے خلاف اور نواب بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ۔ شوہر نے بیوی کو اور اس کے عاشق کو قتل کر دیا ۔ وہ خون خرابہ ہوا کہ توبہ ہی بھلی ۔

اس لئے زیادہ‌تر لوگوں نے جھوٹ سے کہا ۔

''ہمیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ، تم ہمارے دوست ہو ۔ تم ساتھ رہو تو زندگی آسانی اور خوش‌دلی کے ساتھ گذاری جا سکتی ہے ۔ '' پھر وہ سچ سے مخاطب ہو کر بولے : ''تمہارے

پاس صعوبتوں کے علاوہ اور کیا ہے۔ تم ساتھ ہو تو ہمیں سوچنا پڑتا ہے، محسوس کرنا پڑتا ہے، مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں اور لڑنا پڑتا ہے۔ کتنے ہی سپاہی، شاعر اور سورما محض تمہاری وجہ سے خاک وخون میں لوٹ چکے ہیں۔،،

''دیکھا؟،، جھوٹ نے سچ سے کہا۔ ''اب تو تم یہ مان ہی لو کہ میں تم سے زیادہ ضروری اور سودمند ہوں۔ ہم جہاں بھی گئے لوگوں نے میرا استقبال کیا، تمہارا نہیں۔،،

''ہاں! ہم زمین پر واقع لاتعداد بستیوں میں گھوم چکے۔ اب آؤ، پہاڑ کی چوٹیوں پر چلیں۔ آؤ، ہم اب پہاڑ پر بہنے والے ٹھنڈے پاکیزہ چشموں سے، اس کی گود میں کھلنے والے پھولوں سے اور اس صاف شفاف برف سے رائے لیں جو چوٹیوں پر ہمیشہ اپنی آب وتاب دکھاتی رہتی ہے۔

''یہ چوٹیاں ہزارہا سال پرانی زندگی کا مسکن ہیں۔ ان پر سورماؤں، بہادروں، شاعروں، حکیموں اور پیغمبروں کے لازوال کارنامے زندہ ہیں، ان پر ان کے افکار، ان کے نغمے اور ان کے تصورات آباد ہیں۔ ان چوٹیوں پر ابدیت کا مسکن ہے، اس ابدیت کا جس کے پاک دامن تک دنیا کی معمولی اور حقیر فکروں اور پریشانیوں کے ہاتھ نہیں پہنچ پاتے۔،،

''نہیں! میں وہاں نہیں جاؤں گا،، جھوٹ بول اٹھا۔

''کیوں؟ بلندیوں سے تمہیں ڈر لگتا ہے؟ نشیبی علاقوں میں تو بس زاغ وزغن کا بسیرا ہوتا ہے، شاہیں تو بلندترین چوٹیوں سے بھی اوپر پرواز کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم زاغ و زغن کی نہیں، شاہینوں کی صف میں شامل ہونا چاہوگے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم ڈرتے ہو۔ تم ہمیشہ سے بزدل ہو۔ تمہاری حکومت شادی کے ان ہنگاموں پر ہے جہاں شراب پانی کی طرح بہہ رہی ہو، مگر تم باہر قدم نکالنے سے ڈرتے ہو جہاں تلواریں چمچما رہی ہوں اور جہاں جام و مینا کی کھنک نہیں، تلواروں کی جھنکار گونج رہی ہو۔،،

''نہیں! میں تمہاری چوٹیوں سے نہیں ڈرتا۔ بات یہ ہے کہ وہاں میرا کوئی کام ہی نہیں کیونکہ وہاں انسان نہیں بستے۔ میری دنیا تو نیچے ہے جہاں لوگ بستے ہیں۔ یہاں

میری حکومت ہے اور سب میرے محکوم ہیں۔ چند لوگ جو بہادر ہیں مجھ سے بغاوت کرنے اور تمہارا ساتھ دینے، سچ کا ساتھ دینے کی جرأت کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد ہی کتنی ہے۔،،

''ہاں! یہ مٹھی بھر لوگ ہیں، مگر یہی سورما ہیں اور شاعروں نے انہیں سورماؤں کی یاد میں اپنے بہترین اشعار لکھے ہیں۔،،

ایک واحد شاعر کی کہانی۔ یہ کہانی مجھے ابوطالب نے سنائی تھی۔ ایک تھی ریاست جس میں شاعروں کی افراط تھی، جو گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے اور اپنے گیت سناتے، کسی کے ہاتھ میں وائلن ہوتا، کسی کے ہاتھ میں طنبورہ، کسی کے پاس چونگر ہوتا تو کسی کے پاس زورنا۔ نواب کو بھی جب کبھی اپنے حرم کی دلچسپیوں اور ریاست کے معاملات سے فرصت ہوتی تو وہ بھی ان کے گیت سن کر اپنا جی بہلاتا۔

ایک دن اس نے ایسا گیت سنا جس میں نواب کے ظلم و ستم، اس کی بے انصافیوں اور لالچ کی داستان بیان کی گئی تھی۔ نواب کے بدن میں آگ لگ گئی اس نے حکم دیا کہ باغیانہ گیت لکھنے والے شاعر کو گرفتار کرکے اس کے محل میں لایا جائے۔

گیت لکھنے والا شاعر تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکا۔ اب وزیروں اور نوکروں کو حکم ہوا کہ پوری سلطنت میں جتنے بھی شاعر ملیں سب پکڑ لئے جائیں۔ نواب کے آدمی دیہاتوں، پگڈنڈیوں، پہاڑی راستوں اور دوردراز گھاٹیوں میں پھیل گئے۔ انہوں نے ان سارے لوگوں کو پکڑ لیا جو شاعری کرتے یا گیت گاتے نظر آئے اور سب کو لا کر محل کے جیلوں میں ٹھونس دیا۔ اسی درمیان نواب بھی گرفتار شاعروں کے پاس آدھمکا۔

''تم میں سے ہر ایک اپنا ایک گیت مجھے سنائےگا،، اس نے حکم دیا۔

اور سبھی شاعروں نے یکے بعد دیگرے اپنے گیت سنا ڈالے۔ سبھی گیتوں میں نواب کی، اس کی حاضر دماغی، نرم‌دلی کی، اس کی خوبصورت بیویوں کی، اس کی عظمت و ثروت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے تھے اور یہ بتایا گیا تھا کہ روئے زمین پر آج تک اتنا عظیم اور منصف مزاج نواب دوسرا پیدا نہیں ہوا۔

یکے بعد دیگرے گرفتار شاعر رہا کئے جاتے رہے۔ بس تین شاعر محل کے قیدخانے میں باقی رہ گئے، یہ وہ تھے جنھوں نے نواب کی شان میں قصیدہ پڑھنے سے انکار کیا تھا۔ انہیں دوبارہ قیدخانے میں ڈال دیا گیا اور پھر یوں لگا جیسے نواب انہیں بھول گیا ہو۔

تین مہینے بعد نواب دوبارہ قیدیوں کے پاس آیا۔

''مجھے یقین ہے کہ اب تم میں سے ہر ایک اپنا گیت مجھے سنائے گا۔''

یہ سنتے ہی ان تینوں میں سے ایک نے نواب کی شان میں قصیدہ شروع کر دیا۔ اس کی حاضر دماغی، نرم‌دلی، خوبصورت بیویوں اور عظمت و ثروت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دئے۔ اس نے یہ بتایا کہ روئے زمین پر آج تک اتنا عظیم نواب پیدا ہی نہیں ہوا۔

اس شاعر کو آزاد کر دیا گیا، لیکن باقی دونوں شاعروں کو جنھوں نے نواب کا قصیدہ سنانے سے انکار کر دیا تھا ایک چوراہے پر لے جایا گیا جہاں دو الاؤ پہلے سے ہی تیار کر لئے گئے تھے۔

''تمہیں زندہ جلا دیا جائے گا۔'' نواب نے غصے میں کہا۔ ''آخری بار میں تمہیں حکم دے رہا ہوں کہ کم‌ازکم ایک نظم سنا دو!''

اب ایک اور شاعر پگھل گیا۔ وہ نواب کی، اس کی حاضر دماغی، اس کی نرم‌دلی، خوبصورت بیویوں اور عظمت وثروت کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ اس نے یہ بتایا کہ روئے زمین پر آج تک اتنا عظیم نواب پیدا ہی نہیں ہوا۔

اسے بھی چھوڑ دیا گیا۔

اب باقی بچا ایک شاعر، اس گروہ کا آخری فرد۔

''اسے کھمبے سے باندھ کر آگ لگا دو۔'' نواب نے حکم دیا۔

اچانک کھمبے سے بندھے ہوئے شاعر نے نواب کے ظلم‌وستم، بےانصافی اور لالچ کی داستان‌والا وہی گیت شروع کر دیا جس سے یہ سارا قصہ شروع ہوا تھا۔

"اسے فوراً رہا کرو۔ آگ سے فوراً باہر نکالو!" نواب نے چیخ کر حکم دیا۔ "میں ایک ایسے شاعر سے محروم ہونا نہیں چاہتا جو میری سلطنت میں اکیلا سچا شاعر ہے۔"

ابوطالب نے داستان ختم کرتے ہوئے کہا: "یہ بات نہیں کہ مجھے واقعی یقین ہو کہ کسی زمانے میں کوئی ایسا عقلمند اور نیک‌دل نواب گذرا ہے۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ اس طرح کے شاعر بھی کتنے ملینگے۔"

ابا بتاتے تھے کہ ایک دن لوگوں نے امام شامیل سے پوچھا:

"امام! آپ نے شعر لکھنے اور سنانے پر پابندی کیوں لگادی ہے؟"

"تاکہ سارے جھوٹے شاعروں سے نجات مل جائے اور صرف سچے شاعر ہی باقی رہیں، کیونکہ وہ میرے حکم کے بعد بھی شاعری کرتے رہینگے۔ البتہ جو جھوٹے اور نقلی شاعر ہیں وہ میرے حکم سے ڈر جائینگے، شاعری چھوڑ دینگے اور یوں لوگوں کو اور اپنے آپ کو دھوکہ دینے سے باز آ جائینگے۔" جواب ملا۔

"امام! آپ نے اراکان کے شاعر سعید کی نظمیں دریا میں کیوں پھینک دیں؟" دوسرا سوال کیا گیا۔

"سچی شاعری دریا میں بہائی نہیں جا سکتی کیونکہ وہ لوگوں کے دلوں پر نقش ہوتی ہے۔ اگر شاعری کی قدروقیمت بھی اتنی ہی ہو جتنی اس کاغذ کی جس پر وہ لکھی گئی ہے تو ایسی شاعری کے ساتھ یہی ہونا چاہئے۔ اراکان کے سعید کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ ایسی نظمیں لکھنے کے بجائے جو لہروں کے ساتھ بہہ جائیں، کوئی ایسا کام کرے جو واقعی مفید ہو۔"

لوگ کہتے ہیں کہ عظیم شاعر محمود کے انتقال کے بعد ان کے غم‌زدہ والد نے وہ تھیلا جس میں ان کے مسودے جمع تھے آگ میں جھونک دیا تھا۔

"لعنت ہے کاغذ کے ان ٹکڑوں پر جن کی وجہ سے میرے بیٹے کی موت وقت سے پہلے ہوئی۔"

اور یوں محمود کے سارے مسودے تلف ہو گئے اس کے باوجود محمود کی نظمیں آج بھی زندہ ہیں۔ ان کا لکھا ہوا ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو بھلا دیا گیا ہو۔ ان کے گیت عوام کے دلوں میں زندہ ہیں اور انہیں نہ تو کوئی آگ جلا سکتی ہے اور نہ کوئی پانی انہیں مٹا سکتا ہے کیونکہ وہ سچ کی آواز ہیں۔

ابا ہمیشہ ہنسا کرتے تھے:

ان لوگوں پر جو بدشگونی سے ڈرتے تھے اور رات کے اندھیرے میں چھپ کر سفر پر روانہ ہوا کرتے تھے۔

ان لوگوں پر جو گھوڑے کی زین سے لٹکے تھیلوں میں پتھر بھر لیا کرتے تھے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ ان تھیلوں میں روٹیاں بھری ہیں۔

ان شکاریوں پر جو تیتر کے بجائے کوے شکار کرکے لوٹتے تھے۔

یہ کہانی مجھے ابوطالب نے سنائی تھی۔ ایک آدمی تھا بہت غریب مگر اسے یہ خبط تھا کہ لوگ اسے امیر کبیر سمجھیں۔ وہ روزانہ گاؤں کی چوپال میں آتا، ہشاش بشاش، زندگی سے پوری طرح مطمئن، مسکراہٹیں برساتا، چکنائی اس کی مونچھوں سے ٹپکتی ہوئی جیسے ابھی ابھی وہ میمنے کا نرم اور چربدار گوشت کھا کر آ رہا ہو۔ وہ بلند آواز سے ڈینگ مارتا:

"واہ، کتنا چربدار تھا وہ میمنا جسے آج میں نے کھانے کے لئے ذبح کیا تھا، کتنا نرم اور مزیدار گوشت تھا اس کا۔"

گاؤں والے اکثر سوچا کرتے: "اسے روز ذبح کرنے کے لئے میمنا مل کہاں سے جاتا ہے، یہ راز جاننا ہی چاہئے۔"

ایک دن گاؤں کے کچھ تیز لڑکے اس کے مکان کی چھت پر چڑھ گئے اور انہوں نے چمنی سے جھانک کر اندر دیکھا۔ بچارا غریب آدمی کہیں سے ایک بڑی سی ہڈی اٹھا لایا تھا اور اسے

ابال رہا تھا اور پتیلی میں تھوڑی بہت جو چکنائی جم جاتی، وہ اسے انگلیوں سے سمیٹتا اور اپنی مونچھوں پر مل لیتا۔ پھر اس نے تھوڑا سا زیرہ لیا اور اس سے اپنا پیٹ بھرا، معلوم ھوا کہ گھر میں اس کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

لڑکے چھت سے اتر کر مکان میں داخل ھوئے۔

''اسلام علیکم! ھم ادھر سے گذر رہے تھے، سوچا آپ جیسے امیر کبیر پڑوسی کو سلام کرتے چلیں۔ ''

''آئیے، آئیے... آپ لوگوں نے دیر کر دی۔ ابھی ابھی میں نے کھانا ختم .کیا ھے۔ اف، کتنا چرب‌دار میمنا تھا... بس اب میں نکلنے ھی‌والا تھا۔ ''

''آپ ھمیں یہ بتائیے کہ اتنا خوشبودار زیرہ آپ کو کہاں سے ملتا ھے؟'' لڑکوں نے کہا۔

اور تب اس آدمی نے محسوس کیا کہ اس کا راز فاش ھو چکا ھے پھر کبھی نہ اسے ڈینگ مارتے سنا گیا نہ مونچھوں پر چربی لگاتے دیکھا گیا۔

یاد کی ایک جھلک۔ بچپن میں ابا نے ایک بار بری طرح میری مرمت کی تھی۔ میں اب یہ تو بھول گیا ھوں کہ انہوں نے مجھے کتنے طمانچے مارے تھے مگر یہ نہیں بھول سکا کہ یہ مار کیوں پڑی تھی...

ھوا یہ تھا کہ صبح کو میں نکلا تو اسکول جانے کے ارادے سے، لیکن گلیوں گلیوں گھومتا رہا، پورے دن اسکول سے غائب رھا اور شام تک آوارہ لڑکوں کے ساتھ سکہ اندازی کا کھیل کھیلتا رھا۔ اس دن ابا نے مجھے کتابیں خریدنے کے لئے کچھ پیسے دئے تھے۔ اور میں سب کچھ بھول کر جوا کھیلتا رھا۔ جلد ھی سارے پیسے ختم ھو گئے اور میں سوچنے لگا کہ کچھ اور پیسے کہاں سے لائے جائیں۔ آپ جانتے جواری کی تو یہ ذھنیت ھوتی ھی ھے کہ وہ جتنا ھارتا جاتا ھے اتنا ھی یہ احساس بڑھتا جاتا ھے کہ بس چند پیسے اور داؤں پر لگانے کو مل جائیں تو نہ صرف ھاری ھوئی رقم واپس مل جائے گی بلکہ جیت کا مال بھی ھاتھ آ جائے گا۔ چنانچہ مجھے بھی

یقین تھا کہ چند پیسے اور ملتے ہی میں اپنا نقصان پورا کر لونگا۔

میں نے ساتھی کھلاڑیوں سے قرض لینا چاہا۔ مگر ہارتے ہوئے کھلاڑی کو قرض کون دیتا ہے۔ ہارنےوالے کو قرض دینا بدشگونی سمجھی جاتی ہے اور ڈر رہتا ہے کہ قرض دینےوالا بھی ہارنے لگے گا۔

چنانچہ اب میں نے ایک اور اسکیم بنائی۔ گاؤں میں گھر گھر چکر لگانا شروع کیا۔ ہر جگہ یہ کہتا کہ کل پہلوان آنےوالے ہیں اور مجھے ان کےلئے پیسے جمع کرنے کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔

در در کی خاک چھاننےوالے آوارہ گرد اور بھوکے کتے کو ملتا بھی کیا ہے؟ کوئی چچوڑی ہوئی ہڈی پھینک دیتا ہے تو کوئی ایک ڈنڈا رسید کرتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا، کسی نے تو مجھے خالی ہاتھ لوٹا دیا، اور کسی نے میرے ہاتھ پر چند سکے رکھ دئے اور یہ بھی شاید اس لئے کہ اس کے دل میں ابا کا احترام تھا۔

گاؤں بھر میں مانگنے کے بعد میں نے سکے گنے۔ اب میں ایک بار پھر جوئے میں شریک ہو سکتا تھا۔ مگر یہ منحوس سکے بھی دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئے۔ اس کے علاوہ کھیل کے سلسلے میں ہمیں گھٹنوں کے بل دوڑنا پڑتا تھا چنانچہ شام ہوتے ہوتے میرا پتلون گھس گیا اور میرے چھلے ہوئے گھٹنے صاف نظر آنے لگے۔

اس درمیان گھروالوں نے میری غیرموجودگی محسوس کر لی اور میرے بڑے بھائی میری تلاش میں گاؤں کا چکر لگا رہے تھے۔ ادھر جن لوگوں سے میں نے پہلوانوں کی آمد کا ذکر کیا تھا وہ بھی مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے میرے گھر آ جا رہے تھے۔ بہرحال جب مجھے کان پکڑ کر گھر لایا گیا ہے، اس وقت تک میری کرتوت سبھی کو معلوم ہو چکی تھیں۔

پھر مجھے ابا کے سامنے پیش کیا گیا۔ دنیا میں جس چیز سے میں سب سے زیادہ ڈرتا تھا وہ تھا ابا کا فیصلہ۔ ابا نے سر سے پیر تک مجھے ایک بار دیکھا۔ میرے گھٹنے جو سرخ پڑ

گئے تھے اور جن پر ورم آ چکا تھا پتلون کے سوراخوں سے یوں جھانک رہے تھے جیسے ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے آنےوالی ہوا کو روکنے کے لئے اڑسے ہوئے پروں کے تکئے۔

''یہ کیا ہے؟،، ابا کی آواز پرسکون تھی (یا ہو سکتا ہے یہ میرا وہم رہا ہو)۔

''گھٹنے،، میں نے اپنی ہتھیلیوں سے پتلون کے سوراخ چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں، ہاں، تمہارے گھٹنے ہی ہیں۔ پوچھنا تو یہ ہے کہ وہ کیوں نظر آتے ہیں اور پتلون میں یہ سوراخ کہاں سے آ گئے؟،،

میں نے جھک کر پتلون پر اس طرح نظر ڈالی جیسے اس سے پہلے سوراخوں کا مجھے علم ہی نہ رہا ہو۔ جھوٹ بولنےوالوں اور بزدلوں کی نفسیات بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بزرگ سب کچھ سمجھ چکے ہیں اور معصوم بننے سے کوئی فائدہ نہیں ہونےوالا ہے، پھر بھی ان کے سوالات کا صحیح اور سیدھا سادہ جواب دینے کے بجائے آدمی طرح طرح کے بہانے تراشتا رہتا ہے۔

اب ابا کا لہجہ کچھ تیز ہو گیا۔ گھر کے دوسرے لوگوں کو اس کا مطلب معلوم تھا چنانچہ سبھی لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ ابا نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو دور ہو جانے کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے:

''ہاں! تو پتلون کیسے پھٹا؟،،

''اسکول میں... کیل سے پھنس کر...،،

''ذرا پھر سے تو کہنا...،،

''کیل سے پھنس کر...،،

''کہاں؟،،

''اسکول میں...،،

''کب؟،،

''آج۔،،

اور ابا کا تھپڑ میرے گال پر زور سے پڑا۔

''ہاں! اب پھر سے بتاؤ کہ پتلون کیسے پھٹا؟،،

میری زبان بند رہی۔ ایک اور تھپڑ دوسرے گال پر پڑا۔
''اب بتاؤ۔،،
میں نے رونا شروع کر دیا۔
''بند کرو رونا،، ابا نے حکم دیا اور کوڑا اٹھا لیا۔
میں نے رونا بند کر دیا۔ ابا نے کوڑا پٹکتے ہوئے کہا:
''اگر تم نے فوراً سب کچھ ٹھیک ٹھیک نہ بتایا تو میں کوڑے سے تمہاری کھال کھینچ لونگا۔،،
مجھے معلوم تھا کہ یہ کوڑا جس کے سرے پر موٹی سی گرہ ہے، جسم پر پڑےگا تو کیا حالت ہوگی۔ چنانچہ کوڑے کا ڈر سچ کے ڈر پر حاوی ہو گیا۔ میں نے دھیرے دھیرے صبح سے لےکر شام تک کے سارے واقعات بیان کر دئے۔
پیشی ختم ہو گئی، لیکن تین دن تک میری بری حالت رہی۔ گھر بھی پہلے جیسا تھا اور اسکول بھی، مگر میں ویسا نہیں رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ ابھی ابا سے اس موضوع پر بات ہونی ہے۔ میں چاہتا بھی تھا کہ بات ہو جائے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں شدت کے ساتھ اس کی ضرورت محسوس کر رہا تھا اور میرے لئے سب سے زیادہ تکلیف‌دہ بات یہ تھی کہ ان تین دنوں میں ابا نے ایک بار بھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔
تیسرے دن مجھ سے کہا گیا کہ ابا بلا رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھ سے اسکول اور پڑھائی کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک پوچھ بیٹھے:
''تمہیں معلوم ہے، اس دن تمہیں سزا کیوں دی گئی تھی؟،،
''جی ہاں۔،،
''بتاؤ!،،
''جوا کھیلنے پر۔،،
''نہیں۔ ہرگز نہیں! کون ہوگا جس نے بچپن میں جوا نہ کھیلا ہو؟ میں نے بھی کھیلا ہے اور تمہارے بڑے بھائیوں نے بھی...،،
''پتلون پھٹ گیا تھا اسلئے...،،
''نہیں۔ اس لئے بھی نہیں کیونکہ بچپن میں کس کے پتلون نہیں پھٹتے اور قمیصیں چیتھڑے نہیں ہوتیں؟ تعجب تو

اس پر ہوتا ہے کہ اس عمر میں لوگوں کے سر کیسے سلامت رہ جاتے ہیں۔ تم لڑکی تو نہیں ہو کہ راستوں سے لجاتے شرماتے گذرو...،،

''تو پھر اسکول سے بھاگ آنے پر...،،

''اس میں کسی قدر صداقت ضرور ہے کیونکہ اس دن کا سارا معاملہ شروع اسی سے ہوا۔ اسکول سے بھاگنے، کپڑے پھاڑنے اور جوا کھیلنے پر تمہیں سزا ضرور ملتی، لیکن زیادہ سے زیادہ میں نے تمہاری گوشمالی کی ہوتی۔ میں نے جو سزا تمہیں دی ہے، اس کی وجہ بیٹے یہ ہے کہ تم نے جھوٹ بولا۔ اور جھوٹ بولنا نہ کوئی اضطراری غلطی ہے نہ اتفاقی حادثہ، یہ تو کردار کی ایک خاصیت ہوتی ہے جس کی جڑیں گہری بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ تمہاری روح کے کھیت میں اگنےوالی ایک انتہائی خطرناک گھاس ہے۔ اگر اسے ابتدا میں ہی اکھاڑا نہ جائے تو یہ بڑھ کر پورے کھیت کو گھیر لیتی ہے اور اتنی بھی جگہ باقی نہیں رہتی ہے کہ اچھے بیجوں کے انکھوے پھوٹ سکیں۔ جھوٹ بولنے سے زیادہ بری چیز کوئی اور نہیں اور اس عادت سے چھٹکارا پانا جتنا مشکل ہے اتنا مشکل کوئی اور کام نہیں۔ تم نے اگر دوبارہ جھوٹ بولا تو میں تمہیں جان سے مار ڈالونگا۔ اسی لمحے سے تم سچ بولوگے، صرف سچ۔ گھوڑے کی نعل ٹیڑھی ہو تو تم اسے ٹیڑھی کہوگے، صراحی کا دستہ ترچھا ہو تو تمہیں کوئی بھی مصلحت اسے ترچھا کہنے سے نہ روک سکےگی، درخت میں گانٹھیں ہوں تو تم یہی کہوگے کہ اس میں گانٹھیں ہیں۔ آ گئی بات سمجھ میں؟،،

''جی ہاں!،،

''اچھا! اب جاؤ!،،

میں ان کے پاس سے اٹھا تو یہ عہد کرکے کہ اب کبھی جھوٹ نہیں بولونگا۔ دوسری باتوں کے علاوہ مجھے اچھی طرح احساس تھا کہ اگر میں جھوٹ بولوں‌گا تو ابا اس کے باوجود کہ وہ مجھ سے بےحد محبت کرتے ہیں، میری جان لینے میں ذرا بھی تامل نہیں کرینگے۔

کافی دنوں بعد میں نے یہ قصہ اپنے ایک دوست کو سنایا۔

''افوہ! تو تم نے اس چھوٹے سے جھوٹ کو اب تک یاد رکھا ہے؟،، اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور میں نے اس کا جواب اس طرح دیا تھا:

''جھوٹ جھوٹ ہے اور سچ سچ۔ ان میں سے کوئی بھی بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا۔ زندگی بھی ایک حقیقت ہے اور موت بھی ایک حقیقت۔ موت آتی ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے اور جب تک زندگی باقی ہے موت دور رہتی ہے۔ یہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں کیونکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جھوٹ اور سچ کا بھی یہی حال ہے۔،،

جھوٹ شرمناک، گندہ اور قابل نفرت ہوتا ہے اور سچ کے معنی ہیں پاکیزگی اور حسن، وہ صاف شفاف آسمان کی طرح ہوتا ہے۔ جھوٹ بزدلی کی علامت ہے اور سچ جرأت و ہمت کی۔ آدمی بزدل ہوگا یا جری، اس میں بین بین کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

آج کل جب میں کسی جھوٹے ادیب کی لکھی کوئی جھوٹی کتاب پڑھتا ہوں تو مجھے بےساختہ ابا کا کوڑا یاد آ جاتا ہے اس معاملے میں وہ کتنا مفید ثابت ہوتا۔ ان ادیبوں کو کتنی شدت کے ساتھ ایک سخت‌مزاج لیکن انصاف پرور باپ کی ضرورت ہے، جو انہیں متنبہ کرتا رہے: ''اگر تم جھوٹ بولے تو میں تمہیں جان سے مار دونگا۔،،

لیکن محض اتنا ہی نہیں کہ لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور انہیں سزا نہیں ملتی۔ بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سچ بولنے پر سزا ملتی ہے۔ کیا تاریخ میں ایسی لاتعداد مثالیں نہیں ملتیں جب لوگوں کو محض اس لئے اذیتیں جھیلنی پڑی ہیں کہ وہ سچے تھے؟ کیا انہیں سچ بولنے کے جرم پر کوڑے نہیں کھانے پڑے ہیں؟

جب میں بچہ تھا تو مجھے جھوٹ بولنے کی عادت چھوڑنے اور سچ بولنے کی عادت ڈالنے کے لئے بڑے جتن کرنے پڑے تھے اور بڑی ہمت سے کام لینا پڑا تھا، مگر جب سچ کی عادت پڑ گئی تو مجھے بڑا سکون ملا۔

مگر سچ سے آنکھیں نہ چرانے کےلئے تو اور بھی زیادہ جرأت درکار ہوتی ہے۔ اگر آپ سچ کو رد کر دیں تو آپ کو سکون نہیں ملے گا، بلکہ شدیدترین اذیت جھیلنی ہوگی، وہ اذیت جسے ضمیر کی اذیت کہا جاتا ہے۔

بہادر لوگ اپنے اعتقاد بدلا نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ زمین گھومتی ہے اور سورج کے گرد گھومتی ہے، سورج اس کے گرد چکر نہیں لگاتا۔ وہ جانتے ہیں کہ رات کے بعد ہمیشہ صبح آتی ہے، پھر دن آتا ہے اور پھر وہ دن رات میں بدل جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ جاڑے کے بعد بہار کا موسم آتا ہے اور بہار کے بعد گرمیوں کا...

اور یوں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ضمیر کا کوڑا، عزت کے احساس کا کوڑا، اور صداقت کا کوڑا جھوٹے اور فریبی کی کھال کھینچ لیتا ہے اور آخر میں فتح سچ کی ہوتی ہے جھوٹ کی نہیں۔

<u>چوپال میں سنی بات‌چیت۔</u>

''جھوٹ اور سچ میں کتنا فاصلہ ہے؟،،

''ایک ورشوک کا۔ ،، (روسی پیمانہ جو ۱۰۷۵ انچ کے برابر ہوتا ہے۔)

''یہ کس طرح؟،،

''دراصل آنکھ اور کان کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہوتا ہے۔ جو کچھ آپ آنکھ سے دیکھتے ہیں وہ سچ ہے اور جو کانوں سے سنتے ہیں وہ جھوٹ ہے۔ ،،

یقیناً اس میں صداقت ہے۔ اپنی آنکھوں سے کسی چیز کو دیکھنا، چاہے وہ ایک بار ہی کیوں نہ ہو، دوسروں سے اس چیز کے بارے میں سینکڑوں بار سنتے رہنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ لیکن ادیب کو سچائی تک پہنچنے کے لئے سارے وسیلے اختیار کرنے چاہئیں۔ اسے دیکھنا بھی چاہئے اور سننا بھی، پڑھ کر بھی سچائی کا پتہ لگانا چاہئے اور اپنے تجربے سے بھی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ادیب محض اپنی آنکھوں پر انحصار کر بھی کیسے سکتا ہے؟ زندگی کو وہ آنکھوں سے دیکھتا

ضرور ہے لیکن موسیقی سننے کے لئے اسے کانوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے اور اپنے ملک کی تاریخ جاننے کےلئے پڑھائی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بلکہ بعض ادیب تو ایسے بھی ہیں جو اپنی آنکھوں اور کانوں کے مقابلے میں قوت شامہ کو ترجیح دیتے ہیں۔

ادیب کو ایسے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر طرح کا کام انجام دے سکیں، مضبوط پیروں کی ضرورت ہوتی ہے اور مضبوط دانتوں کی بھی، تاکہ اس نے جو کچھ دیکھا، سنا اور پڑھا ہے اس میں سے سچ اور جھوٹ کو الگ کر سکے، کھوٹے سونے اور کھرے سونے میں فرق کر سکے، بھوسے سے اناج کے دانے الگ کر سکے۔ اسے ذہانت اور علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہانت اور علم کے بغیر کوئی انسان ان باتوں پر بھی یقین نہیں کر سکتا جن کا اس کی آنکھیں مشاہدہ کرتی ہیں۔

پہاڑوں کے کچھ معصوم باشندوں کو ایک دن ایک بھاری صندوق مل گیا۔ ان لوگوں نے سونے کے بارے میں باتیں تو بہت سن رکھی تھیں لیکن سونا کبھی دیکھا نہیں تھا۔ انہوں نے سوچا کہ "یہ صندوق بھاری ہے اس لئے یقیناً سونے کا ہوگا"، اور پھر اس کی ملکیت کے لئے آپس میں لڑنے لگے۔ لڑتے لڑتے انہوں نے ایک دوسرے کو قتل کر دیا اور بعد میں پتہ چلا کہ صندوق تو تانبے کا تھا۔

صلاحیت آگ کی طرح ہوتی ہے۔ آگ اگر بیوقوفوں کے ہاتھ لگ جائے تو اردگرد کی ہر چیز کو جلاکر راکھ کر سکتی ہے۔ یہ ذہانت ہی ہے جو اسے قابو میں رکھتی ہے اور آگ ہی کو کیوں، ذہانت تو حسن کو بھی اس طرح قابو میں کر لیتی ہے جس طرح کوئی ہوشیار شہسوار تندخو گھوڑے پر قابو پا لیتا ہے۔

ایک بار دو پہاڑیوں سے پوچھا گیا، تم کیا پسند کروگے، جوانوں جیسا خوبصورت چہرہ یا بوڑھوں جیسی عقل۔

جو بیوقوف تھا اس نے جوانوں جیسا چہرہ پسند کیا۔ لیکن بیوقوف کا بیوقوف رہا اور اپنی بیوقوفی کی بنا پر اپنی بیوی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ جو ہوشیار تھا اس نے عقل کا انتخاب کیا

اور اپنی بیوی کو ساتھ رکھنے میں کامیاب رہا۔ ایک کہانی میں بھی کچھ ایسا ہی ہے جس میں عقل کا انتخاب کرنے والے ہیرو نے اپنی خوبصورت ہیروئن کو سمندری گھوڑے کی سواری کرانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ایک اور کہانی بھی بڑی مشہور ہے۔ یہ تین بھائیوں، تین راستوں اور تین ھوشیار مشیروں کی کہانی ہے۔ وہ بھائی جس نے عقلمند مشیروں کی صلاح پر عمل کیا کامیاب و کامران وطن واپس آیا اور جن بھائیوں نے ان کی بات نہیں مانی وہ پردیس میں مارے گئے۔

اے، میری سنہری مچھلی، مجھے صلاحیت عطا کر، مجھ میں صلاحیت سے کام لینے کا جذبہ پیدا کر، مجھے جوانوں جیسا مخلص اور پرجوش دل عطا کر اور بوڑھوں جیسی تجربہ کاری اور عقل کی سنجیدگی بھی۔ مجھے وہ راستہ چننے میں مدد دے جو میرے لئے سب سے زیادہ مناسب ہو۔

میں تیکھے، پتھریلے اور خطرناک راستوں سے ڈرتا نہیں، لیکن سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا راستہ بھی نہیں چاھتا۔ ''سانپوں کے جسم اتنے بل دار کیوں ہوتے ھیں؟،، پہاڑوں میں اس کا جواب یوں دیا جاتا ہے: ''کیونکہ انہیں جن بلوں اور سوراخوں میں رینگنا پڑتا ہے وہ ٹیڑھے میڑھے ہوتے ھیں،،۔ لیکن میں سانپ نہیں انسان ھوں اور مجھے رفعتیں، صاف ھوائیں اور سیدھے راستے پسند ھیں۔

ھاں! بیماری اور خوف سے، بوجھل شہرت اور متلون افکار سے میری توبہ ہے۔

مجھے مدھوشی کی کیفیت سے بچا کیونکہ آدمی مدھوش ھو تو اچھی چیز سو گنی اچھی لگنے لگتی ہے۔

اور مجھے زیادہ ھوشمندی بھی نہ چاھئے کیونکہ ایسے آدمی کو بری چیز سو گنی زیادہ بری لگنے لگتی ہے۔

مجھ میں صداقت کا ایک احساس پیدا ھو۔ ایسا احساس کہ میں ٹیڑھے کو ھمیشہ ٹیڑھا ھی کہوں اور سیدھے کو ھمیشہ سیدھا۔

یہ دنیا ہے بری اسمیں نہ کوئی ڈھنگ نہ نظام
اک شاعر نے کہا اور کرلیا دنیا کو سلام

یہ دنیا ہے حسین مری محبوب، مری جان
دوسرے نے کہا اور کردیا خود کو قربان

تیسرا بھی اٹھا پاکر یاں سے ایسی شہرت
موت جسے دے نہیں سکتی ہے شکست
وہ خار کو خار، گل کو گل کہتا رہا
کہہ کے سچ مردانگی سے جیتا رہا

ایک پہاڑی نے اپنی گائے کے کانوں میں بالے ڈال دئے تھے تاکہ وہ مویشیوں کے جھنڈ میں اپنی گائے کو پہچان سکے۔ ایک اور پہاڑی تھا جس نے اپنے گھوڑے کی گردن میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں کا ھار پہنا دیا تھا تاکہ پڑوسیوں کے گھوڑوں میں اس کا گھوڑا کھو نہ جائے۔ مگر اس گھوڑسوار کی کیا وقعت جو رات کے اندھیرے میں اور خاصی دوری سے گھوڑوں کے غول میں اپنا گھوڑا نہ پہچان سکے۔

یہ رھی میری کتاب۔ نہ میں اسے بالے پہنانا چاھتا ھوں، نہ اس کی گردن میں گھنٹیاں باندھنا چاھتا ھوں اور نہ ھی کسی اور طرح اس کی آرائش کرنا چاھتا ھوں۔ کیونکہ میں دوسروں کی کتابوں کے ڈھیر سے اسے آسانی سے الگ کر سکتا ھوں اور مجھے امید ہے کہ میرے پڑھنےوالے بھی اسے آسانی سے الگ کر سکینگے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب کو جو بھی پڑھےگا (اس کا سرورق پھٹ جانے کے باوجود) بڑی آسانی سے کہہ سکےگا کہ یہ کتاب سدا گاؤں کے حمزہ کے بیٹے رسول کی کتاب ہے۔

لوگ کہتے ھیں: ھمتوالا یہ نہیں پوچھتا کہ پتھروں کی فصیل کتنی اونچی ہے۔



اندیشے

ہر سطر ہے مری کتابوں کی
راستہ چوٹیوں پہ جانے کا
آسماں چھولیں، کامراں ہوں اگر
اور تحت الثریٰ مقدر ہے
کوششیں اپنی رائیگاں ہوں اگر

یہ کتابیں ہیں جیت کے تمغے
ہو اگر عزم کوہ پیمائی
کیا ضمانت کہ کامراں ہونگے
پاؤں بہکے تو صرف اندھیارا
پائی منزل تو جاوداں ہونگے

داغستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں اور بہت سارے رنگ ملتے ہیں۔ لاتعداد ایسی رسمیں ہیں جنہیں وہاں کے باشندوں نے محفوظ رکھا ہے۔

ایک ایسی ہی رسم کے بارے میں مجھے تات زبان کے شاعر ہزگیل آوشالوموف نے بتایا تھا۔

پہاڑی علاقوں میں جب کسی کے یہاں بچہ نہیں پیدا ہوتا تھا تو شوہر ایک اونی پٹکہ باندھ لیتا تھا تاکہ خدا کی نظریں دوسرے پہاڑیوں سے گذرتی ہوئی اس پر ٹھہر سکیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ اللہ‌تعالی سے دعا مانگتا رہتا تھا:

"اللہ! اپنے غریب بندے پر رحم کر اور اسے ایک بیٹا عطا کر۔"

اس طرح کے پٹکے وہ لوگ بھی باندھتے تھے جن کے یہاں صرف لڑکیاں ہوں، اور وہ لوگ بھی جن کے لڑکے دبلے پتلے، اندھے، بہرے، گونگے، لنگڑے، کبڑے یا کسی اور جسمانی کمزوری اور ذہنی بیماری کے شکار ہوں۔ پہاڑ کے لوگ یہ پٹکہ اس امید پر باندھتے تھے کہ اگلی بار خدا ان پر رحم کرے گا اور انہیں ایسا بیٹا دے گا جو صحت مند ہو اور دلیر جوان نکلے۔

اندیشے مجھے بھی گھیرے ہوئے ہیں۔ کیا میں بھی وہ معجزنما پٹکہ باندھ لوں جو تات قوم کے لوگ اس لئے باندھتے ہیں کہ اگلی بار ان کے یہاں بیٹا پیدا ہو، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے صحت‌مند بیٹا؟ کیا میری نئی کتاب صحت‌مند بیٹے کی طرح ہوگی جو طرح‌دار جوان نکلے گا؟ یا پھر میری کوششوں کا نتیجہ ایک کبڑی اور لولی لنگڑی اولاد کی شکل میں سامنے آئے گا؟

یوں تو ہر ماں کو اپنا بچہ خوبصورت ہی لگتا ہے۔ وہ اس کی خامیوں کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرا اور میری نئی کتاب کا یہ حشر نہیں ہوگا۔

میرا دل دھڑک رہا ہے۔ قلم میرے ہاتھ میں کانپ رہا ہے۔ اور طرح طرح کے اندیشوں نے مجھے گھیر رکھا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں شاہین کے دھوکے میں کسی بلی کو نشانہ بنا رہا ہوں؟ میں نے جس رہوار پر زین کسی ہے کہیں وہ گھوڑے کے بجائے گدھا تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں کسی شہتیر کو کھینچ تان کر بڑھانے کی کوشش کر رہا ہوں، اخالچی کے لوگوں کی طرح جنہوں نے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ شہتیر چھت کی چوڑائی کے لئے تو بالکل ٹھیک ہے، مگر لمبائی میں نہیں لگایا جا سکتا؟ کہیں میں

بھی اسی طرح کی حماقت تو نہیں کر رہا ہوں جیسی ہاری کولون کے کسی شخص نے کی تھی۔ وہ اپنے گھر میں چولہے کے پاس بیٹھا تھا اور تصور یہ کر رہا تھا کہ اینڈے کے گڑھ پر اس نے حملہ کر دیا ہے۔

جیسے جیسے میری کتاب اختتام پر پہنچ رہی ہے، مجھ میں یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے کہ میں اس قصائی کی طرح ہوں جس نے مینڈھا ذبح کر لیا ہے، اس کے حصے بخرے کرتا ہوا دم تک جا پہنچا ہے، مگر ٹھیک اسی وقت چاقو ٹوٹ گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں انجام تک پہنچوں گا بھی یا نہیں؟ اور پہنچا تو نتیجہ کیا ہوگا؟ میں سمندر میں کود پڑا ہوں اور اس کی تہوں کو کھنگالنے کے بعد ایک صدف لے کر اوپر آیا ہوں۔ خدا جانے یہ صدف خالی ہے یا واقعی اس میں کوئی آب دار موتی موجود ہے؟

آندھی اور طوفان میں پیڑ کی شاخیں ٹوٹ سکتی ہیں اس کا تنا بھی مگر بہار آتے ہی جڑوں سے نئے کلے پھوٹنے لگتے ہیں اور ایک نیا پیڑ ابھرتا ہے۔ البتہ جب کسی پیڑ کو گھن لگ جاتا ہے اور اندر اندر اسے جڑوں تک کھوکھلا کرتا چلا جاتا ہے تو ایسے پیڑ کو بچایا ہی نہیں جا سکتا۔ انسان کا بھی یہی حال ہے۔ نظر آنےوالا زخم دیکھتے دیکھتے بھر جاتا ہے، یہی نہیں ٹوٹی ہوئی ہڈی بھی جوڑ دی جاتی ہے لیکن جسم کی گہرائیوں میں اتر جانےوالی بیماری کا کوئی علاج نہیں، یہ بیماری دھیرے دھیرے اسے قبر تک پہنچا دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں میری کتاب کس حد تک صحت‌مند ہے؟ اس کی جڑیں کتنی مضبوط اور توانا ہیں؟

میری کتاب ایک نوجوان بیٹے کی طرح ہے۔ گھر میں اب اتنی گنجائش نہیں رہی ہے کہ وہ بھی رہ سکے۔ اب اسے باہر لوگوں میں جانا ہے۔ اور میں سوچ رہا ہوں کہ باہر کی دنیا اس کا استقبال کس طرح کرےگی، گالیوں سے یا دوستی کا ہاتھ بڑھا کر؟ لوگ اس کی خاطر تواضع کرینگے، اسے اپنے مکان میں جگہ دینگے یا دروازے سے دھتکار دینگے؟ اب اس کا فیصلہ میرے اختیار میں نہیں رہا ہے۔

شاعر
نظم لکھ چکے
غالیچہ تیار ہوگیا
مگر ٹھہرو!
دیکھ لو کوئی نقش نا تمام تو نہیں رہا
کہیں کتر بیونت کی ضرورت تو نہیں باقی

شاعر
نظم پوری ہوچکی
گیہوں کا کھیت جوت چکے
مگر ٹھہرو!
ایک ایک لیکھ اور ایک ایک کیاری کو دیکھ لو
کہیں ھل کی نوک اور تمہاری نظر سے چوک تو نہیں ھوئی

میری کتاب بھی ایک ایسے قالین کی طرح ھے جو تیار ہو چکا ھے اور جسے بچھا دیا گیا ھے تاکہ بیک نظر پورے قالین کا جائزہ لیا جا سکے۔ میری نگاھیں اس کا جائزہ لے رھی ھیں، کہیں کوئی لائن ٹیڑھی ھو گئی ھے تو کہیں ڈیزائن میں کوئی خامی رہ گئی ھے، آرائش میں کہیں کجی آ گئی ھے اور صفائی نہیں ھے۔ لیکن اب کچھ بھی نہیں ھو سکتا کیونکہ قالین بنا جا چکا ھے اور اب معمولی سی خامی دور کرنے کے لئے بھی پورے قالین کو کھولنا پڑےگا۔

میری کتاب یوں ھے جیسے طویل اور تھکا دینےوالے سفر سے اپنے گاؤں کو واپسی۔ میں دو سال باھر رھا ھوں۔ دو سال تک گاؤں کے کسی بھی آدمی کو، چاھے وہ محض پڑوسی رھا ھو یا دوست، بوڑھا ھو یا جوان میرے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ میں گاؤں کے سب سے پہلے مکان کے سامنے گھوڑے سے اتر جاتا ھوں اور پھر گھوڑے کی لگام پکڑے آھستہ آگے بڑھتا ھوں۔ وہ چراغ جو پہاڑی عورت نے گھر کی کھڑکی پر اس لئے جلا رکھا تھا کہ مجھے روشنی ملتی رھے اب بجھایا جا سکتا ھے، کیونکہ میں واپس آ چکا ھوں۔ دوستو! اور عزیزو! میرا سلام لو! دو سال جگہ جگہ کی خاک چھاننے کے بعد میں

واپس آ گیا ہوں۔ میرے گھوڑے کی عمر میں بھی دو برسوں کا اضافہ ہو چکا ہے، خود میرے بالوں کی سفیدی کچھ بڑھ گئی ہے۔ میں گھوڑے کی لگام پکڑے آہستہ آہستہ گاؤں کی سڑکوں سے گذر رہا ہوں اور ہر ایک سے کہتا جا رہا ہوں:

''اسلام علیکم!،،

''وعلیکم السلام! رسول ابن حمزہ۔ کہو سفر کیسا رہا؟ تھکے ہوئے تو نہیں ہو؟ سفر سے کیا کیا لائے؟ یہ تمہارے تھیلوں میں کیا بھرا ہے؟،،

میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں ایک نئی کتاب کا مسودہ لے کر لوٹا ہوں۔ مگر مسودہ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ اسے گاؤں والوں کے ہاتھ میں سیدھے سیدھے رکھ دیا جائے۔ سب سے پہلے تو اسے ناشر کے پاس جانا چاہئے اور وہی یہ فیصلہ کرے گا کہ اس کا کیا ہو؟

ناشر مسودہ میرے ہاتھ سے لے لیتا ہے، وزن آنکتا ہے، الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے۔ پہلے صفحے پر نظر ڈالتا ہے، پھر ۵۰ واں صفحہ کھولتا ہے اور پھر آخری صفحہ۔ اس کے بعد احتیاط کے ساتھ مسودہ ایک طرف رکھ دیتا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ آپ کی یہ کتاب ہو سکتا ہے بہت اچھی ہو، مگر دقت یہ ہے کہ ہم نے اس سال اور اگلے سال کے لئے اشاعتی پروگرام تیار کر لیا ہے اور اس پروگرام میں آپ کی کتاب شامل نہیں۔،،

''شامل تو یہ میرے پروگرام میں بھی نہیں تھی۔ بس، اچانک اتر پڑی۔ سوال یہ ہے کہ اب اس کا کیا کیا جائے؟،،

''اچھا تو آپ مصنف کی حیثیت سے ایک درخواست لکھ دیں۔ ہم اس پر غور کرینگے اور کوئی حل نکالنے کی کوشش کریں گے۔ ہو سکتا ہے ایڈیٹر کے منصوبے میں اسے شامل کر لیا جائے۔ یوں کیجئے کہ اگلے سال ہمیں فون کر لیجئے گا یا خود ہی آ جائیے گا۔،،

ابوطالب کا خط اشاعت گھر کے نام۔

''داغستان کے عزیز اشاعت گھر! آپ کا عوامی شاعر،

داغستان کی اعلی سوویت کی مجلس صدارت کا رکن اور خصوصی وظیفہ پانےوالا ابوطالب عرض‌پرداز ہے کہ وہ اس سال زندگی کے ۸۰ سال پورے کرےگا۔ اسے معلوم ہے کہ وہ بیمار پڑا اور مرگیا تو آپ فوراً یہ فیصلہ کرینگے کہ دو جلدوں میں اس کا مجموعۂ کلام شایع کیا جائے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے مرنے کے بعد دو جلدوں میں اس کا مجموعہ شایع کرنے کے بجائے، آپ اس کا ایک ہی جلد کا مجموعہ اب چھاپ دیں۔ آپ کا ابوطالب۔ ،،

یہ تو ایک دوستانہ اور خوش طبعی پر مبنی درخواست تھی۔ دوسری طرح کی درخواستیں بھی آتی رہتی ہیں، جن میں شکائتیں ہوتی ہیں، کوسنے ہوتے ہیں یا پھر اپنی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں۔ درخواستوں میں روغن قاز بھی ملا جاتا ہے اور ان میں مظلوم کی کراہ بھی ہوتی ہے اور احتجاج کا نعرہ بھی۔

اس سے بھی زیادہ خراب درخواستوں کی وہ قسم ہے جو ناشر کو نہیں بلکہ افسران بالا کو بھیجی جاتی ہیں جن میں ناشر کو جی بھرکر برابھلا کہا جاتا ہے۔ بےچارا ناشر بھی تو ہمدردی کا مستحق ہے۔ کرسی ایک آدمی کے لئے ہو تو آپ اس پر تین چار آدمیوں کو نہیں بٹھا سکتے۔ اور اگر کچھ دیر کے لئے اس پر دو آدمی بیٹھ جائیں تو ان میں سے کوئی بھی اطمینان نہیں محسوس کر سکتا۔ ایک کہےگا: ’’آپ احمد کی کتاب کیوں چھاپ رہے ہیں، میری کیوں نہیں چھاپتے؟ کیا میں اس سے کچھ کم ہوں؟،، دوسرا چلائےگا: ’’آپ کے یہاں سے پچھلے برسوں میں جتنی بھی کتابیں نکلی ہیں، ان کے مقابلے میں میری کتاب سب سے اچھی ہے، اور آپ نے اس بار بھی اسے اشاعت کے منصوبے میں شامل نہیں کیا۔ ،،

میں ناشروں سے لڑنا نہیں چاھتا۔ میں اپنی باری کا انتظار کروں‌گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ناشر کے یہاں کاغذ کی ہمیشہ کمی ہوتی ہے۔ اور یہ سارا کاغذ چلا کہاں جاتا ہے؟ دراصل کاغذ ادیب برباد کرتے ہیں اور میں بھی ان میں شامل

ھوں ۔ اس‌لئے مجھے ناشر سے لڑنے کا حق بھی نہیں ۔ یقیناً کبھی کبھی یوں بھی ھوتا ھے کہ کاغذ کے کئی دستے برباد کرنے کے بعد ادیب کوئی ایسا معجزہ پیش کر دیتا ھے جس کی زندگی ادیب اور ناشر کی زندگیوں سے کہیں لمبی ھوتی ھے ۔ ھائے، مجھے کتنا ارمان ھے کہ کاغذ کا کوئی ایسا معمولی سا ٹکڑا چھوڑ جاؤں جس پر لکھے ھوئے الفاظ کاغذ کو پھر ایسے ھرے بھرے پیڑ میں تبدیل کر دیں جو اس کا اولین روپ تھا، ایسے الفاظ جن میں اکسیر جیسا اثر ھو اور جو دوبارہ پیڑ کو زندگی عطا کر دیں ۔

نہیں، میں ناشر سے قطعی لڑنا نہیں چاھتا ۔ میں تو اس سے دوستانہ انداز میں درخواست کرتا ھوں:

''جناب عالی! آپ میرے اور میرے گاؤں‌والوں کے درمیان کھڑے ھیں، میرے اور ماسکو نیز دوسرے شہروں میں میرے قارئین کے درمیان کھڑے ھیں ۔ آپ کی حیثیت تو درمیان کے اس آدمی جیسی ھے جو تال‌میل پیدا کرتا ھے، رشتے ملاتا ھے، ھے یا نہیں؟ تو پھر براہ کرم اس بات کی بس‌بھر کوشش کیجئے کہ میں اپنے قارئین تک پہنچ سکوں اور ان سے دوستی کا ھاتھ ملا سکوں ۔ کرم کیجئے، یہی میری التجا ھے...،،

ناشر صاحب میری اس درخواست کو قبول کر لیتے ھیں اور مجھے فوراً ایڈیٹر کے ھاتھوں میں سونپ دیا جاتا ھے ۔

ایڈیٹر ۔

''سائز کم کردو!،، دروازے پر تختی لگی ھوئی ھے ۔

ناشر نے مجھ سے کہا تھا: ''اگلے سال آنا،، اور ایڈیٹر نے اسے تین ھفتے کر دیا ۔ خاصا وقت مل گیا ھے، آئیے، آپ کو تین اور کہانیاں سنا دوں ۔

کس طرح ایڈیٹر کو کھڑکی سے باھر پھینکا گیا ۔ آوار زبان کے ایک شاعر نے ایک اخبار کے ایڈیٹر کے پاس کچھ اشعار بھیجے جو نئے سال کے پہلے شمارے کے لئے لکھے گئے تھے ۔ اشعار اچھے تھے اور اخبار میں شایع ھوئے ۔

خوش قسمت شاعر کے دوست احباب اس کے گھر جمع ہوئے۔ شاعر نے بڑے فخر کے ساتھ اخبار کھولا اور دوستوں کو اشعار سنانے لگا۔ اچانک اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے دل پر اس طرح ھاتھ رکھا جیسے کوئی تیر پیوست ھو گیا ھو اور اخبار اس کے ھاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ دوستوں نے بڑھ کر اسے سنبھالا، پانی پلایا۔ کچھ دیر بعد جب اس کی طبیعت سنبھلی تو دوستوں کو اس اچانک تبدیلی کا سبب معلوم ھوا۔ بات یہ تھی کہ ان اشعار میں سے ۴ مصرعے نکال دئے گئے تھے۔ وہ بھاگا بھاگا اخبار کے دفتر میں پہنچا۔

''وہ کون تھا جس نے میرے ان چار بہترین میمنوں کا گلا کاٹ دیا جنہیں میں نے آپ کے اخبار کے مرغزار میں چرنے کے لئے چھوڑ دیا تھا؟ کس نے میرے ۴ مصرعے خارج کر دئے؟''

''میں نے کیا ھے... بات کیا ھے؟'' ایڈیٹر نے سکون سے جواب دیا۔

''تمہاری ھمت کیسے پڑی؟..''

''ھمارے پاس کچھ ایسا مواد آ گیا تھا جسے فوری اشاعت کے لئے دینا تھا اور جگہ کی ضرورت تھی۔''

''اگر تم شاعر کی اجازت کے بغیر اس کی نظم کے مصرعے باھر نکال سکتے ھو تو میں بھی تمہیں کھڑکی کے باھر پھینک سکتا ھوں۔''

شاعر نے جس کی رگوں میں پہاڑی باشندوں کا خون دوڑ رھا تھا ایڈیٹر کے دونوں ھاتھ اور دونوں پیر پکڑے اور واقعی کھڑکی سے باھر پھینک دیا۔ معاملہ صرف دوسری ھی منزل کا تھا اور کھڑکی کے نیچے فرش بھی کچھ زیادہ سخت نہ تھا۔ بہرحال مقدمہ چلا اور شاعر نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا:

''جان کے بدلے جان۔ دانت کے بدلے دانت۔ اس نے میری 'قطع و برید، کی تھی، میں نے یہی عمل اس پر دھرا دیا۔''

میں جانتا ھوں کہ ایڈیٹر موصوف اب بھی 'قطع و برید، تو کرتے ھیں (کیونکہ اس کے بغیر وہ ایڈیٹر کیسے رہ سکتے ھیں) مگر اب وہ قطع وبرید سے پہلے مصنف سے اجازت لے لیتے ھیں۔

اپنی یادداشت سے۔ ابا نے دو ڈرامے لکھے۔ "موچی،، ایک کا عنوان تھا اور "کودولاف کی شادی،، دوسرے کا۔ پہلے یہ ڈرامے تھیٹر میں گئے، وہاں سے محکمہ ثقافت میں اور پھر داغستان کی آرٹ کونسل میں۔ ابا کو یہ بات قطعی طور پر معلوم تھی کہ ڈرامے یہیں تک پہنچے ہیں، آگے نہیں بڑھے ہیں۔ مگر آرٹ کونسل کے دفتر میں ڈراموں کے بارے میں سبھی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

جس طرح کوئی چرواہا پہاڑیوں میں گم ہو جانے والی بھیڑ کو تلاش کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے اور اس کی فکر نہیں کرتا کہ موسم کیسا ہے اور رات کتنی گذر چکی ہے، اسی طرح ابا بھی اپنے ڈرامے کی تلاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

کونسل میں ڈراموں کے لئے ایک خاص آدمی کو نگراں بنا دیا گیا تھا، انہیں بھی ایڈیٹر ہی کہا جاتا تھا، ابا ان سے ملے۔ ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک دونوں بات‌چیت کرتے رہے، اچانک ابا کو احساس ہوا کہ جب باتیں موسم، چراگاہوں، بھیڑوں، گھوڑوں اور گائے بھینسوں کی ہوتی ہیں تو گفتگو میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ مگر جہاں ادب اور ڈرامے کی بات چلی تو ایڈیٹر صاحب جو کچھ کہتے ہیں اس کا ایک لفظ بھی ابا کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن ایڈیٹر صاحب ہیں کہ ڈرامہ‌نگاری کے بارے میں بڑے مستند انداز میں فتوے صادر کرتے جا رہے ہیں اور ابا کو مسلسل یہ مشورے دے رہے ہیں کہ اچھا ڈرامہ کس طرح لکھا جا سکتا ہے۔ ابا کچھ دیر بعد ضبط نہ کر سکے اور انہوں نے صاف صاف پوچھ لیا کہ تم ہو کیا، کس طرح کی تربیت تم نے حاصل کی ہے اور آرٹ کونسل سے وابستہ ہونے سے پہلے تم کہاں کام کرتے تھے؟

"میں کالج کا فارغ‌التحصیل ہوں،، ایڈیٹر صاحب نے ذرا فخر کے ساتھ کہا۔ "میں نے مویشیوں کے علاج کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اور یہاں میرا تقرر ہوا ہے۔،،

"تو کیا میرے ڈرامے گائے بھینس ہیں کہ تم ان کا علاج کروگے؟ کیا کبھی کسی شاعر نے بھی مویشیوں کے ڈاکٹروں کو مشورہ دیا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہوا تو پھر ایسا کیوں

ہے کہ جس کا بھی جی چاہے شاعروں کو مشورہ دینے کے لئے اٹھ کھڑا ہو؟‘‘

خدا کرے ایسا نہ ہو کہ میری کتاب بھی کسی ایسی ہی ایڈیٹر کے ہاتھ پڑ جائے جو مویشیوں کا معالج رہا ہو اور جو ادب کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ جانتا ہو۔

ابوطالب اور ایڈیٹر کا معاملہ۔ ایک ایڈیٹر صاحب نے ابوطالب کے ایک مسودے پر اس طرح ہاتھ مارا جیسے کوئی پہاڑی کوا لڑائی میں کام آنےوالے کسی سورما کی لاش پر چونچ مارتا ہے۔ کٹی پھٹی حالت میں پروف کی کاپیاں ابوطالب کے پاس پہنچیں۔ انہوں نے مسودے کا جائزہ لیا اور حیرت زدہ رہ گئے:

’’میرے ہرےبھرے مرغزار میں گھوڑے چھوڑ دئے گئے جنہوں نے اسے پامال کر دیا ہے۔ جہاں کبھی پھول تھے وہاں اب دلدل ہے۔ اسکول کا طالب‌علم املے کی غلطی کرتا ہے تو استاد اسے درست کر دیتا ہے۔ نہ جانے یہ استاد کہاں سے آ گیا ہے جس نے اس فیصلے کا حق حاصل کر لیا ہے کہ میری زندگی میں کون‌سی چیز غلط تھی اور کون سی چیز صحیح۔‘‘

پھر ابوطالب نے ان تبدیلیوں پر غور کیا جو ایڈیٹر صاحب نے کی تھیں اور چیخ پڑے:

’’اوہ۔ اب میں سمجھا کہ یہ ایڈیٹر صاحب کس گاؤں کے رہنےوالے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میری کتاب کی زبان وہی ہو جو ان کے گاؤں میں بولی جاتی ہے۔ مقامی بولیاں تو ہمارے یہاں بہت ساری ہیں لیکن زبان ایک ہی ہے اور قوم بھی ایک ہے۔ اگر ہر ایڈیٹر ہمیں اپنے اپنے گاؤں کی طرف گھسیٹنے لگے تو ہم شاعر اس وحدت کو کبھی جنم نہیں دے پائینگے جسے ہماری شاعری کہا جاتا ہے۔‘‘

چنانچہ میں بھی اپنے ایڈیٹر سے کہتا ہوں۔ یہ بات نہ بھولئے کہ دنیا میں آپ کے گاؤں کے علاوہ دوسری بستیاں بھی ہیں اور دوسرے لوگ بھی۔ بنیادی طور پر ہمارا آپ کا کوئی

جھگڑا نہیں۔ آپ کی رائے موزوں اور مناسب ہوئی تو میں اس پر ضرور توجہ دونگا۔ لیکن ایک بات یاد رکھئے کہ اپنی شاعری سے میری محبت اتنی ہی گہری؛ اور شدید ہے جتنی خاندانی دشمنیاں۔ اور یہ کوئی آج کا احساس نہیں ہے۔ بہت پہلے جب میں نوجوان تھا میں نے اپنی ایک نظم اس طرح شروع کی تھی۔

جیسے جلتی ہے انتقام کی آگ
میرے سینے میں ایسے ہیں اشعار
جیسے اہل ہوس کی نظروں سے
ہوں چھپے حسن و عشق کے اسرار

میں نے اس نو نہال کو پالا
اس کی چیخوں سے زندگی پائی
میں گھڑی ساز ہوں، گھڑی کی طرح
اس کا آہنگ دین ہے میری

نطق کے بحر بے کراں سے میں
چن کے موتی اسے سجاتا ہوں
جیسے مہمان کے لئے گھر میں
سب سے بہتر شراب لاتا ہوں

بیٹیاں میرے دیس کی جس دم
اون کے رنگ آزماتی ہیں
جب بھی آتی ہیں شب کی وہ گھڑیاں
مجھ کو فکر سخن میں پاتی ہیں

شعر گو ہوں گے مجھ سے بہتر بھی
ہم میں ہر اک کی اپنی منزل ہے
میری منزل مجھے ملی کہ نہیں؟
یہ بتانا تو آج مشکل ہے

ان میں شامل ہے زندگی میری
گویہ اشعار میرے کم تر ہیں

آپ ایڈیٹر ! نہ باندھئیے ان کو
میری تخئیل کے یہ شہپر ہیں
میرے بچوں کو دوسروں کا لباس
آپ پہنائیں بھی تو کیا ہوگا
ان سے گر آپ کو شکایت ہے
مجھ سے کہئیے، یہی بھلا ہوگا

میں نے اسی زمانے میں ایک ڈرامہ ''پہاڑی دوشیزہ،، بھی لکھا تھا۔ یہ ڈرامہ داغستان کے کئی تھیٹروں میں اسٹیج کیا گیا اور اس ڈرامہ کا جو حشر ہوا وہ بھی ملاحظہ ہو۔

ڈرامے کے آخری مناظر میں ہیرو ہیروئن کو قتل کر دیتا ہے۔ اس پہاڑی دوشیزہ کے اس انجام پر مجھے بےانتہا غم تھا۔ جب میں قتل کے مناظر لکھ رہا تھا تو دل غم سے بوجھل تھا اور ھاتھ کانپ رہے تھے، لیکن انجام بدلنا میرے بس میں نہ تھا۔ واقعات کی اپنی منطق ہوتی ہے اور صورتحال کچھ ایسی تھی کہ پہاڑی دوشیزہ زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ آوار تھیٹر میں ڈرامہ اسی طرح اسٹیج ہوا اور اگرچہ دیکھنےوالوں کو پہاڑی دوشیزہ کے انجام پر مجھ سے زیادہ ہی رونا آیا مگر ہر ایک یہ محسوس کر رہا تھا کہ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی اور انجام نہیں ہو سکتا تھا۔

دارغین تھیٹر میں اس ڈرامے میں ردوبدل کیا گیا۔ لڑکی قتل نہیں کی گئی بلکہ اس کی زلفیں کاٹ لی گئیں۔ یقیناً یہ بھی بہت بڑا المیہ ہے۔ پہاڑی علاقوں میں کسی لڑکی کی زلفیں تراش دی جائیں تو موت سے بھی زیادہ اندوھناک حادثہ سمجھا جائے گا، پھر بھی یہ موت تو نہیں ہوتی۔

کومیک تھیٹر میں نہ تو یہ پسند کیا گیا کہ وہ مر جائے اور نہ یہ کہ اس کے بال کاٹ دئے جائیں۔ اس کے بجائے انہوں نے اسے اندھا کردیا۔ یہ بھی بہت بڑا حادثہ ہے، غالباً مر جانے یا بالوں سے محروم ہو جانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑا حادثہ، بہرحال وہ پہاڑی دوشیزہ زندہ رہی اور اپنی زلفوں کے ساتھ زندہ رہی اور کومیک تھیٹروالے یہی چاہتے بھی تھے۔

چچین تھیٹروالوں نے سب آسے- ان راستہ اختیار کیا۔ ”لڑکی کو مارا کیوں جائے، اس کے بال کیوں کاٹے جائیں، اسے اندھا کیوں کیا جائے؟ ان سب کی ضرورت کیا ہے؟ اسے زندہ کیوں نہ رہنے دیا جائے؟“

چنانچہ ہر پروڈیوسر نے اپنے اپنے طور سے میرے ڈرامے کو نیا روپ دیا اور یہ بھول گیا کہ ہیروئن پر رحم کرکے اس کی زندگی بچا لی جائے گی مگر ڈرامہ قتل ہو جائے گا اور یہ ساری تراش خراش ڈرامہ‌نگار کو تو جانے دیجئے خود ناظرین کے لئے بہت بڑی زیادتی ہے۔

ابا نے ایک بار اخبار میں چھپی اپنی نظمیں دیکھ کر کہا تھا: ”میری نظمیں جلادوں کے ھاتھ میں پڑ گئی تھیں، انہوں نے جسم کا ایک حصہ بھی صحیح سالم نہیں رہنے دیا۔“

محمود... محمود نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی، بات یہ ہے کہ ان کی کوئی کتاب ان کی زندگی میں شایع نہیں ہوئی۔ اگر وہ دیکھ لیتے کہ بعض ایڈیٹروں نے ان کی نظموں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے تو یقین مانئے وہ ایک بار پھر موت کی اذیت جھیل لیتے۔

پہاڑی راستوں پر جدید ڈھنگ کی کاریں نہیں چل سکتیں۔ ایڈیٹروں نے جب مردوں کو بھی نہیں بخشا تو پھر میں اپنی نظموں کو ان کے دست‌غضب سے کیسے بچا سکتا ہوں۔

ایڈیٹر صاحب، میں نے جو کچھ کہا ہے، یہ نہ سمجھئے گا کہ آپ کے لئے کہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ایسے ایڈیٹر بھی ہوتے ھیں جو ادیب کے لئے عقلمند اور مہربان مشیر کی حیثیت رکھتے ھیں۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کا شمار اسی طرح کے ایڈیٹروں میں ہے۔ آپ کے ساتھ کام کرنا باعث‌رحمت ہے۔ یقین رکھئے مسودے کے حاشیئے پر آپ کے ھاتھوں لگائے گئے کسی ایک نشان کو بھی میں نظرانداز نہیں کرونگا، چاہے وہ استعجابیہ علامتیں ہوں، چاہے تشریح طلب سوالوں کے

نشانات، چاھے وہ نشانات جنکے ذریعے آپ کتاب کو بہتر بنانے کے لئے کوئی سطر بدل دینے یا کوئی لفظ تبدیل کر دینے کا اشارہ کریں۔

میری کتاب میں ہو سکتا ھے ایسے جملے ھوں جن میں ربط نہ ھو اور جو خراب دانت کی طرح ڈھیلے ڈھالے ھوں۔ مجھے احساس ھے کہ بعض خیالات اور جملے بار بار دھرائے بھی گئے ھیں۔

براہ کرم میری خامیوں اور لغزشوں کی تلاش کرکے ان کی نشاندھی کیجئے اور مجھے بتائیے۔ یوں تو ایک دماغ بھی کافی ھوتا ھے مگر ڈیڑھ دماغ مل جائیں تو بات اور بھی زیادہ بن جاتی ھے اور مجھے امید ھے کہ ھم دونوں ملینگے تو دو یکساں طور پر باھوش اور صحت‌مند دماغ اور چار ھاتھ مل جائینگے اور سارا کام بڑی تیزی کے ساتھ انجام پا جائے گا۔ آج اگر معمولی سی جھڑپ ھو جائے تو وہ کل کسی جھگڑے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ھے۔ آپس میں ایک بار لڑنا اس سے بہتر ھے کہ ھم ساری زندگی کے لئے ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں۔ اور ھاں، میری مبالغہ‌آمیز تعریف سے ضرور اجتناب کیجئے۔

ایک شکاری نے خرگوش کی بڑی تعریف کی کہ وہ ڈرا نہیں بلکہ اس کے سامنے پہاڑ کی ایک چٹان پر چھلانگیں لگاتا رھا، اس شکاری کا مقصد خرگوش کا شکار نہ تھا۔ مگر خرگوش اپنی تعریف سے اس قدر خوش ھوا کہ اس نے یہی عمل ایک اور شکاری کے سامنے دھرا دیا جو شکار کی غرض سے ھی آیا تھا۔ نتیجہ جو ھوا وہ اتنا عیاں ھے کہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

مجھے معلوم ھے کہ آپ کا کام نیکی کر دریا میں ڈال کے مترادف ھے... پڑھنےوالا جب کسی کتاب کا انتخاب کرتا ھے تو وہ مصنف کا نام پڑھتا ھے اور پھر اس مصور کا جس نے اپنی بنائی تصویروں کے ذریعے کتاب کی آرائش کی ھو، مگر وہ کبھی یہ دیکھنے یا جاننے کی کوشش نہیں کرتا کہ کتاب کا ایڈیٹر کون ھے۔ ھے نا یہی صورت‌حال۔

یہ بات تو سبھی تسلیم کرتے ھیں کہ شاعر قوم کی آواز ھوتا ھے۔ مگر یوں لگتا ھے کہ کبھی کبھی ایڈیٹر بھی لوگوں

کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ ایک بار میں ایک عشقیہ نظم لے کر ایک ایڈیٹر کے پاس پہنچا۔ اس نے نظم پڑھی اور سر ھلاتے ہوئے جواب دیا کہ یہ شایع نہیں ہو سکتی۔

''کیوں؟،،

''اسلئے کہ لوگ اسے نہیں پڑھینگے۔ انہیں تمہاری بیوی سے کیا دلچسپی؟،،

اس جواب سے متاثر ھوکر میں نے مندرجۂذیل مشمن لکھا:

میں نے لکھے تھے جو اشعار ترے حسن کے نام
وہ رسالے میں نہ چھپ پائیں‌گے ارشاد ہے یہ
غیردلچسپ ھیں قاری کےلئے ان کے مواد
رد کئے جانے کی اشعار کے بنیاد ہے یہ

ھاں، مگر مجھ کو یہ غم ہے کہ وہ اشعار مرے
آج تک مجھ کو نہ مل پائے، نہ جانے ھیں کہاں
کون جانے کہ ایڈیٹر نے یہ سوچا ھو چلو!
نذر بیوی کے ھوں یہ شعر ملے لطف‌زباں

ابا کہا کرتے تھے کہ ادیب و شاعر موٹر ڈرائیوروں کی طرح ھوتے ھیں۔ جو اپنا کام اچھی طرح جانتے ھیں اور عام طور پر سڑک پر چلنے کے ضابطوں کی پابندی بھی کرتے ھیں مگر کبھی کبھی غلطی سے ان ضابطوں کی خلاف‌ورزی بھی کر جاتے ھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسی صورتوں میں ایڈیٹر ٹریفک پولیس کا رول ادا کرتے ھیں۔ مگر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد انہوں نے کہا تھا:

''لیکن ایک ڈرائیور کے مقابلے میں تین پولیس‌والوں کا تناسب ذرا ضرورت سے زیادہ ھی ہے۔،،

مگر پولیس‌والوں کے بغیر بھی گذر نہیں ھوتی۔ کچھ لوگ میز کے گرد بیٹھے آپس میں ایک دوسرے کا جام صحت نوش کر رہے تھے۔ ان میں پولیس کا ایک سپاھی بھی شامل تھا۔

جب تمادا* نے اپنا گلاس اٹھایا اور پولیس کے سپاهی کا جام‌صحت تجویز کیا تو صارفین کی مقامی کوآپریٹیو کے صدر نے اپنا جام میز پر رکھ دیا اور بولا:

''کمیونزم آ جائےگا تو پولیس کے سپاهی کی ضرورت ختم هو جائےگی۔ یہ ایک فرسودہ محکمہ ہے۔ ایک مٹتے هوئے محکمے کا جام‌صحت کیوں پیا جائے؟''

پولیس کے سپاهی نے بڑی برجستگی کے ساتھ جواب دیا:

''کمیونزم کے دور میں پولیس کا سپاهی هوگا یا نہ هوگا اس کا انحصار اس پر ہے کہ اس دور میں صارفین کے کوآپریٹیو ادارے برقرار رهینگے یا نہیں۔''

خیر! یہ سب تو مذاق تھا۔ اب آئیے، ایڈیٹر صاحب! آپ کو دل کی بات سناؤں۔ کیا آپ جانتے هیں کہ میرا پسندیدہ لمحہ کون‌سا ہے؟ وہ لمحہ جب هم دونوں مل کر بیٹھے هوں، کسی ایسی میز کے گرد نہیں جس پر کاغذوں کا انبار هو بلکہ ایک عام سی کھانے کی میز کے گرد جسے خوش سلیقگی کے ساتھ سجایا گیا هو۔ همارے پیچھے وہ گذرے هوئے لمحات هوں (اور میں بتا دوں کہ ان لمحوں پر بھی میں جان دیتا هوں) جب آپ نے میرے مسودے پر لکھا تھا: ''چھاپنے کے لئے تیار کیا جائے''، پھر ''چھاپا جائے''، اور اس کے بعد ''کتاب شایع کر دی جائے''۔ آپ کے ایک اشارے پر کتاب مرتب کی گئی، پھر چھاپی گئی اور فروخت کے لئے دے دی گئی۔ ذرا ایک لمحے کے لئے تصور کیجئے کہ آپ کے لکھے هوئے موخرالذکر الفاظ کتنی بڑی طاقت رکھتے هیں۔ محض ان الفاظ کی وجہ سے آپ کے سارے گناہ بخش دئے جائینگے، محض ان الفاظ کی وجہ سے هی میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر جام پر جام لنڈھاؤں‌گا۔ تو پھر آئیے، نیک کام میں دیر نہ کیجئے تاکہ میں اپنی کتاب کی پہلی کاپی اپنے دستخط کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں۔

---

*قفقاز کی پارٹیوں میں شراب‌نوشی کے منتظم کو ''تمادا'' کہتے هیں۔ (ایڈیٹر)

صاف بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت کا انتظار ہے اور خدا کرے وہ وقت جلد آئے جب روئے زمین پر کسی بھی طرح کے اسرار کا وجود باقی نہ رہ جائے گا۔ دوسری طرف وہ کون‌سا شاعر ہوگا جو دوسروں پر اپنا کوئی خاص راز منکشف نہ کرتا ہو، ایسا راز جس سے لوگ پہلے واقف نہ رہے ہوں؟ میں ایک شاعر ہوں اور اس دنیا میں اس لئے آیا ہوں کہ اسی طرح زمان و مکان کے پردے اٹھاؤں جس طرح کوئی دولھا اپنی دولھن کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے۔ شادی میں یہ شرف صرف دولھا کو حاصل ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی دوسرے لوگ اس کی دولھن کا منھ دیکھ پاتے ہیں۔ زندگی میں یہ شرف صرف شاعر کو حاصل ہوتا ہے اور یوں لوگ حقیقت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے لگتے ہیں اور ان تمام چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں اور ان کی تعریف کر سکتے ہیں جنہیں پہلے دیکھنے سے وہ قاصر تھے، یعنی دنیا کا حسن، انسانی روح کی عظمت، خصوصاً اس وقت جب وہ باطل قوتوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

ڈیر ایڈیٹر! بکواس کرنےوالوں کو اس کی اجازت مت دیجئے کہ وہ ایسی باتیں بھی بک دیں جن کا نہ کہنا ہی بہتر ہے لیکن جب میں ایک شاعر کی حیثیت سے یہ محسوس کروں کہ کسی چیز کا بیان کرنا ضروری ہے تو اس پر پردہ مت ڈالئے۔

اور ہاں، میرے جملوں، ان کی سجاوٹ اور ان کے حسن پر بھی شک نہ کیجئے۔ ہو سکتا ہے، میں نے اپنا قالین بننے میں کہیں غلطی کی ہو، مگر کسی کو اجازت نہ دیجئے کہ نشاندھی کے لئے اس پر روشنائی پھیر دے یا اس پر قینچی چلا دے کیونکہ اگر ایسا ہوا تو قالین پر یا دھبہ پڑ جائےگا یا اس میں سوراخ ہو جائےگا۔

— اور ہاں، کسی ایسے خیال کو محض اس لئے غلط نہ قرار دیجئے کہ وہ آپ کا خیال نہیں ہے۔

— اور ہاں، خیال رکھئے کہ روٹی، شکر اور مکھن، یہی نہیں بلکہ کیلیں تک ترازو میں تولی جا سکتی ہیں مگر محبت کو نہیں تولا جا سکتا۔

— گز کپڑا ناپنے، کمرے کی اونچائی ناپنے یا قبر کے گرد بنی جالیوں کا اندازہ لگانے کے لئے کام میں لایا جا سکتا ہے، مگر حسن کو گز کے ذریعے نہیں ناپا جا سکتا۔

— اور اس کا بھی خیال رکھئے کہ اپنے کو سب سے زیادہ عقلمند ماننےوالا ممکن ہے اس سے زیادہ بیوقوف سمجھ لیا جائے جتنا وہ حقیقتاً ہے۔

— اور میں بالغ انسان ہوں۔ کم‌ازکم کچھ حد تک تو مجھ پر اعتماد کیجئے۔

مجھے احساس ہے کہ کسی آدمی کے پاس راز زیادہ ہو سکتے ہیں کسی کے پاس کم، کیونکہ:

ابوطالب نے کہا ہے کہ اگر تالاب گندا ہو تو اس کی تہہ تک نظر نہیں پہنچ سکتی چاہے پانی گھٹنیوں تک ہی کیوں نہ ہو۔

اپنی نوٹ‌بک سے۔ بچپن میں مجھے اپنے خاندان میں سب سے باتونی سمجھا جاتا تھا۔ سڑک پر جو کچھ سنتا اسے گھر آ کر ضرور دہرا دیتا، اسی طرح گھر میں جو باتیں سن لیتا اسے سڑک پر دہرا دینا بھی ضروری تھا۔

اسی زمانے کی بات ہے، ایک بزرگ اکثر ابا سے ملنے آتے۔ ادھر ادھر دیکھ کر ابا سے سرگوشی کرتے:

''حمزہ! ذرا دوسرے کمرے میں چلو! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

پھر دونوں دوسرے کمرے میں چلے جاتے اور آہستہ آہستہ باتیں کرتے۔ کافی دنوں تک یہ چکر چلتا رہا، پھر ایک دن وہ بزرگ آئے اور حسب‌دستور ابا سے بولے:

''حمزہ! ذرا دوسرے کمرے میں چلو! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

''کیا ضرورت ہے؟'' ابا نے جواب دیا۔ ''تم جس طرح کی راز کی باتیں کرتے ہو، وہ یہاں بھی کی جا سکتی ہیں اور یہی

نہیں رسول کے سامنے بھی کی جا سکتی ہیں۔ فکر نہ کرو! جو کچھ کہنا ہے، یہیں کہہ دو!،،

جی ہاں۔ مجھے بچپن سے ہی کچھ راز میں رکھنا پسند نہیں رہا۔ گیت اس لئے ہوتے ہیں کہ وہ گائے جائیں، بلند آواز میں، کسی تکلف کے بغیر اور کسی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔

اسکے علاوہ ایسا نہیں ہے کہ جو کتاب آپ پڑھ رہے ہیں اس کے ہر لفظ کے لئے میں ہی ذمہ دار ہوں۔ ہمارے درمیان ایک مترجم بھی تو ہے۔

مترجم۔

میں آوار ہوں، آوار پیدا ہوا تھا اور آوار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ میں نے دنیا میں پہلی بار آنکھیں کھولیں تو آوار لوگوں ہی کو دیکھا، میرے کان میں سب سے پہلے جو لفظ پڑے وہ آوار زبان ہی کے تھے۔ اماں نے پالنے کے پاس کھڑے ہو کر جو لوری سنائی تھی وہ بھی آوار زبان میں تھی۔ آوار میری مادری زبان ہے۔ وہ میرا اور میرا ہی کیوں پوری آوار قوم کا عزیزترین سرمایہ ہے۔

ہماری قوم نہ بہت بڑی ہے نہ بہت چھوٹی۔ اس کی تعداد تین لاکھ ہے۔ داغستان میں تو ایسے شاعر بھی ہیں جو ایسی زبان میں شاعری کرتے ہیں جسکے بولنےوالوں کی تعداد محض دو ہزار ہے۔

قوموں کو ریاست کی سرحدیں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں مگر زبانیں اس سے بھی زیادہ۔ ریاست کی سرحدیں بدل بھی سکتی ہیں، ختم بھی ہو سکتی ہیں اور کبھی کبھی تو محض رسمی بن کر رہ جاتی ہیں لیکن زبان وہ چیز ہے جو کسی قوم کی لازوال دولت ہوتی ہے۔ نہ اسے بدلا جا سکتا ہے اور نہ مٹایا جا سکتا ہے۔

کسی ایسے زمانے کا تصور کرنا بھی مشکل ہے جب آوار لوگ پشکن سے واقف نہ رہے ہوں، لیرمنتوف کو نہ پڑھتے ہوں، تالستائی کے بارے میں یا چیخوف کے بارے میں نہ جانتے ہوں۔

ابا کہا کرتے تھے: یہ ہم آوار لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ پشکن کے پودے نے ہماری پہاڑی زمین پر جڑ پکڑلی کیونکہ یہ وہ پودا ہے کہ آپ لاکھ بار اسے جھنجھوڑیں، اس میں رسیلے، خوشبودار اور میٹھے پھل آتے ہی رہتے ہیں۔

اور ابوطالب کا کہنا ہے: میں ان لوگوں کا مشکور ہوں جو چیخوف کو میرے تنگ و تاریک تہہ‌خانے تک لائے اور میری نظموں کو اس تنگ و تاریک تہہ‌خانے سے باہر نکال کر ماسکو کے کریملن کی فصیلوں تک پہنچایا۔

اور میں کہتا ہوں کہ قفقاز نے سپہ‌سالاروں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے مگر ایک نوجوان لفٹننٹ (لیرمنتوف) کی نظموں کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

ایک بار عجیب اتفاق ہوا۔ داغستان سے میری نظموں کا روسی ترجمہ کتاب کی صورت میں شایع ہو رہا تھا۔ ایڈیٹر نے کتاب کے صفحے الٹتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''تم نے 'پولتاوا، کو کیوں نہیں شامل کیا؟،،

''وہ میری نظم تو نہیں، وہ تو پشکن کی نظم ہے، میں نے تو محض آوار زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں پشکن کی کوئی نظم اپنی نظموں کے روسی زبان کے مجموعے میں شامل کرلوں؟،،

لیکن ہمیں ایڈیٹر کے ساتھ رواداری برتنا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ آوار لوگ ادب کے کئی ایسے عظیم شاہکاروں سے جن کا ترجمہ دوسری زبانوں سے آوار زبان میں ہوا ہے، اتنے ہی مانوس ہیں جتنے خود اپنی زبان کے ادب سے۔ اور اگر یہ ترجمے نہ ہوتے تو آوار ادب ہرگز وہ نہ بن پاتا جو آج بن گیا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ لوگ اکثر میرے پیٹھ پیچھے کہتے ہیں: ''رسول کی بات کرتے ہو؟ اس میں شک نہیں کہ اس میں صلاحیت ہے، مگر اب ایسی غیرمعمولی بھی نہیں۔ یہ تو ماسکووالے ہیں جنہوں نے ترجمہ کرکے اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا!،،

میں اس سے انکار بھی نہیں کرونگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مترجم نہ ہوتے تو میں بھی نہ ہوتا۔

پہلی بات تو یہ کہ انہوں نے مجھے ھائنے، برنس، شکسپیر، سعدی، سروانتیس، گوئٹے، ڈیکنس، لانگ فیلو، وھٹمین اور ان تمام دوسرے ادیبوں سے واقف کرایا جنہیں میں نے اپنی مختصر سی زندگی میں پڑھا ہے اور جن کا مطالعہ کئے بغیر میں ادیب بن ہی نہ پاتا۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے میری نظموں کو ایک نئی شاھراہ سے واقف کرایا ہے۔ وہ اپنے ساتھ میری نظموں کو طوفانی دریاؤں اور بلند پہاڑوں کے پار لے گئے ھیں، اونچی فصیلوں اور سرحد پر قائم چوکیوں سے آگے لے گئے ھیں، اور یہی نہیں انہوں نے ان نظموں کو انتہائی اٹل سرحدیں پار کرائی ھیں، زبان کی سرحدیں پار کرائی ھیں، بہرے پن، اندھے پن اور گونگے پن پر قابو حاصل کیا ہے۔

میں اکثر اپنے آپ سے سوال کرتا ھوں — اھمیت کس بات کی ہے، اس کی کہ مترجم میری زبان سے واقف ھو (چاہے میری شاعری اس کے پلے نہ پڑتی ھو) یا اس بات کی کہ میری شاعری اس کے دل و دماغ سے ھم‌آھنگ ھو اور وہ اسے اس طرح جانے اور محسوس کرے جیسے یہ اس کی اپنی ہی شاعری ھو۔

۱۹۳۷ء میں مخاچ‌قلعہ میں یہ مقابلہ ھوا کہ پشکن کی نظم ''گاؤں'' کا سب سے اچھا ترجمہ کون کرتا ہے۔ ۴۰ شاعروں نے آوار زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ زیادہ‌تر شاعر روسی زبان سے واقف تھے۔ لیکن پہلا انعام حمزہ کو ملا، جو اس وقت روسی زبان بول نہیں سکتے تھے۔

جو بات اھمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مترجم خود بھی شاعر، ادیب اور فنکار ھو اور اس میں بھی اپنی قوم کے سپوت ھونے کا احساس اتنا ہی شدید ھو جتنا مجھ میں ہے۔

ایسے روسی ملینگے جو آوار پڑھ سکتے ھیں مگر بدقسمتی سے وہ شاعر نہیں۔ اور ایسے روسی شعراء بھی ھیں جو بدقسمتی سے آوار زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا کوئی راستہ نکالا جا سکتا ہے؟ جی ھاں،

اس کا حل ہے، لفظی ترجمہ جو اصل ترجمے کا پہلا مرحلہ ہوگا۔

روس کے دیہاتوں میں میں نے اکثر چوبی مکانوں کو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں منتقل ہوتے دیکھا ہے۔ یہ مکان اپنی اصل شکل میں منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ پہلے ان کا ایک ایک کھمبا اور ایک ایک تختہ الگ کیا جاتا ہے اور پھر نئی جگہ پر ان سب کو دوبارہ جوڑ کر مکان تیار کر لیا جاتا ہے۔

لفظی ترجمہ وہ مکان ہے جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لےجانے کے لئے اس کے ایک ایک حصے کو الگ کر دیا گیا ہے اور اب وہ کھمبوں اور تختوں کے، چھت پر لگی لوہے کی سلاخوں اور اینٹوں کے ایک ڈھیر میں بدل چکا ہے۔ مترجم اس ڈھیر سے دوبارہ ایک نیا مکان بناتا ہے، اب اگر کوئی شہتیر گلاسڑا معلوم ہو تو وہ اسے بدل دیتا ہے، کوئی تختہ کھو گیا ہو تو دوسرا تختہ جڑ دیتا ہے، اگر کھڑکی کی چوکھٹ پر کی ہوئی نقاشی کا کوئی حصہ جھڑ گیا ہو تو وہ مرمت کے ذریعے ان نقوش کو دوبارہ صحیح حالت پر لے آتا ہے۔

پھر جب کھڑکیاں صاف ہو جاتی ہیں تو مکان میں چولھا گرم ہوتا ہے، دھویں کے بادل چمنی سے نکل کر فضا میں منڈلانے لگتے ہیں، بچے اندر باہر آنے جانے لگتے ہیں اور ابابیلیں ایک بار پھر مکان کے کونوں میں گھونسلے بنانے لگتی ہیں۔

لفظی ترجمہ کیا ہے؟ وہ ایک ایسے انسان کی طرح ہے جس کی آنکھیں پتھرا چکی ہوں، دل کی حرکت قریب قریب بند ہو چکی ہو۔ پھر کوئی ڈاکٹر آکر انجکشن لگائے، خون چڑھائے یا دل کو اس طرح سہلائے کہ زندگی کی حرارت دوبارہ اس کی نسوں میں دوڑنے لگے۔

لفظی ترجمہ کیا ہے؟ وہ ایک ایسا کمز ہے جس کے تار عارضی طور پر ڈھیلے ہو گئے ہوں، ایک ایسا چولھا ہے جس میں آگ عارضی طور پر بجھ گئی ہو، ایک ایسی چڑیا ہے جس کے بازو عارضی طور پر مفلوج ہو گئے ہوں۔

لفظی ترجمہ کیا ہے؟ وہ اس حجام کی طرح ہے جس نے میرے بال سنوارے ہوں، میری داڑھی بنائی ہو، زلفیں سلجھائی ہوں اور پھر مجھے رخصت کرتے ہوئے کہا ہو:

"تم میرے پاس یوں آئے تھے جیسے لفظی ترجمہ ہو، اور اب ترجمہ بن کر واپس جا رہے ہو۔"

اب حجام کا ذکر آ گیا تو ایک کہانی سن ہی لیجئے۔

کیوبا کے شہر سانتیاگو میں اترتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میرے بال بڑھے ہوئے ہیں اور داڑھی بھی۔ میں حجام کی ایک دوکان میں گھس گیا اور اشاروں میں اسے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

کیوبا میں آرام کرسی پر اس طرح لیٹ کر شیو بنوایا جاتا ہے جیسے آدمی بستر پر لیٹتا ہے۔ چنانچہ میں بھی لیٹ گیا۔ اور حجام داڑھی پر صابن لگانے لگا۔ صابن لگانے تک تو سب ٹھیک ٹھاک رہا، مگر جب استرا چلا تو مجھے تکلیف محسوس ہونے لگی، نہ جانے استرا کند تھا یا پھر حجام ہی نو سکھیا تھا۔ میں دانت پر دانت جمائے تھوڑی دیر تک سب کچھ برداشت کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر جب معاملہ بس سے باہر ہونے لگا تو میں نے کچھ روسی کچھ آوار ملا کر بات کرتے ہوئے اپنے گالوں کی طرف اشارہ کیا۔ حجام نے مجھ پر سہمی ہوئی نظر ڈالی اور پھر جھٹکے کے ساتھ باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ سفید لبادے میں ملبوس ایک اور آدمی بھی تھا۔ اس نے اپنا بیگ کھولا اور دھیرے دھیرے دانت اکھاڑنے کے طرح طرح کے آلات باہر نکالنے لگا۔ اب حجام کی کرسی دانتوں کے ڈاکٹر کی کرسی بن چکی تھی۔ اور یہ سب کچھ محض اس لئے ہوا تھا کہ میں نے نہ تو حجام کو اپنی بات سمجھا سکا تھا اور نہ اس کی بات خود سمجھ سکا تھا۔ چنانچہ میں چند لمحوں میں اپنے کچھ مضبوط دانت کھو چکا ہوتا۔

مترجم اکثر نظم کے سارے دانت توڑ دیتے ہیں اور وہ بیچاری دانتوں سے محروم کسی بوڑھی بوبلی عورت کی طرح دنیا میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

اپنی نوٹ بک سے۔ میرا قاعدہ ہے کہ جب باہر جاتا ہوں تو ہمیشہ اپنے ساتھ قومی دستکاری کے کچھ نمونے لے جاتا ہوں۔ یہ نمونے میں ان لوگوں کو تحفے میں دیتا ہوں جو میری مہمان‌نوازی کرتے ہیں۔ جاپان جاتے ہوئے بھی میں نے اپنے بلخاری کاری گروں کے عمدہ فن کے کچھ نمونے منتخب کئے، یہ تھے ان کے بنائے ہوئے مرتبان۔

ہیروشیما میں دو میاں‌بیوی مجھ سے ملنے آئے، دونوں ہی فنکار تھے۔ ہم بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور تھوڑی ہی دیر میں دوستوں کی طرح گھل‌مل گئے۔ "بلخاری مرتبان انہیں کو دئے جائیں،" میں نے دل میں سوچا "اس کی قدر آرٹسٹوں سے زیادہ اور کون کر سکتا ہے۔" میں نے یہ سوچ کر اپنا بیگ کھولا اور پھر جو کچھ نظر آیا اس نے میرے ہوش اڑا دئے۔ مرتبان چکناچور ہو چکے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ان پر ہتھوڑے برسائے ہوں۔ غالباً کسی ہوائی اڈے پر میرے بیگ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا تھا۔ یہ نہیں جانتا کہاں، ماسکو میں، ہندوستان میں یا پھر ٹوکیو میں۔ بہرحال اس وقت تو بس یہی جی چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں سما جاؤں۔ تحفے کا وعدہ کر چکا تھا اور میرے مہمان بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ انتظار کے لمحے طویل ہونے لگے تو ان کی نگاہوں میں استعجاب کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ ادھر میرا حال یہ تھا کہ بت کی طرح جم کر رہ گیا تھا، نہ ہلا جا رہا تھا اور نہ زبان سے ایک لفظ نکل رہا تھا۔

آخر میرے جاپانی دوستوں کو احساس ہوا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ دونوں میرے پاس آئے اور پھر ان کی نظر ٹکڑوں پر پڑی۔ صورت‌حال دیکھ کر دونوں نے سرہلایا، میرے کندھے تھپتھپائے اور اس طرح مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔ یقیناً اس وقت میری حالت بڑی خستہ رہی ہوگی کیوں کہ جاپان کے لوگ عام طور پر بڑے رکھ رکھاؤ سے کام لیتے ہیں اور بہت زیادہ بے‌تکلفی پسند نہیں کرتے۔

میں نے مرتبانوں کے ٹکڑے جمع کئے انہیں ایک اخبار میں لپیٹا، اور کوڑے کی بالٹی میں پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ ان لوگوں

نے مجھے روک دیا۔ انہوں نے ٹوٹے ہوئے مرتبانوں کا ایک ایک ٹکڑا پوری احتیاط کے ساتھ جمع کیا، اور پھر جاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

کچھ دنوں بعد ان کے یہاں میری دعوت ہوئی، اب آپ خود ہی سوچئے کہ مجھے اس وقت کتنی حیرت ہوئی ہوگی جب میں نے اپنے مرتبانوں کو اس صورت میں دیکھا کہ وہ بالکل نئے لگ رہے تھے۔ بس یوں جیسے ابھی ابھی کمھار کے چاک سے اترے ہوں۔ اور آج تک میں یہ نہیں سمجھ پایا کہ مرتبانوں کے ٹکڑوں کو اتنی ہنرمندی کے ساتھ کس طرح جوڑا گیا ہوگا۔

لوگ کہتے ہیں کہ کوئی گھڑا ٹپکنے لگے تو اسے کبھی اس طرح ٹھیک نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے پانی کا رسنا بند ہو جائے۔ لیکن ہم نے ان مرتبانوں میں جنہیں جاپانی فنکاروں نے ٹھیک کر دیا تھا داغستانی برانڈی اور جاپانی ساکی بھر دی اور ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔

جاپانی فنکاروں کو دیکھ کر مجھے اپنے بہترین مترجم یاد آ گئے۔ میری نظموں کے لفظی ترجمے کسی ٹوٹے ہوئے گھڑے کے ٹکڑوں کی طرح تھے، مترجموں نے ان ٹکڑوں کو آپس میں اس طرح جوڑا کہ گھڑا بالکل نیا لگنے لگا اور میرے آوار اسالیب بھی بدستور برقرار رہے۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ مترجم اس گھڑے کو نہ تو نئی شکل دے، نہ اس میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرے جو پہلے نہ تھی۔

کچھ ہی دنوں پہلے داغستان کے ایک اشاعت گھر سے تالستائی کی کہانی[1] ''حاجی مراد،، کا ایک نیا آوار ترجمہ شایع ہوا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ کتاب میں دو نئے ابواب کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

''یہ دو نئے باب کہاں سے آ گئے؟،، میں نے مترجم سے پوچھا۔

''تالستائی نے یہ کہانی اکتوبر انقلاب سے پہلے لکھی تھی، ٹھیک ہے نا؟ سو اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، ان میں سے بعض غلط ہیں۔ پھر قارئین کو یہ بتانا بھی

تو ضروری ہے کہ حاجی مراد کے سر کا حشر کیا ہوا اور ان کی آل اولاد آج کیسی زندگی گذار رہی ہے۔''

اپنی نوٹ بک سے۔ ابا کی ایک نظم کا ترجمہ روسی زبان میں ہوا۔ غالباً مترجم صاحب ناتجربہ کار تھے۔ ابا نے ایک صاحب سے جو روسی اور آوار دونوں ہی زبانیں جانتے تھے روسی میں چھپی نظم کا دوبارہ آوار زبان میں ترجمہ کرایا۔ ترجمہ ہوا تو ابا چیخ اٹھے:

''میرا بیٹا باہر گیا تھا، وہ واپس آیا ہے، مگر اس طرح کہ میں اسے پہچان نہیں پایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ باہر جانے اور اس قدر بدل کر واپس آنے سے بہتر یہ ہے کہ میرے بچے یہیں پہاڑوں کی گود میں، اپنے وطن میں رہیں۔''

جی ہاں! نظموں کے ترجمے ان بیٹوں ہی کی طرح ہیں جنہیں ان کے والدین پڑھائی کی غرض سے یا کام کے لئے باہر بھیجتے ہیں اور جب وہ واپس آتے ہیں تو کسی نہ کسی صورت میں ویسے نہیں رہ جاتے جیسے وہ گئے تھے۔

یہ تبدیلی اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بری بھی، وہ ڈپلوما لے کر بھی لوٹ سکتے ہیں اور سزایافتہ ہو کر بھی، صحت مند اور ورزشی جسم لے کر بھی واپس آ سکتے ہیں اور نحیف و لاغر بن کر بھی، مشہور سائنس داں کی حیثیت سے بھی اور عیاش شخص کے روپ میں بھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ سارے اعزا کے لئے قیمتی تحائف ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ بدن پر صرف لنگوٹی باقی رہ گئی ہو۔

میں بھی اپنی اس کتاب کو ایک طویل سفر پر روانہ کر رہا ہوں، شہروں کی خاک چھاننے اور عوام کے درمیان زندگی گذارنے کے لئے۔ اجنبی فضاؤں میں اس کے دن کیسے گذرینگے؟ کیا وہ ہماری قوم اور ہمارے رہن سہن کو بھول جائے گی؟

میں جانتا ہوں کہ پہاڑ کی بلندیوں میں رہنے والا کوئی برا آدمی (یامان) محض اسی لئے اچھا آدمی (یاکشی) نہیں بن جاتا کہ وہ نیچے وادی میں اتر آیا ہے اور اسی لئے میں اس کتاب کا ترجمہ کرنے والوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر یہ ''یامان''

ہے تو اسے ''پامال'' ہی رہنے دیں۔ اگر میں لنگڑا اور اندھا ہوں تو مجھے سہارا دے کر گھر سے باہر لانے کی کوشش مت کیجئے، مجھے اپنے چولھے کے پاس یا دھلیز پر ہی بیٹھا رہنے دیجئے۔ میرے تانبے کے برتن کو قلعی سے چمکانے کی، میری چاندی پر پالش کرنے کی زحمت نہ کیجئے۔

ابوطالب نے مجھ سے کہا:

''میرے ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ میری بیٹی بڑی اچھی ہے، شائستہ اور فرمانبردار، دوسروں کے لئے اچھی مثال۔ میرا لڑکا برا اور شرارتی ہے۔ لڑکی بہت اچھی کام کرنےوالی ہے، ریڈیو پر اس کا ذکر ہوتا ہے، اخباروں میں اس کا نام آتا ہے اور اس کی مثال دی جاتی ہے۔ اور بیٹے کا یہ حال ہے کہ کوئی دن نہیں گذرتا جب اس کے اسکول سے یا ملیشیا کی جانب سے شکایت نہ ملتی ہو۔ لوگ جب میری بیٹی کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں واہ، اسکول نے، نوعمر پائنیروں کے کلب نے، نوجوان کمیونسٹ لیگ نے اور ملک نے کیسی اچھی تربیت دی ہے اور جب بیٹے کی بات آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں، داغستان کے عوامی شاعر ابوطالب نے کیسا چوپٹ کیا ہے اس لڑکے کو؟''

ابوطالب کی کہانی سن کر میں نے سوچا کہ شاعری کے ترجمے کا بھی حال کچھ ایسا ہی ہے۔ ترجمہ اچھا ہو تو لوگ شاعر کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگتے ہیں اور بیچارے مترجم کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں اور اگر کہیں ترجمہ خراب ہوا تو سارا الزام مترجم کے سر آتا ہے، کوئی یہ نہیں سوچتا کہ شاعر نے لکھا کیا تھا۔

نہیں، محترم مترجم، آئیے اچھائیوں اور برائیوں کی ذمہ‌داری ہم دونوں لیں۔ ہم دونوں ایک ہی گاڑی پر سوار ہیں، ہم دونوں ہی کو اسے پہاڑی راستے پر اوپر لے جانا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم دونوں اسے مختلف سمتوں میں کھینچتے رہیں کیونکہ اس طرح نہ ہم دونوں آگے بڑھ سکینگے اور نہ گاڑی ہی آگے جا سکےگی۔

ایک بار ایک بڑا عجیب اتفاق ہوا۔ ایک بہت بڑا پہاڑ اپنی جگہ سے ھلا اور پھسلتا ہوا سوخوچ گاؤں کے قریب آکر رک گیا۔ جہاں وہ رکا وہاں سے ایک پہاڑی ندی بہتی تھی، چنانچہ اس کا بہاؤ رک گیا۔ پہاڑ پر بھیڑوں کے گلے بھی تھے، چرواہے بھی، آگ بھی جل رہی تھی اور خیمے بھی لگے ہوئے تھے اور یہ ساری ہی چیزیں جوں کی توں بلندی سے نیچے آرہیں، اس طرح کہ کسی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ پہاڑ آج بھی اسی جگہ ہے اور اس کے دامن میں ایک بہت بڑی جھیل وجود میں آگئی ہے جہاں اب ٹراؤٹ مچھلیاں پالی جا رہی ہیں۔ کسی نے اس پہاڑ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی تھی جب وہ اپنی پرانی جگہ پر واقع تھا لیکن اب اس کا دامن سیاحوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ لوگ دور دور سے آتے ہیں اور ہر وقت سیاحوں، ماہی گیروں اور سیر تماشے کے لئے آنےوالے اسکولی بچوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ میری کتاب بھی اسی طرح کسی کو ذرا بھی نقصان پہنچائےبغیر دوسری زبان میں منتقل ہو اور اسی طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن جائے جس طرح سوخوچ گاؤں کے قریب کا وہ پہاڑ ہے۔

نقاد کے بارے میں کچھ لکھنا سب سے مشکل کام ہے۔ اگر آپ اس کے خلاف لکھیں، اس کی برائی کریں تو سب کہینگے کہ اس کی کسی نکتہ چینی کا ردعمل ہے اور آپ اس سے بدلہ لے رہے ہیں۔ اگر اس کی تعریف کریں تو لوگ سوچینگے کہ آپ مصلحت سے کام لیکر اسے خوش رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ابا کہا کرتے تھے: نقاد اور میں دونوں ہی شاعر ہیں۔ میں شاعری کرتا ہوں اور نقاد اس شاعری کے بارے میں لکھتا ہے۔

ابوطالب نے داغستان کے ایک نقاد سے کہا تھا: ”میں انگور سے شراب کشید کرتا ہوں اور تم مزہ چکھ کر یہ طے

کرتے ہو کہ وہ دعوت میں پیش کئے جانے کے لائق ہے یا نہیں۔''

تو بات یہ ہے کہ نقاد کے بارے میں زیادہ کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ مگر میں نقاد کو کچھ مشورے ضرور دینا چاہتا ہوں۔

۱۔ کوئی چیز بری ہے تو ہمیشہ اسے برا کہئے، اچھی ہے تو ہمیشہ اچھی بتائیے۔

۲۔ ایک بار جب کسی چیز کی تعریف کر دی تو پھر اسے برا نہ کہئے۔ اسی طرح جب کسی چیز کی برائی کر دی تو پھر اسے اچھا کہنے کی کوشش نہ کیجئے۔

۳۔ رائی کو پربت اور پربت کو رائی بنانے کی کوشش مت کیجئے۔

۴۔ قاری کو وہ بتائیے جو کتاب میں ہے، وہ نہ بتائیے جو کتاب میں نہیں ہے۔

۵۔ اپنے خیالات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بلینسکی سے لے کر آج تک کے مستند نقادوں کا سہارا نہ لیجئے۔ خیالات اگر واقعی آپ کے ہیں تو انہیں اپنی ہی منطق کے ذریعے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کیجئے۔

۶۔ واضح خیالات کو سیدھی سادی زبان میں اور وضاحت کے ساتھ بیان کیجئے۔ غیرواضح خیالات تحریر میں لانے سے بچئے۔

۷۔ بادنما آلے کی طرح چلتی ہوئی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ بدلئے نہیں۔

۸۔ جو بات خود آپ کے ذہن میں صاف نہ ہو، اسے دوسروں کو سمجھانے کی کوشش نہ کیجئے۔

۹۔ جیب خالی ہو تو یہ تاثر نہ دیجئے کہ آپ کی جیب میں سو روبل ہیں۔

۱۰۔ اگر عرصے سے آپ اپنے گاؤں نہیں گئے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے تو یہ نہ کہئے کہ آپ ابھی ابھی وہاں سے آ رہے ہیں۔

میں نے جو باتیں کہی ہیں ان میں ایک بھی نئی نہیں۔ یہ اتنی سیدھی سادی ہیں جتنی ریاضی کی مبادیات۔ اگر ہر

نقاد ایمانداری کے ساتھ ان پر عمل کرنے لگے تو مجھے یقین ہے کہ ہماری تنقید کچھ بہتر ہی بن جائے گی۔

قاری۔ میں ایڈیٹر سے بھی باتیں کر چکا، ناشر سے بھی، مترجم سے بھی اور نقاد سے بھی۔ اور اب اس شخص سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں جو اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور جو بھی کتاب لکھی جاتی ہے وہ اسی کے لئے ہوتی ہے۔ میری مراد قاری سے ہے۔

عزیز قاری اور دوست! مجھے یقین ہے کہ آپ کی اپنی پسندیدہ کتابیں ہوتی ہیں۔ ہم ادیبوں کی بھی پسندیدہ کتابیں ہوتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ادیب کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت اس کتاب کی ہوتی ہے جو ابھی لکھی تو نہیں گئی لیکن بس لکھی جانے والی ہے، اور وہ ضرور لکھی جائیگی۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بات دوسرے ادیبوں پر کس حد تک صادق آتی ہے البتہ میرے سلسلے میں تو یہ صداقت ہی نہیں، مطلق صداقت ہے۔

میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اپنے وطن پر ایک کتاب لکھوں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ برسہابرس سے یہ خواہش میرے دل میں مچلتی رہی ہے۔ لیکن میں ابھی اس خواہش کو عملی روپ نہ دے سکا۔ غالباً مجھ میں صلاحیت نہیں ہے یا پھر ایسا ہے کہ لاتعداد معمولی معمولی کاموں میں میں اپنا بہت سارا وقت برباد کرتا رہا ہوں یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے جس مستقل مزاجی، صبر و تحمل اور جرأت کی ضرورت ہے، میں اس سے محروم ہوں۔

جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا ہے اپنے اور اپنے قاری دونوں ہی کے روبرو ادیب کا احساس ذمہ‌داری بھی بڑھتا جاتا ہے اور وہ ذرا سی تحریک پر قلم لے کر کاغذ پر نہیں پل پڑتا۔ ادیب جب اپنے ملک کے بارے میں اپنے وطن کے بارے میں کچھ لکھ رہا ہو تو ذمہ‌داری کا یہ احساس سب سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔

جی نہیں! میں نے ابھی وہ کتاب لکھنی نہیں شروع کی ہے، حالانکہ میں نے اس موضوع پر بہت کچھ سوچا ہے اور یہ

کتاب جیسی ہوگی اس کا ایک خاصا واضح تصور میرے ذہن میں قائم ہو چکا ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ میں نے اس کتاب کے بارے میں جو میری زندگی کی اہم ترین کتاب ہوگی، اپنے خیالات قلمبند بھی کر لئے ہیں۔

یوں سمجھئے کہ ابھی کوٹ تو بن کر تیار نہیں ہوا ہے البتہ کپڑا خرید لیا گیا ہے۔ قالین ابھی وجود میں نہیں آیا ہے مگر دھاگے جمع کر لئے گئے ہیں۔ لے اور آہنگ سے مل کر گیت کی شکل تو نہیں ابھری ہے مگر دل کی وہ دھڑکنیں وجود میں آ چکی ہیں جو گیت کو جنم دیتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے نماز نہ پڑھی ہو، صرف یہ سوچ لیا ہو کہ نماز پڑھنا اچھی چیز ہے تو بخشائش کے لئے اتنا بھی کافی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ دوست ہمیشہ دوست کے ساتھ کھانا کھا کر خوش ہوتا ہے اور جو کچھ موجود ہو اسی کو بہت سمجھتا ہے۔ اب اگر گھر میں بوزا کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے تو مہمان کو یہ شکایت کیوں ہو کہ اس کی خاطر ولایتی شرابوں سے کیوں نہیں کی گئی (جب کہ اس طرح کی شراب نہ گھر میں تھی نہ اڑوس پڑوس میں)؟

لوگ کہتے ہیں: تم سے اچھائی نہیں ہو سکی، پھر بھی شکریہ اس بات کا کہ تمہارے ارادے نیک تھے۔

عزیز پڑھنےوالو! ہر کتاب تمہارے لئے لکھی جاتی ہے۔ میں ناشر کو کتاب کی افادیت و اہمیت کا یقین دلاتا ہوں، ایڈیٹر اور نقاد سے بحث کرتا ہوں۔ لیکن فیصلہ کرنے کا حق صرف تم کو ہے۔ تمہارا فیصلہ انصاف پر مبنی بھی ہوتا ہے اور حتمی بھی اور جیسا کہ عدالت کی زبان میں کہا جاتا ہے: آخری فیصلہ جس کی اپیل نہیں ہو سکتی۔

ادیب کی زندگی کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ تم سے ملاقات کرے۔ مجھے اپنی ساری زندگی میں تین موقعوں پر بڑی پریشانی

لاحق ہوتی ہے۔ پہلا موقع تو وہ ہے جب مجھے تم سے ملنا ہوتا ہے، امید و بیم کی کشمکش کے ساتھ میں ہر ملاقات کا انتظار کرتا ہوں اور یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ ملاقات کے وہ لمحے کس طرح گذرینگے۔ پھر خود ملاقات کے دوران بھی مجھے ایک فکر سی رہتی ہے اور ایسا ہونا غیرفطری بھی نہیں۔ اور پھر ملاقات ختم ہونے کے بعد مجھے یہ فکر رہتی ہے کہ تم نے کیا تاثر قبول کیا اور اس کوشش میں ایک ایک بات مجھے یاد آتی رہتی ہے اور میں اس کا جائزہ لیتا رہتا ہوں۔

میرے سامنے قارئین کے چہرے ابھرتے ہیں، سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی کے چہرے سے ناراضگی ظاہر ہو رہی ہے، اب میں کہاں سے ایسے الفاظ لاؤں کہ اس کی ناراضگی دور کر سکوں؟ کسی اور کے چہرے پر بدمزگی کے آثار ہیں جیسے اس نے کوئی بہت کڑوی چیز کھالی ہو۔ ایک اور چہرہ ہے جس سے کوفت اور بوریت ٹپک رہی ہے اور میرے نزدیک سب سے زیادہ بھیانک اور افسوسناک ردعمل بھی ہے۔

<u>کچھ پہاڑیوں سے پوچھا گیا</u>: تم نے پہاڑوں کی بلندی پر دوسرے لوگوں سے دور اپنے گاؤں کیوں بسائے ہیں؟ تنگ پہاڑی راستوں میں جن کی ایک طرف گہری گھاٹیاں ہیں پیش آنےوالے خطرات، پہاڑ ٹوٹ کر گرنے اور برفانی طوفان آنے کا تو ذکر ہی کیا، سچ تو یہ ہے کہ تم لوگوں تک پہنچنا بھی قریب قریب ناممکن ہے۔

پہاڑ پر رہنےوالوں نے جواب دیا: ''جو اچھے دوست ہیں وہ راستے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور ہر طرح کے خطرات جھیلتے ہوئے ہم تک پہنچ جائینگے۔ اب رہے برے دوست، تو ہم ان کے بغیر ہی بھلے۔''

عزیز پڑھنےوالو! میں ۴۴ سال کا ہو چکا ہوں، یہ وہ عمر ہے جب آدمی کو اہم ذمہ‌داریاں سونپی جا سکتی ہیں۔ اور اس عمر تک پہنچنے کے بعد ادیب کو اپنے ایک ایک حرف

اور ایک ایک لفظ کے بارے میں پوری ذمہ‌داری محسوس کرنی چاہئے۔

اگر تمہیں میری کتاب میں کوئی ایسا خیال ملے جو کسی دوسرے ادیب کے شبستان میں بھی ایک رات گذار چکا ہو تو اسے اپنے ذہن سے باہر نکال دو، بالکل اسی طرح جیسے پہلے پہاڑی علاقوں میں یہ پتہ چلنے پر کہ دولہن عصمت کے آبدار موتی پہلے ہی گنوا چکی ہے سہاگ رات کے بعد اسے گھر سے نکال دیا جاتا تھا۔

اگر تمہیں میری کتاب میں کوئی صحیح خیال ملے تو اس کے نیچے خط کھینچ دو، اور اگر کوئی نادرست خیال نظر آئے تو اس کے نیچے بھی دھرا خط کھینچو۔

کتاب میں اگر جھوٹ کا ذرا سا شائبہ بھی محسوس ہو تو پوری کتاب پھینک دو کیونکہ پھر اس کی کوئی قیمت نہیں رہ جائے گی۔

اور اب جدا ہونے سے پہلے میں تمہیں ایک اور کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

کہانی ایک نواب، اس کے بیٹے اور لہسن اور دنبے کی چربی میں پکائی گئی خنکالی کی۔

بہت دنوں کی بات ہے، آوارستان میں ایک نواب تھا، بہت امیر، بہت مالدار۔ اسے بیٹے کی بڑی خواہش تھی، تین شادیوں کے بعد بھی گوہر مراد نہ ملا۔ نہ بیٹا پیدا ہوا اور نہ ہی بیٹی۔ اسے ایک شادی اور کرنی پڑی۔

اور اس بیوی سے اس کے گھر بیٹا پیدا ہوا۔ اب کیا تھا، ہر طرف شادیانے بجنے لگے، ہر طرف ناچ گانا ہونے لگا اور تین دن، تین رات بچے کی پیدائش کا جشن منایا جاتا رہا۔

ابھی لوگ جشن کو بھولے بھی نہ تھے کہ نواب کے محل پر غم کے بادل منڈلانے لگے۔ اس کا بیٹا بیمار پڑا، مصیبت یہ تھی کہ بیماری کا سبب بھی کوئی معلوم نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک سے ایک اچھی لوریاں سنائی جاتیں مگر نیند اس کی آنکھوں سے دور ہی رہتی۔ ایک سے ایک عمدہ کھانا لایا جاتا،

مگر وہ ایک لقمہ کھانے کا بھی روادار نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بس چند دنوں کا مہمان ہے۔ دور دور سے طبیب بلائے گئے، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نہ ہندوستانی ٹوٹکے کام آئے، نہ تبت کی جڑی بوٹیاں، نواب کا وارث دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھتا رہا۔ خود نواب کا یہ حال تھا کہ بچے کے بعد اس کا بچنا بھی ناممکن نظر آ رہا تھا۔

ایک دن نواب کے دربار میں قریب کے گاؤں کا ایک معمولی سا غریب شخص آیا جسے انسان کہنا بھی مشکل تھا۔ دربار میں اس نے یہ دعوی کیا کہ وہ اس بچے کو بچا سکتا ہے۔ درباریوں نے اسے بھگانے کی کوشش کی، مگر نواب نے انہیں روکتے ہوئے سوچا: ''میرا بیٹا یوں بھی مر ہی رہا ہے کیوں نہ اسے آزمالیا جائے!،،

''میرے بیٹے کو بچانے کےلئے تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے؟،، نواب نے پوچھا۔

''بس میں آپ کی بیوی سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔ ،،

''کیا؟ میری بیوی سے تنہائی میں ملاقات؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں، بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ،،

غریب آدمی چل پڑا۔ مگر نواب نے سوچا: ''میرا بیٹا یوں بھی مرنے کے قریب ہے۔ کیا ہرج ہے اگر یہ آدمی میری بیوی سے اکیلے میں دو باتیں کر لے؟،،

''اچھا رکو! میں نے رائے بدل دی ہے، تم میری بیوی سے تنہائی میں مل سکتے ہو۔ ،،

تنہائی ہوئی تو اس غریب آدمی نے نواب کی بیوی سے پوچھا:

''تم چاہتی ہو نا کہ تمہارا بیٹا اچھا ہو جائے اور زندہ رہے؟،،

جواب میں نواب کی بیوی اسکے سامنے گھٹنوں کے بل گر پڑی۔

''اچھا! تو اب یہ بتا دو کہ اس کا اصل باپ کون ہے؟،،

نواب کی بیوی نے ڈری‌سہمی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

''ڈرو نہیں! تمہارا راز میرے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جائے گا۔ اور اگر تم نے نہیں بتایا تو دنیا کی کوئی طاقت تمہارے بیٹے کو موت سے نہیں بچا سکتی۔ '' اس نے کہا۔

''نواب کو بیٹے کی خواہش تھی اور میں جانتی تھی کہ اگر میں نے کسی بیٹے کو جنم نہ دیا تو مجھے بھی اسی طرح نکال دیا جائے گا جیسے دوسری بیویوں کو نکالا جا چکا ہے۔ چنانچہ میں ایک دن پہاڑوں میں چلی گئی اور وہاں میں نے ایک معمولی سے نوجوان چرواہے کے ساتھ ہم‌بستری کی۔ پھر میرے یہاں بیٹا پیدا ہوا...''

اس بات چیت کے بعد اس خودساختہ حکیم نے اعلان کیا:

''خان والاشان! مجھے آپ کے بیٹے کا علاج معلوم ہو چکا ہے۔ ابھی اس کا پالنا ایسی جگہ رکھ دیا جائے جہاں اس طرح کی آگ جل رہی ہو جیسی پہاڑوں میں چرواہے جلاتے ہیں اور اس کے نیچے بکری کی کھال بچھا دی جائے۔ اسے کھانا بھی وہی کھلایا جائے جو عام چرواہے کھاتے ہیں۔ ''

''مگر وہ تو لہسن اور دنبے کی چربی سے بنی خنکالی کھاتے ہیں، میرا شیرخوار بچہ کیسے کھا سکتا ہے...''

غریب آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی راہ اگ لیا۔ ''میرا بیٹا یوں بھی مر ہی رہا ہے، چلو! یہ کرکے بھی دیکھ لیں'' نواب نے سوچا اور خنکالیاں تیار کرنے کا حکم دے دیا۔

نواب کی بیوی نے اپنے ہاتھ سے خنکالیاں تیار کیں۔ اس نے بالکل ویسی ہی خنکالیاں بنائیں جیسی اس نے ہم‌بستری سے پہلے، شام کو اس نوجوان چرواہے کے لئے تیار کی تھیں۔ پھر اس نے لکڑی کے تسلے میں یہ ساری چیزیں اسی طرح بچے کے آگے سجا دیں جیسے اس شام چرواہے کے سامنے سجائی تھیں۔

خنکالیاں گول گول اور پتھروں جیسی بڑی بڑی تھیں۔ دنبے کے گوشت سے روغن ٹپک رہا تھا۔ پہاڑی چشمے کے پانی سے بھری ہوئی لٹیا بھی سامنے رکھ دی گئی۔

لہسن اور دنبے کے گوشت کی خوشبو بچے تک پہنچی تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس

نے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے اور سب سے بڑی خنکالی اٹھا لی۔ اسی دن سے باپ کی طاقت بیٹے کی رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ وہ بھوکے شیر کی طرح خنکالیاں ہڑپ کرتا رہا اور دنوں اور گھنٹوں میں بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ ایک صحت مند اور خوبصورت جوان ہو گیا۔ پرانی بیماری کا دور دور تک نام و نشان بھی نہ تھا۔

ظاہر ہے میں کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس طرح کا کوئی واقعہ حقیقتاً پیش بھی آیا تھا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ جب ادب اپنے باپ دادا کی غذا پر پلنا چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے ملکوں سے غذا حاصل کرنے لگتا ہے، جب اس کے رشتے اپنی قوم کے رسم و رواج سے، زبان اور کردار سے ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ اپنی قوم کا وفادار نہیں رہ جاتا تو وہ مریض ہو جاتا ہے، اس کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی بھی دوا اسے اس بیماری سے نجات نہیں دلا سکتی۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کے ساتھ ہی مجھے یہ کتاب ختم کر دینی چاہئے۔ میں نے جب یہ کتاب شروع کی تھی تو گرمی کا موسم تھا اور اب سرد خزاں آ چکی ہے۔ میں نے کتاب کا آغاز ایک پہاڑی گاؤں میں کیا تھا اور آخری سطریں ایک بڑے اور بارونق شہر میں لکھ رہا ہوں۔ میں نے کتاب کی پہلی سطریں لکھی تھیں تو صبح کی آمد آمد تھی اور اب رات خاصی ڈھل چکی ہے، اس بڑے اور کثیر آبادی والے شہر کی روشنیاں بھی ایک ایک کرکے گل ہوتی جا رہی ہیں۔

میں اجنبی سرزمینوں کی خاک چھان کر واپس آ گیا ہوں، گاؤں کے باہر میں اپنے گھوڑے پر سے اتر پڑا ہوں اور اس کی لگام پکڑے آڑی ترچھی گلی سے گذر رہا ہوں۔ اب بہتر یہی ہوگا کہ گھوڑے پر سے زین اتار لوں۔ اس کی گردن پر تھپکیاں دے کر اسے چراگاہ میں چھوڑ دوں۔

جہاں تک میری اپنی بات ہے، تو میں سوچتا ہوں کہ الاؤ کے پاس بیٹھ کر تھوڑی دیر سگریٹ سے لطف لوں گا۔

ہمیں بھی سوچنا ہے کیونکہ بہرحال ہر سفر کا پرمسرت طور پر ختم ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح ہر نئی کتاب بھی کامیاب نہیں ہوتی۔ صبح ہوگی تو میں ایک نئی کتاب شروع کروں گا ایک نئے سفر کا آغاز کروں گا۔

لیکن اس وقت میں سفر سے بہت تھک گیا ہوں، مجھے لحاف اوڑھ کر سوجانا چاہئے۔ دوستو! شب بخیر۔ میں نے یہ سلسلہ سلام کے ساتھ شروع کیا تھا اور اسے ختم بھی سلام ہی پر ہونا چاہئے۔ سلام علیکم۔ آمین۔

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکرگذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار، نمبر ۲۱،
ماسکو، سوویت یونین

21, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR

دارالاشاعت ترقی سے شائع ہونے والی کتاب

پریلژائیوا ''حیات لینن،، (افسانہ)

اس کتاب پر ایک تبصرہ کرنے والے نے لکھا :
''م - پریلژائیوا نے اپنے سامنے یہ مقصد رکھا کہ وہ لینن کی سوانح حیات کو خشک اور نصابی کتاب کے انداز میں نہیں پیش کریں گی بلکہ اس طرح کہ قاری کے تصور میں اس عظیم ہستی کی نمایاں اور متاثر کن تصویر آجائے - ،،

اس کتاب کو سوویت کتابوں کے ایک مقابلے میں انعام بھی مل چکا ہے -

دارالاشاعت ترقی سے شائع ہونےوالی کتاب

شولوخوف ''جب دھرتی جاگی،،۔
دو جلدوں کا ناول۔ جلد دوم

میخائیل شولوخوف (سال پیدائش ۱۹۰۵ء) کی تصانیف ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ وہ بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے مصنف ہیں۔ ان کو لینن انعام اور نوبل پرائز مل چکے ہیں۔

۱۹۳۲ء میں رسالہ ''نووی میر،، (نئی دنیا) میں ''جب دھرتی جاگی،، کی پہلی جلد شائع ہوئی جو خود مصنف کے قول کے مطابق ''واقعات کے تازہ نشانات،، پر مبنی تھی۔ لیکن ''اور ڈان بہتا رہا،، نامی تاریخی رزمئے پر کام اور پھر دوسری عالمی جنگ نے اس ناول کی تکمیل کو التوا میں ڈال دیا اور کتاب صرف ۱۹۶۰ء سے کچھ پہلے ہی پوری کی جا سکی۔

باوجود اس کے کہ ناول کے واقعات کو کافی زمانہ گزر چکا ہے یعنی وہ ۱۹۳۰ء کے واقعات ہیں جب کہ اجتماعی فارموں کو ملک میں رائج کیا جا رہا تھا پھر بھی یہ ناول موجودہ زمانے کے جذبات اور خیالات سے مملو ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ مشہور مصنف اناتولی کالینین نے لکھا ہے جو شولوخوف کے ہم‌وطن اور دوست ہیں۔

قفقاز کے بلند پہاڑوں میں داغستان کے پہاڑی لوگ آباد ہیں۔ اس علاقے میں ۳۶ قومیتوں کے لوگ بستے ہیں جن میں آوار قوم کے لوگ بھی ہیں۔ یہیں، کوہ قفقاز کے انتہائی دشوار گذار علاقے کے آوار گاؤں سدا میں ۱۹۲۳ء میں داغستان کے عوامی شاعر حمزہ سداسا کے یہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام رسول رکھا گیا۔ بچے نے گیارہ سال کی عمر میں اپنی پہلی نظم کہی۔ اسکول ختم کرنے کے بعد رسول حمزاتوف نے ماسکو کے ادارۂ ادب میں اعلی تعلیم حاصل کی اور اپنے وطن واپس آ کر داغستان کا ایک بہت ہی مقبول شاعر بن گیا۔

حمزاتوف کی شاعری کے مجموعے خصوصاً ان کی ''مثمن نظمیں،، جو حکمت اور مہارت سے لبریز ہے سوویت یونین کی بہت سی قومی زبانوں اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کی

